"میں اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اور وہاں اسے ایک ایسا آدمی کے پاس چھوڑ گیا جس کا جیب میں روپیہ تھا اور جسکو عورت کی ضرورت تھی ــــ جیسا ہم بار برا کو آپکے پاس چھوڑا تھا ــــ اور جب دوسرے دن وہ مجھے ملا تھا تو ہم سوچا کہ وہ ہم سے ناخوش ہوگا ــــ ہمارا COMPLAINT کرے گا ــــ مگر وہ کچھ بھی نہ بولا جیسے کوئی بات نہ ہوا ہو ــــ کاش وہ کچھ کہا ہوتا۔ ہم پر ناخوش ہوتا ــــ وہ ہم سے صرف یہ پوچھا "برٹی تمہارا پاس پیسے ہیں۔ اسپلنڈڈ میں بیبی ڈانسر آیا ہے" میری جیب میں سو سے زیادہ روپیہ تھا مگر میں اسے جواب دیا کہ میرا پاس صرف پکچر دیکھنے اور عمدہ چار کے لئے پیسہ ہے تو وہ بالکل انکار کر گیا۔ اب وہ شراب بہت پیتا ہے۔ بغیر شراب کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی شام جب اس کا کوئی انگیجمنٹ نہیں ہوتا تو وہ میرے پاس آتا ہے اور اگر میرا پاس بھی زیادہ پیسہ نہیں ہوتا تو اس پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ شراب کی بوتل خرید کر ہم اپنے کمرے پر چل کر بیٹھیں۔ اس وقت وہ بالکل فری FREE ہو جاتا ہے۔"

وہ مستقل مونث کو مذکر بول رہا تھا۔ اور عرفان کو اس بے تکی اردو سے خاصی چڑ ہو گئی۔ پھر یہ کہ اسنے دیکھا کہ برٹی بے حد جذباتی ہو رہا ہے۔ اس لئے اسنے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"برٹی زندگی اس طرح تو نہیں گذر سکتی۔ تم آخر ملازمت کیوں نہیں کر لیتے!"

"پہلا بات یہ مسٹر عرفان کہ ہم اتنا پڑھا لکھا نہیں کہ ہم کو کوئی اچھا سا جاب JOB مل جائے پھر بھی میں اپنا مدراسنگ کے وجہ سے کمانے کا بہت سا دھندا کر سکتا ہے انشورنش ایجنٹ ہو سکتا۔ پراپرٹی بروکر ہو سکتا۔ سیلز مین ہو سکتا، کمیشن ایجنٹ ہو سکتا۔ اور اسی موافق بہت سے کام ہم کر سکتا جس سے روپیہ پیدا ہو سکے۔ پر مسٹر عرفان سارا پرابلم یہ ہے کہ میں کس کا واسطے یہ سب کچھ کریں۔ اتنا بڑا دنیا میں اپنا تو کوئی بھی نہیں جو میرا کامیابی پر خوش ہو یا میری ناکامیابی پر میرا ہمت بڑھائے۔ کوئی بھی تو نہیں جس کی خوشی اور غم میری خوشی اور غم پر ڈیپنڈ کرے۔ جو میرا ساتھ اداس ہو۔ میرا ساتھ مسکرائے۔ کندھے سے کندھا ملا کر چلے۔ میں سوچا تھا کہ مولی کے لئے سب کچھ کر دیگا۔ اور ہم مولی کا واسطے سب کچھ کرتا۔ اس کے لئے ہم چوبیس گھنٹہ محنت کرتا۔ مگر وہ میرے ساتھ نہ رہی۔ وہ دوسرا راستہ پر چلا گیا۔ ہم نے محنت کو بیک اس کے لئے شروع کیا۔

مولی اب ہمارا کچھ بھی نہیں پر ٹکٹ کا بلیک ہم اب بھی کرتا۔ ہم کو اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں معلوم ہوتا۔ جس دن ہم کو اس کا پتہ چل گیا اسی دن مسٹر عرفان ہم بھی مسٹر رابرٹ کیلی ہو جائے گا۔ زندگی اپنے لئے تو نہیں ہوتا۔ اپنا کیا ہے۔ کسی طرح گذری جاتا ہے۔ اس وقت آپ مل گیا۔ آپ نہ ملتا تو کوئی اور مل جاتا ــــ کوئی اور نہ ملتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو بھی ہم کچھ نہ کچھ کر لیتا۔ گاڈ فادر ہمارا مدد کر دیتا۔ اس فری اور IRRESPONSIBLE زندگی کا ایک فائدہ تو ہے کہ مجھے اپنے متعلق سوچنے کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ جب میرے پاس پیسے نہیں ہوتا تو میں اسے پیدا کرنے کی فکر میں رہتا ہے جب ہوتا ہے تو اسے خرچ کرنے کا کوشش کرتا ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ ہم فرصت سے بہت گھبراتا ہے ــــ آپ کے پاس سگریٹ ہے؟"

عرفان نے اسے سگریٹ کا پورا پیکٹ خرید دیا۔ اور چلتے وقت اسے پانچ روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لو۔ جب تمہارے پاس ہوں واپس کر دینا۔"

"مسٹر عرفان ہم آپ کا پہلے والا دس روپیہ بھی ابھی واپس نہ کیا۔ بات یہ ہوا کہ ہم کو اسی وقت سٹے کا ایک پکا نمبر معلوم ہوا۔ ہمارا پاس پیسہ نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر سے بندوبست کر کے ہم اس پہ تیس روپیہ لگایا۔ آجاتا تو وارہ نیارہ ہو جاتا۔ پر سالی قسمت خراب تھی۔ ذرا سا رہ گیا۔ آپ فکر نہ کرو۔ ہم آپ کا روپیہ ضرور۔ واپس کر دے گا ــــ ضرور ــــ"

چند روز بعد برٹی ملا تو وہ بے حد خوش تھا۔

"آئیے مسٹر عرفان کہیں بیٹھتے ہیں۔ آج میری جیب میں بہت روپیہ ہے۔ کل میں تمبولا میں سارھے سات سو جیتا تھا۔"

"پھر تو تم کو مولی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔"

"نہیں مسٹر عرفان۔ ہم طے کیا ہے کہ اب مولی سے کوئی معاملہ نہیں۔ جب میری جیب بھری ہوگی تو ہم کو ہزاروں مولی ملے گا۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

پھر ان دونوں نے ایک اعلیٰ ہوٹل میں ڈنر کھایا۔ ڈانس دیکھا۔ برٹی نے جی بھر کر پی۔ اور بے دریغ پیسے خرچ کرتا رہا۔ ٹیکسی سے عرفان کو اسکے گھر پہنچایا۔ اور دوسرے دن کا پکچر کا پروگرام

"میں اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اور وہاں اسے ایک ایسا آدمی کے پاس چھوڑ گیا جس کا جیب میں روپیہ تھا اور جسکو عورت کی ضرورت تھی ـــــ جیسا ہم بار بار کو آپکے پاس چھوڑا تھا ـــــ اور جب دوسرے دن وہ مجھے ملا تھا تو ہم سوچا کہ وہ ہم سے ناخوش ہوگا ـــــ ہمارا COMPLAINT کرے گا ـــــ مگر وہ کچھ بھی نہ بولا جیسے کوئی بات نہ ہوا ہو ـــــ کاش وہ کچھ کہا ہوتا۔ ہم پر ناخوش ہوتا ـــــ وہ ہم سے صرف یہ پوچھا" برنی تمہارا پاس پیسے ہیں۔ اسپلنڈڈ میں اسپینی ڈانسر آیا ہے" میری جیب میں سو سے زیادہ روپیہ تھا مگر میں اسے جواب دیا کہ میرا پاس صرف پکچر دیکھنے اور عمدہ چار کے لئے پیسہ ہے تو وہ بالکل انکار کر گیا۔ اب وہ شراب بہت پیتا ہے۔ بغیر شراب کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی شام جب اس کا کوئی انگیجمنٹ نہیں ہوتا تو وہ میرے پاس آتا ہے اور اگر میرا پاس بھی زیادہ پیسہ نہیں ہوتا تو اسپر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ شراب کی بوتل خرید کر ہم اپنے کمرے پر چل کر پئیں۔ اس وقت وہ بالکل فری FREE ہو جاتا ہے۔"

وہ مستقل مونث کو مذکر بول رہا تھا۔ اور عرفان کو اس بے تکی اردو سے خالص چڑ ہو گئی۔ پھر یہ کہ اسنے دیکھا کہ برنی بے حد جذباتی ہو رہا ہے۔ اس لئے اسنے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"برنی زندگی اس طرح تو نہیں گذر سکتی۔ تم آخر ملازمت کیوں نہیں کر لیتے؟"

"پہلا بات یہ مسٹر عرفان کہ ہم اتنا پڑھا لکھا نہیں کہ ہم کو کوئی اچھا سا جاب JOB مل جائے پھر بھی میں اپنا 'مدرٹنگ' کے وجہ سے کمانے کا بہت سا دھندا کر سکتا ہے انشورنش ایجنٹ ہو سکتا۔ پراپرٹی بروکر ہو سکتا۔ سیلز مین ہو سکتا، کمیشن ایجنٹ ہو سکتا۔ اور اسی موافق بہت سے کام ہم کر سکتا جس سے روپیہ پیدا ہو سکے۔ پر مسٹر عرفان سارا پرابلم یہ ہے کہ میں کس کا واسطے یہ سب کچھ کریں۔ اتنا بڑا دنیا میں اپنا تو کوئی بھی نہیں جو میرا کامیابی پر خوش ہو یا میری ناکامیابی پر میرا ہمت بڑھائے۔ کوئی بھی تو نہیں جس کی خوشی اور غم میری خوشی اور غم پر ڈیپنڈ کرے۔ جو میرا ساتھ اداس ہو۔ میرا ساتھ مسکرائے۔ کندھے سے کندھا ملا کر چلے۔ میں سوچا تھا کہ مولی کے لئے سب کچھ کریگا۔ اور ہم مولی کا واسطے سب کچھ کرتا۔ اس کے لئے ہم چوبیس گھنٹہ محنت کرتا۔ مگر وہ میرا ساتھ [illegible] ۔ وہ دوسرا [illegible] پیدا [illegible] کا جیک اس کے لئے شروع کیا۔

مولی اب ہمارا کچھ بھی نہیں پر ٹکٹ کا ملیک ہم اب بھی کرتا۔ ہم کو اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں معلوم
ہوتا جس دن ہم کو اس کا پتہ چل گیا اسی دن مسٹر عرفان ہم برٹی سے مسٹر رابرٹ کیلی ہو جائے گا۔ زندگی
اپنے لئے تو نہیں ہوتا۔ اپنا کیا ہے۔ کسی طرح گذر ہی جاتا ہے۔ اس وقت آپ مل گیا۔ آپ نہ ملتا
تو کوئی اور مل جاتا ــــ کوئی اور نہ ملتا تو۔۔۔۔۔ تو بھی ہم کچھ نہ کچھ کر لیتا۔ گاڈ فادر ہمارا مدد کر
دیتا۔ اس فری اور IRRESPONSIBLE زندگی کا ایک فائدہ تو ہے کہ مجھے اپنے متعلق
سوچنے کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ جب میرے پاس پیسے نہیں ہوتا تو میں اسے پیدا کرنے کی
فکر میں رہتا ہے جب ہوتا ہے تو اسے خرچ کرنے کا کوشش کرتا ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ
ہم فرصت سے بہت گھبراتا ہے ــــ آپ کے پاس سگریٹ ہے؟"

عرفان نے اسے سگریٹ کا پورا پیکٹ خرید دیا۔ اور چلتے وقت سے پانچ روپے کا نوٹ
دیتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لو۔ جب تمہارے پاس ہوں واپس کر دینا۔"

"مسٹر عرفان ہم آپ کا پہلے والا دس روپیہ بھی ابھی واپس نہ کیا۔ بات یہ ہوا کہ ہم کو اسی وقت
سٹے کا ایک پکا نمبر معلوم ہوا۔ ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا۔ ادھر ادھر سے بندوبست کر کے ہم اس
پر بیس روپیہ لگایا۔ آ جاتا تو وارہ نیارہ ہو جاتا۔ پر سالی قسمت خراب تھی۔ ذرا سا رہ گیا۔ آپ
فکر نہ کرو۔ ہم آپ کا روپیہ ضرور واپس کر دے گا ــــ ضرور ــــ"

چند روز بعد برٹی ملا تو وہ بے حد خوش تھا۔

"آیئے مسٹر عرفان کہیں بیٹھتے ہیں۔ آج میری جیب میں بہت روپیہ ہے۔ کل میں تمبولا میں ساڑھے
سات سو جیتا تھا۔"

"پھر تو تم کو مولی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔"

"نہیں مسٹر عرفان۔ ہم طے کیا ہے کہ اب مولی سے کوئی معاملہ نہیں جب میری جیب بھری ہو گی
تو ہم کو ہزاروں مولی ملے گا۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

پھر ان دونوں نے ایک اعلیٰ ہوٹل میں ڈنر کھایا۔ ڈانس دیکھا۔ برٹی نے جی بھر کر پی۔ اور
بعد میں پیسے خرچ کرتا رہا ٹیکسی سے عرفان کو اس کے گھر پہنچایا۔ اور دوسرے دن کا پکچر کا پروگرام

بنا کر رخصت ہو گیا۔

ایک ہفتہ تک وہ عرفان کے ساتھ رہا خوب تفریحیں کیں۔ فلمیں دیکھیں ڈانس دیکھے اپنے لئے عمدہ کپڑے خریدے۔ اور عرفان کو ایک خوبصورت اور قیمتی سگریٹ کیس پریزنٹ کیا۔ اس درمیان اسنے کسی بھی لڑکی کا نام نہ لیا۔

اسکے بعد کافی دنوں تک جب عرفان کو برٹی نظر نہ آیا اسے تشویش ہوئی اور ایک دن وہ اسکے کمرے پر پہنچ گیا۔ برٹی لاغر اور کمزور چارپائی پر لیٹا تھا۔ اور سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی مقدس مریم کی معصوم تصویر کو گھور رہا تھا۔ عرفان کمرے میں چلا گیا۔ مگر اسے پتہ نہ چلا۔ عرفان نے جب اسے پکارا تو وہ چونکا۔

"اوہ۔ مسٹر عرفان آیئے۔"

اسنے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ عرفان نے اسے منع کر دیا۔

"کیا ہو گیا تم کو برٹی ——؟"

"ایک مہینے سے بخار اور کھانسی تھی۔ مگر پچھلے ہفتے ڈاکٹر نے ایکسرے لے کر بتایا ہے کہ ٹی بی ہے۔ وہ تو پہلا اسٹیج ہی بتایا مگر ہم سوچتا ہے کہ وہ ہمارا تسلی کو ایسا کہہ دیا —— خیر —— اچھا ہوا آپ آ گیا —— میں اکیلا تھا اور سوچتا تھا کہ میں مر جاؤں گا پر کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مسٹر عرفان آپ آ گیا ہم بہت خوش ہے کل ہم سینے ٹوریم چلا جائے گا۔ پھر کون جانتا ہے واپس آئے گا کہ نہیں —— آپ میرا ایک کام کر دے گا؟"

"کہو۔"

"مہینے کا آخری ہفتہ ہے۔ مولی اپنے گھر پر ہی ہو گا۔ آپ اسے بلا دو۔ مگر اس کا لئے بوتل کا انتظام ضرور کر دیجئے۔ مولی پینے کے بعد بالکل فری ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایسا —— BE HAVE کرتا ہے جیسے وہ ہم کو بہت محبت کرتا ہے۔ کل ہم سینے ٹوریم چلا جائے گا۔ میں چاہتا ہے کم سے کم آج کی شام وہ میرے پاس رہے کہ میں اکیلا پن نہ FEEL کروں۔"

عرفان گیا مگر اسکو مولی گھر پر نہ ملی۔ اور نہ کہ اس میں برٹی کو یہ مایوس کن خبر سنانے کی

ہمت کی ـــــ
اور دوسرے دن ہربی ٹی سینے ٹوریم چلا گیا ـــــ

یکایک ملی جلی آوازوں کے شور نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسنے دیکھا کہ اس کے بھانجے بھتیجے باغ کے باہر چیختے ہوئے ریگزار پر سے گذرتے ہوئے اونٹوں کے ایک قافلے کے پیچھے بھاگے جارہے ہیں۔ پندرہ بیس اونٹ جن پر سامان لدا تھا۔ ایک قطار میں ایک رفتار سے چلے جارہے تھے۔ سب سے آگے اور سب سے پیچھے کے اونٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ باقی تمام اونٹوں پر صرف سامان لدا تھا۔ تمام کے تمام اونٹ ریگزار کی گرمی اور ایک طرف بہت ہی خوبصورت ہرے بھرے درختوں سے بے نیاز اپنی منزل کی سمت چلے جارہے تھے۔ ان کے عقب میں صاف گہرا نیلا آسمان تھا اور اس پس منظر پر یہ قافلہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اسکے ساتھ آئے ہوئے تصویر لینے کی کوشش میں اس قافلے کے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے ـــــ اسنے دیکھا سائرہ ایک گوشے میں کھڑی بہت غور سے دور گذرنے والے قافلے کو دیکھ رہی ہے۔

یکایک اسے خیال آیا کہ یہ قافلے بھی درختوں پر کھدے ہوئے ناموں کی طرح ہیں۔ یہ ریگزار برسوں سے یہاں ایک ہی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس پر سے نہ جانے کتنے قافلے گذرے ہوں گے۔ اور نہ جانے کتنے قافلے اور گذریں گے۔ ہر قافلہ اپنے نقش قدم چھوڑ کر کہیں دور نکل جاتا ہے پھر کوئی دوسرا قافلہ آتا ہے۔ جو پرانے نقش قدم مٹا کر نئے نقش بناتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا ہے مگر کوئی بھی ایک تپتے ہوئے ریگزار کا رفیق نہیں۔ یہ ہمیشہ سے یونہی تنہا ہے۔

یہ تمام اونٹ جو ابھی گذرے ہیں۔ انہیں اسنے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے مگر اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ انہیں ہمیشہ سے دیکھتا آیا ہو۔ کیونکہ تمام اونٹ ایک جیسے ہوتے ہیں ـــــ یہ تمام نام جو ان درختوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ کسی کو نہیں جانتا۔ مگر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان میں ہر ایک کو جانتا ہے۔ سب کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ صرف اس لئے کہ تمام انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور بہت سے آدمیوں کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔

SEVENTH HEAVEN
June
جانِ گل زار
سیوائیل
Saville
کی خوشبویات
سیونتھ ہیون - جون - مسچیف
June
HAIR OIL
ان کے علاوہ
سیونتھ ہیون
جُون
مسچیف ہیر آئیل

نیا دور

کراچی

۳۱ — ۳۲

کہانی نمبر

سالانہ:۔ سولہ روپے

قیمت فی پرچہ:۔ تین روپے

مدیران
ثناء اللہ
قمر سلطانہ

شائع کردہ:۔ پاکستان کلچرل سوسائٹی، کراچی

ادارہ

ثنا اللہ

قمر سلطانہ

ترتیب

تبصرے

ما، اللہ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے باہتمام عبدالصمد عارف مطبع سعیدی قرآن محل سے چھپوا کر ۸۔ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی نمبر ۵ سے شائع کیا

اداریہ

[illegible]

سنہ ۳۶ء کی تحریک نے ادب کو فلسفۂ ادب کی شکل میں جو کچھ دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ادب زندگی کا آئینہ دار ہے"۔ یہ وہ زاویۂ نظر تھا جس سے اس تحریک نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا نہ صرف اظہار کیا بلکہ قدیم ادب کو بھی اسی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی۔ پسند و ناپسند کا جابجا معیار یہی ٹھہرا۔ یہ عمل جدید شاعری، ناول، افسانہ اور تنقید میں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ افسانے میں زندگی کی آئینہ داری کا مطلب یہ تھا کہ گرد و پیش کے حالات و عوامل، روزمرہ کے واقعات، سامنے کی باتیں زیادہ سے زیادہ "حقیقی" شکل میں پیش کی جائیں۔ آئینہ کا مفہوم یہ لیا گیا کہ جو کچھ ہے اسے جوں کا توں دکھایا جائے۔ یہ کام غالباً آئینے سے زیادہ کیمرے کا تھا۔ ادھر بٹن دبایا اور ادھر جو کچھ ہے اس کی تصویر آ گئی۔ اشروڈ نے یہ کہہ کر "میں کیمرہ ہوں" جدید ادب کی اس حقیقت پسندی کا اظہار کیا تھا جس میں فن کو کیمرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا اور جہاں فن کار کا کام صرف یہ تھا کہ وہ زندگی کو اس طور پر پیش کرے جس طور پر وہ اسے نظر آ رہی ہے۔ اس طرح زندگی کی آئینہ داری کا مفہوم یہ نکلا کہ جسمانی و مادی حالات و عوامل کی صورت کشی۔ احمد علی کا افسانہ "ہماری گلی" اور کرشن چندر کا افسانہ "ایک فرلانگ لمبی سڑک" دراصل زندگی کی آئینہ داری انہی معنی میں کر رہے تھے کہ خارجی طور پر زندگی کی جسمانی و مادی حرکات اور عمل کا اظہار کیا جائے ــــ اس عمل کو ذریعہ تو بنایا جا سکتا تھا

لیکن منزل نہیں۔ زندگی کی آئنہ داری کی تخلیقی تاویل کرتے وقت ہمارے افسانہ نگار یہ بھول گئے کہ اسی کے ساتھ انہیں ایک ایسے تخیل کی ضرورت تھی جو سطحی حقائق سے بلند ہو کر ایک نئی حقیقت کی تخلیق کرتا ہے۔ جو زندگی میں نئے معنی پیدا کر کے گہرائی کے تصور کو ابھارتا ہے۔ جو یہ دکھاتا ہے کہ 'کیا ہو سکتا ہے' یا 'کیا ممکن ہے' اور صرف 'کیا ہے' پر اکتفا نہیں کرتا۔ زندگی کی آئنہ داری کے اس مفہوم نے افسانہ نگاری کو محض فارمولا بنا دیا جس پر رومانی، جنسی، نفسیاتی، معاشرتی، نیم سیاسی اور اساطیری افسانے لکھے جانے لگے۔ یادِ ماضی کے افسانے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہمارا افسانہ جسمانی و مادی ماحول اور عوامل کے اظہار تک محدود ہو گیا۔ ابتدائی دور کے چند افسانوں کو چھوڑ کر، جو نمونے کا درجہ رکھتے تھے، افسانہ نگاری صرف و محض ایک TRICK بن کر رہ گئی جن میں موضوعات کے اختلاف کے باوجود مزاج و احساس کی یکسانیت ایک ہی سطح پر موجود تھی۔ آج کے افسانے میں عام طور پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار ایک مہم پر جا رہا ہے۔ برگساں نے مقدمۂ مابعد الطبیعیات میں 'سائنس اور جبلت' پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر وہ پیرس کی ہزاروں تصویریں اتار لے اور ان کو ایک ساتھ رکھ دے پھر بھی بہ حیثیت مجموعی ان سے پیرس کی روح کا اظہار نہیں ہو سکتا لیکن اس کے برخلاف اگر وہ پیرس کی کسی مخصوص سڑک پر سے گزرتے ہوئے چند مخصوص تاثرات نوٹ کر لے تو وہ مل کر پیرس کی روح کی تعبیر کر دیں گے۔ اردو افسانے نے ایسی ہزاروں تصویریں اتاری ہیں لیکن وہ سب مل کر بھی ہماری روح کے اظہار سے قاصر ہیں اور اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے افسانے سے کیمرے کا کام لیا ہے جسمانی و مادی عوامل و حالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور زندگی کے حقائق اور اس کی پیچیدگیوں کو ابدی صداقت اور کائنات کے اندر رکھ کر نہیں دیکھا۔ افسانہ ادب ہی کا ایک حصہ ہے اور اس کا بھی وہی کام ہے جو ادب کا بنیادی کام ہے یعنی ظاہرہ حقیقت سے 'بہتر حقیقت' کی تلاش اور اس کا اظہار۔ اسی کا نام روح ہے۔ ظاہرہ حقیقت کا اظہار رتن ناتھ سرشار نے 'فسانۂ آزاد' میں اس طرح کیا کہ ایک تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع پیش کر دیا اور اس طرح اپنے دور کی زندگی کی حقیقت پسندانہ مبالغہ آمیز آئنہ داری کی۔ یہ کام اسی دور میں ممکن تھا اور وہ بھی ایک حد تک۔ لیکن جب سرشار

نے اسی عمل کو اپنے اور دوسرے قصوں کا موضوع بنایا تو نوابین اور مختلف طبقوں کے بار بار پیش کئے جانے سے ایک اکتا دینے والی یکسانیت پیدا ہو گئی ـــــ یہی عمل ایک ہی سطح پر اور ایک ہی لے میں ہمارا افسانہ گزشتہ پچیس سال سے کر رہا ہے۔ آج جب ہماری معاشرتی، تہذیبی اقدار زیر و زبر ہیں، صنعتی دور اپنی ساری اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ ہمارے دروازوں پر دستک دے رہا ہے، معاشرہ، خیال اور انسان بدل رہے ہیں، افسانے کو 'بہتر حقیقت' کا اظہار کر کے اپنے وجود کا جواز پیش کرنا ہے۔ مادی و جسمانی ماحول و عوامل کی اسی یکسانیت کی وجہ سے افسانہ ایک مقبول صنفِ ادب کی حیثیت سے گر رہا ہے اور عام طور پر یہ سننے میں آ رہا ہے کہ اب افسانوں کے مجموعے زیادہ فروخت نہیں ہوتے۔ کیا اس بات کا تعلق، لباس اور جوتوں کی طرح 'بدلتے فیشن' سے ہے یا پھر اس کا تعلق اس گہری معنویت سے ہے جو آج ہمارے افسانے میں مفقود ہے؟

دلّی کی شام

احمد علی

شہر پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں گلیاں مکان اور چھتیں بے چین نیند سو رہے تھے۔ جوں جوں گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی ان کے سانس لمبے اور بھاری ہوتے جاتے تھے۔

دن بھر کی محنت، مشقت سے چور تھکے ہارے نیم برہنہ انسان گھری چارپائیوں پر، گلیوں میں، صحن، کوٹھوں اور راہ گذاروں پر پڑے تھے۔ اکا دُکا اس وقت بھی خوش گپیاں کرتے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھر رہے تھے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں موتیا کے گجرے تھے۔ پھولوں کی مہک کچھ دور فضا کو معطر کرتی اور پھر گرمی کی حدت میں کھو جاتی تھی۔ کتے غذا کی تلاش میں نالیاں سونگھتے پھرتے تھے۔ بلیاں دوکانوں کے آگے نکلے ہوئے پٹڑوں کے نیچے سے دبے پاؤں باہر نکلتیں اور دودھ کے ان جھوٹے آب خوروں کو چاٹنے لگتیں جو دودھ پینے کے بعد لوگ پھینک گئے تھے۔ اِدھر اُدھر گلیوں اور چوراہوں پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کتے لڑ رہے تھے اور بلیاں غرّا رہی تھیں۔

زمین اور در و دیوار سے گرمی کے بھبکے نکل رہے تھے۔ نالیوں میں سیل اور سڑاند تھی۔ جہاں جہاں موریاں بدرؤں میں آ کر ملتیں وہاں سخت تعفن اور غلاظت تھی۔ لیکن پھر بھی انسان ان ہی موریوں پر کھٹیاں ڈالے سو رہے تھے۔

ہر محلے میں جگہ جگہ مسجدیں اپنے سفید سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کے گنبد کسی عریاں عورت کی چھاتیوں کی طرح یوں پھیلے ہوئے تھے گویا ستاروں کی سب روشنی اپنی سطح میں جذب کر لینگے۔ ان کے مینار کہہ رہے تھے کہ خدا واحد اور اکبر ہے۔

دلی جو قرنوں پہلے کس تمنا اور آرزوؤں سے بسائی گئی جس کے لئے فتح اور نصرت کے مقابلے ہوئے، جس کی خاطر نفرت اور رقابتوں کی معرکہ آرائیاں ہوئیں، جس کے لئے نوحے بھی گائے گئے اور

شادیانے بجی ہے، جو چھ سات بار لٹی اور اجڑی مگر آج بھی زندہ و سالم نیند کی آغوش میں پڑی سو رہی ہے۔

یہ سرزمین کبھی شہنشاہوں، تاجداروں، اور امراء و رؤسا، شاعروں اور داستان گوؤں کا مسکن تھی۔ مگر آج نہ کوئی بادشاہ ہے نہ محافظ اور نہ شاعروں کے وہ قدر دان۔ وہ پرانے باسی گو آج بھی زندہ ہیں مگر غیروں کے محکوم اپنا فخر و اقتدار، اپنا نام و نمود اور تمکنت، سب کچھ لٹا بیٹھے ہیں۔

شہر آج بھی آباد ہے۔ قلعے اور مقبرے، محلات اور عمارتیں جو گذرے دنوں کی یاد تازہ کرتی ہیں، جن کے توں زندگی کا دامن اسی اعتماد سے تھامے کھڑے ہیں جو ادراک اور گمان سے بالاتر ہے۔

اس کی بنیاد ۵ ہ ا قبل مسیح مہابھارت کی مشہور جنگ کے بعد مہاراجہ یودھشٹر نے رکھی اور اس کی خاطر عظیم اور تاریخی لڑائیاں ہوئیں۔ انہدام اس کی تخلیق اور لہو اس کی رگ و پے میں ہے۔ اس نے کیسے کیسے پرشکوہ بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا اور کتنے وجود و ظہور کے دکھ درد سہتے ہیں۔ نزع کی بے تابیوں کی شاہد اور پیدائش کی خوش کن آوازوں کی سامع یہ موت و زیست کا مرقع ہے۔ انتقام اس کی سرشت اور بدلہ اس کی فطرت ہے۔

اس کے افلاک تلے دغا و فریب کے کھیل کھیلے گئے، بے وفائیاں ہوئیں، اور اس کی خاک نے شہزادوں کے خون کی لذت چکھی ہے مگر آج بھی ایک عالم کی ہمہ گیر آواز دنیا کی آنکھوں کا نور اور جاذبیت کا مرکز ہے۔

پر اب اس کی وہ تابانی اور درخشانی کہاں؟ وہ منور زمانے ختم ہوئے۔ وہ رخصت ہو چکے جن کے دم قدم سے یہ آباد تھی، جنہوں نے اسکو آبِ حیات بخشا تھا۔ نہ وہ کورو رہے نہ وہ پانڈو اور نہ تھمی۔ کہاں ہیں وہ سید، کدھر ہیں وہ بابر، وہ ہمایوں، وہ جہانگیر؟ اب کہاں ہے شاہجہان آباد کا وہ بانی؟ کہاں ہے وہ مغموم شاعر بہادر شاہ جو تاجوروں کا آخری کنارا تھا؟ سب موت سے ہمکنار خاک سے بغلگیر زمین تلے پڑے ہیں۔ نہ اب جام ہے نہ جشم، صرف چند نشانیاں اس عظمتِ رفتہ کی پر ملال کہانیاں سنانے کو باقی رہ گئی ہیں۔ قطب مینار اور ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ یا جامع مسجد، اور چند اشعار ان الم ناک تغیرات پہ نوحہ زن:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

اور اس شاعر بادشاہ کی آواز بازگشت بن کے موت کی بے اعتنائی اور خاموشی پورے شہر پر مسلط ہوگئی۔ گلی کوچے ویران ہوگئے اور سڑکوں پر خاک اڑنے لگی۔

نیم صدی تک اسنے اپنے وقار کو بلند اور اپنی روایات کو برقرار رکھا۔ لیکن اب اس کے تمدن کی پاکیزگی اور معاشرے کی نفاست ملیامیٹ ہو چکی۔ زمانہ تھا کہ وہ شاعر جس نے اس کے آخری نوحے لکھے ہیں شکرم میں لکھنؤ جاتے ہوئے اس لئے مہر بہ لب بیٹھا رہا کہ کہیں اس کی زبان نہ بگڑ جائے اور جب مشاعرہ میں لکھنؤ والے اس کی وضع و کس مپرسی پر ہنسے اور وطن پوچھا تو یوں بولا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

لیکن وہ شاعر بھی مر چکے اور وہ تہذیب بھی۔ رسّی جل چکی پر اسکے بل اب بھی اسکی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ادبار اسکی عمارتوں پر چھا چکا اور نکبت و عسرت اسکے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر برسنے لگی۔ اور ناروں کی کھٹکی ماندی روشنی میں سارا شہر تاریک و لب مرگ معلوم ہوتا ہے۔ مٹی کے تیل کے چراغ ضرور جل رہے ہیں لیکن ان کا اجالا راہ گذاروں اور شاہراہوں کے لئے ناکافی ہے اور نہ اس روشنی کو دوبارہ لا سکتا ہے جو کبھی جمنا کے کنارے اور شہر کے قلب میں چراغاں تھی۔ اور اب تو کسی پٹے پٹائے کتے کی طرح شکست سے بے پروا رات کی سیاہی میں بے حس پڑا ہے۔

ایک آدھ دودھ والے کی دوکان اب بھی کھلی ہے۔ کوئی آتا ہے اور دو چار پیسے کا دودھ پیتا ہے اور آب خورے کو پھینک دیتا ہے۔ ملیاں کونوں کھدروں سے نکل آتی ہیں اور جھوٹے آب خورے کو چاٹنے لگتی ہیں۔ اکا دکا فقیر بھی ابھی تک دل سوز صدائیں لگاتے، زمین کے پتھروں

کو اپنے ڈنڈوں سے کھٹکھٹاتے اور درد بھرے گیت گاتے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں یا ڈیوڑھیوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں

"اللہ کے نام دے دے مائی۔ تیرے بچوں کی خیر۔"

یا کوئی پھول والا بغل میں پھولوں کی ٹوکری دبائے ایک کان پر ہاتھ رکھے لہک لہک کر آواز لگا رہا ہے :۔

"پھول لو جی موتیائی کے۔ کیا بہار ہے موتیائی میں۔"

لیکن شہر خاک آلود اور تپتے ہوئے آسمان کے نیچے مضطرب نیند سو رہا ہے اور شاید ہی کوئی پھول خرید رہا ہو یا فقیر کو بھیک دیتا ہو۔ پری پیکر معشوقائیں سو چکیں اور عشاق جا چکے ہیں۔

صرف تنگ و تاریک گلیاں بساطِ شطرنج کی طرح پر فریب سے پھیلی ہوئی ہیں اور رات دن شہر کو کچھ اسی طرح منقطع کرتی چلی جاتی ہیں جس طرح گلیوں کے دونوں طرف بہنے والی نالیاں۔ آگے بڑھ کر یہ راستے اور بھی سکڑ جاتے ہیں اور کسی مکان کے سامنے یا تو ختم ہو جاتے یا پھر آگے بڑھتے ہوئے اور گلیوں کو حسب معمول قطع کرتے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دفعہ گھسنے کے بعد دم گھٹنے اور موت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

اس طرح کی پُراسرار گلیوں کا ایک جال لال کنوئیں سے ہوتا ہوا کوچہ پنڈت کے عمق میں چلا جاتا اور داہنے ہاتھ پر محلہ نیاران پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس محلہ کی اپنی گلیاں اور ان کا اپنا ایک اور جال ہے اور اس جال میں سے ایک شاخ راہ حیات کی طرح پیچ در پیچ بل کھاتی ہوئی میر نہال کے مکان پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ مقابل میں ایک پکی اینٹ کی چہار دیواری ہے جس میں بس ایک پھاٹک نظر آتا ہے۔ جب ڈیوڑھی میں سے ہو کر گھر میں داخل ہو تو اندر کا صحن آجاتا ہے۔ صحن کی سیدھ میں ایک نیچا کوٹھا ہے اور کوٹھے کے نیچے دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ بائیں طرف لال اینٹوں کا چبوترہ ہے اور چبوترے پر محراب دار دوہرا دالان۔ دالان کے عقب میں اسی کے برابر لمبا شہ نشین اور چبوترے سے ملحق دو صحنچیاں ہیں اور ڈیوڑھی کے قریب ایک پاخانہ اور مختصر سا غسل خانہ۔ اس کے بعد باورچی خانہ ہے جس کی دیواریں لکڑی کے دھوئیں سے کالی بھٹ ہو چکی ہیں۔ انگنائی کے وسط میں ایک کھجور کا پرانا درخت آسمان کی طرف سر بلند کئے کھڑا ہے جس کے لمبے لمبے پتوں نے آسمان

کے کچھ حصہ کو چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس کا تنا بیچ میں سے خمیدہ ہے جو رات کے اندھیرے میں اور بھی بدہیئت اور سیاہ نظر آتا ہے۔ اس کی جڑ میں ایک مہندی کا پیڑ لگا ہوا ہے جس کی ٹہنیوں پر گوریوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ اس پر دو مٹی کی کونڈیاں ان جنگلی کبوتروں اور چڑیوں کے دانے پانی کے لئے تاروں سے لٹک رہی ہیں جنہوں نے دالان کی کارنس اور محرابوں کے سرخ و سفید ہانات کے پردوں میں گھونسلے بنا رکھے ہیں۔

کوٹھے کی دیوار کے پاس تخت ہیں جن پر قند کی جاجم کا فرش ہے۔ چبوترے اور صحن میں کچھ بان کے پلنگ پڑے ہیں جن پر اُجلی اُجلی سفید چادریں بچھی ہوئی قندیل کی ہلکی ہلکی روشنی میں بہت بھلی لگ رہی ہیں۔

ایک بڑی بی جو پچاس سے اوپر ہوں گی انگنائی میں پلنگ پر لیٹی ہیں۔ برابر ہی دوسرے پلنگ پر ان کی سب سے چھوٹی بیٹی مہروز مانی جو چودہ پندرہ برس کی تندرست و توانا لڑکی ہے لیٹی ہوئی ہے اور اس ہی کے پاس ان کا تیرا سالہ بھتیجہ مسرور لیٹا ہوا ہے۔

بیگم مہاں نے بیٹی سے کہا۔ "ساڑھے گیارہ بج گئے ہوں گے تمہارے ابا ابھی تک نہیں آئے۔ جاؤ تم بھی اب سو جاؤ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"نہیں بی اماں مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ تم جو کہانی سنا رہی تھیں بڑی مزیدار تھی۔ اچھی ایک اور سنا دو۔"

پنکھا جھلتے ہوئے بڑی بی بولیں: "تم نے آج کافی سن لیں۔ اب کل کے لئے اٹھا رکھو۔"

مسرور نے پیٹ کے بل لیٹ کے ٹھوڑی کے نیچے دونوں ہاتھ کا سہارا دیا اور امید بھری آنکھوں سے پھوپی کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں پھوپی جان! ایک وہ کہانی اور سنا دیجئے وہ کیا نام تھا اس کا جس میں سانپ بادشاہ بن جاتا ہے۔ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے وہ۔"

پھوپی بولیں: "اے چندا! کل ہی تو سنائی تھی تجھے راجہ باسط کی کہانی۔"

"نہیں بھئی وہ تو ہم ہزاروں دفعہ سن چکے بہت پرانی ہے۔" مہروز مانی پنکھا ہلاتی ہوئی بولی: "اماں ہمیں تو غدر کی باتیں سنا دو۔ غدر میں کیا کیا ہوا تھا، ایک بار تم کہہ رہی تھیں کہ

فرنگیوں نے سب لٹا لوں کو لوٹ کر شہر بدر کر دیا تھا۔"

"یہ تو لمبی کہانی ہے بیٹی کسی اور دن فرصت سے سناؤں گی اور تمہارے ابا بھی تو بس آتے ہی ہوں گے۔ تو بہ گرمی کس بلا کی ہے دم گھٹا جاتا ہے۔"

بچے چپ ہو جاتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے اور نیند کے جھونکے ان کو تھپکنے لگے۔ مہرو اپنے بچھونے پر لیٹ کر ستاروں کو دیکھنے لگی اور اسکے ذہن میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے، بادشاہوں، شہزادوں اور سپاہیوں کے اور ساتھ ہی ساتھ ایک انجان آدمی کا جو ایک دور شہر میں رہتا تھا اور جس کا پیغام مہرو کے لئے آیا ہے۔ وہ کیسا ہوگا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسنے کبھی اس کو دیکھا تو نہ تھا صرف یہ سنا تھا کہ وہ شکار کا بہت شوقین ہے۔ بڑے امیر کبیر اور دولتمند لوگ ہیں۔ اس کا نام معراج ہے۔ نام تو خاصا پیارا ہے۔ لیکن وہ صورت مرتب نہ کر سکی اور معراج اس کو کہانیوں کا وہ خوبصورت اور بہادر شہزادہ معلوم ہونے لگا جس سے شہزادی کو محبت ہو گئی تھی۔ اسکے ساتھ ہی اسکو ماں باپ، بھائی بہنوں اور گھر چھوٹنے کے خیال نے کچھ افسردہ کر دیا اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے آنکھیں بند کر لیں اور دوبارہ تصورات میں کھو گئی۔ مسرور کبھی کا سو چکا تھا۔

بیگم نہالؔ الٹھیں پٹاری قریب کھسکائی۔ پان کا ڈنٹھل توڑ کر کتھا چونا لگایا اور باریک کٹی ہوئی چھالیہ الائچی اور زردہ ڈال کر گلوری منہ میں رکھ لی اور پھر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگیں اور کبھی کبھی قریب لیٹی ہوئی بیٹی کو بھی جھلنے جاتی تھیں . . . . .

"اے ہے میرا پنکھا کہاں گیا، بی انجم! کیا تم سو گئیں؟ میرا پنکھا دیکھا ہے؟" کوٹھے پر سے آواز آئی۔

"اے مجھے تمہارے پنکھے کی کیا خبر، ہوگا پلنگ پر۔"

"یہاں تو نہیں ہے۔"

"پھر نیچے گر گیا ہوگا . . . . ."

پھر ایک سکوت سا سے گھر پر چھا گیا۔ لو کا ایک جھونکا آیا، کھجور کے پتے کھڑکھڑانے لگے، قندیل کی لو بھڑکی اور پھر ٹھہر گئی . . . . .

شمس کی نئی نویلی دلہن گھر کی پوت بہو جو چبوترے پر اپنے میاں کے پاس سوری تھیں اٹھیں اور مٹکے میں سے لوٹا بھر کے پاخانے چلی گئیں۔ جب وہ واپس آ کر لیٹیں تو ڈیوڑھی کے کواڑ چرچرائے اور ایک مرد کے کھکارنے کی آواز آئی۔ بیگم نہال اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سرہانے سے دوپٹہ کھینچ کر اوڑھ لیا اور ماما کو آواز دی۔

"دلچین! اری دلچین! اُٹھ۔ میاں آگئے۔"

دلچین جھوٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ میر نہال اندر آئے۔ یہ دراز قد اور دوہرے بدن کے تھے۔ سفید تنزیب کا انگرکھا سر پر کڑھی ہوئی گول ٹوپی جو ململ پر بانکپن سے ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ ان کی بنی سنوری چڑھی ہوئی سفید ڈاڑھی کی مانگ کا ایک بال بھی بے جگہ نہ تھا۔ ان کے چہرہ پر رعب و دبدبہ اور ان کی چال میں وجاہت اور شاہانہ وقار تھا۔

"آج تم بغیر کھائے ہی چلے گئے" بیگم نہال نے ذرا تنک کے کہا "کون وقت ہو گیا۔ کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں" میر نہال نے دبے لہجے میں کہا "گلی کے نکڑ پر گھنٹہ کی آواز آئی تھی۔"

اتنے میں دلچین سینی میں کھانا لے آئی۔ بیگم نہال نے تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ میر نہال نے انگرکھا اتار کر گاؤ تکیہ پر رکھ دیا جا کر ہاتھ دھوئے اور اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے بیگم نہال ترپیب بیٹھی پنکھا جھلنے لگیں۔ پھر اپنے میاں سے بولیں:

"اصغر اللہ رکھے بائیسویں میں ہے۔ اب تمہیں اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیئے۔ خدا نہ کرے کہیں آپ ہی کی صحبت میں نہ پڑ جائے۔"

"ہوں، میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ کیا سو گیا؟"

"نہیں، کھانا کھا کر کہیں گیا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔"

"صاحبزادے تشریف لے کہاں گئے ہیں؟" میر نہال نے پوچھا۔

"لو اور سنو مجھے کیا خبر! کسی بھائی وائی کے ہاں گیا ہوگا۔"

"جی نہیں آپ کے چہیتے اپنے رشتہ داروں میں نہیں جایا کرتے" میر نہال ذرا برہم ہو کر بولے۔

"بس وہیں مرزا شہباز بیگ کے یہاں گیا ہوگا۔ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں مجھے اس کا بندہ سے یارانہ قطعی پسند نہیں ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اسکو جاو بے جا ڈھیل دے رکھی ہے جہاں سینگ سمائے ہیں منہ اٹھا کے چلا جاتا ہے۔ جس ہما شما سے جی چاہتا ہے ملتا ہے اور تم ہو کہ ہوں سے توں نہیں کرتیں۔ سال ہوا آخر تمہارا بھی تو کچھ فرض ہے۔"

بیگم نہال بولیں: "لو تم تو مجھ ہی پر برس پڑے۔ ابھی اسکی عمر ہی کیا ہے۔ پھر مرد ذات۔ کیا چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جائے؟ اپنے ہم عمروں سے نہیں ملے گا تو کیا بڈھے ٹھڈوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے گا۔ بندو اور وہ بچپن سے ساتھ پڑھے ہیں اور تمہارا بھانجہ اشفاق بھی تو وہیں رہتا ہے۔ اُس کے پاس چلا جاتا ہوگا۔"

میر نہال نے دھیمے پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر تم کو تو خوب معلوم ہے اشفاق کی شادی میرزا شہباز کے ہاں میری مرضی کے خلاف ہوئی ہے اور نہ مجھے اصغر کا میل جول بندو سے ایک آن گوارا ہے۔ تم اسکو منع کیوں نہیں کرتیں آخر؟"

اس دفعہ بیگم نہال تیز ہوتے ہوئے کہنے لگیں:

الا بلا بر گردن مُلا! ہر بات میں تم مجھ ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہو۔ تمہاری انہیں باتوں سے میرے مرچیں لگتی ہیں۔ آخر وہ تمہارا بھی تو بیٹا ہے۔ تم خود کیوں نہیں کہتے۔ اور اس ہی لئے میں اسکی شادی کا کہہ رہی تھی۔" پھر بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولیں: "تم اللہ رکھے باہر کے پھرنے والے گھر کی تم کو خبر نہیں۔ میری جان کو ایک فکر ہو تو کہوں سینکڑوں غم لگے ہیں۔ تمہاری لاڈلی مہرو ہی کا فکر کھائے جاتا ہے۔ لو تم سے کہنا ہی بھول گئی۔" پھر انہوں نے مڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ جوں ہی وہ مڑیں لالٹین کی روشنی ان کے چہرے پر پڑی۔ ان کی محراب دار پیشانی کے تینوں بل نمایاں ہو گئے۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھوپال والوں کا خط آیا ہے۔ ان لوگوں کو جلدی ہے۔"

میر نہال کی تیوری چڑھ گئی اور انہوں نے گردن اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔ ان کے سُرخ و سفید چہرے

پر تفکر کے آثار پیدا ہو گئے۔

"تمہیں اس کی آخر کیا جلدی پڑی ہے مہرو ابھی بچی ہے۔ پرائیس کا معاملہ ہے ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہئے اور سچی بات ہے وہ لوگ میری سمجھ میں تو آئے نہیں۔"

بیگم نہال کہنے لگیں: "تو جلدی کی بھی خوب کہی۔ بچوں کا بیاہ کوئی گڈے گڑیا کا تو کھیل ہے نہیں۔ آخر دو چار برتن بھانڈے کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ اور تم تو جو پیغام آتا ہے اس کی بال کی کھال نکالا کرتے ہو۔ ساری دنیا اُن کے گن گاتی ہے۔ میر وہاج الدین کی جائداد ہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کی ہے۔ سننے والے تو مہرو کی تقدیر پر رشک کرتے ہیں۔ ویسے تم جانو تمہاری بچی ہے مگر ٹال مٹول کی بھی حد ہوتی ہے۔"

میر نہال بیوی کو سمجھانے لگے۔

"ذرا یہ تو سوچو اصغر بڑا ہے۔ مہرو کی شادی بھلا اُس سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے اس کے لئے بھی کوئی لڑکی ڈھونڈی؟"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے لڑکیوں کا کوئی کال ہے؟ کنبے ہی میں ہزاروں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں مگر تم سے آج کہتی ہوں میری نظر تو ہمیشہ سے بھائی نصیر الدین کی چھوٹی بیٹی ثریا پر ہے۔"

میر نہال نے ہوں کی اور کہا۔

"تم نے اصغر کو بھی ٹٹولا کیا کہتا ہے اس بارے میں۔"

اتنے میں جال میں کبوتروں کے زور زور سے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور میر نہال نے کان اُدھر لگا کر کہا: "کیا چیز ہے؟"

"ہو گی موئی کوئی بلی دِلّی۔"

جانور پھر پھڑپھڑائے۔ میر نہال نے لپک کر لالٹین اٹھائی اور کبوتروں کے جال کی طرف لپکے۔ قریب پہنچ کر جال کی تیواروں میں روشنی ڈالی مگر کوئی چیز بھی نہ دکھائی دی۔ وہ پلٹنے ہی تھے کہ کبوتروں نے پھر پھڑپھڑانا شروع کیا۔ میر نہال نے جال کا دروازہ کھول کے لالٹین کی روشنی میں اِدھر اُدھر

نظر دوڑائی۔ ایک کابک کے پیچھے کالی رسی چلتی ہوئی دکھائی دی۔

"سانپ ہے سانپ!" میر نہال چلائے: "دلچین! لائیو میرا ڈنڈا۔"

دلچین بے تحاشہ ہو کر ڈنڈا لانے کوٹھری میں گھسی اور اسکے ساتھ ہی کسی برتن کے گرنے کی جھنکار اور ایک عورت کی ڈری ہوئی "اوئی" سنائی دی۔ اتنی دیر میں سانپ ایک کابک سے نکل کر دوسری کے نیچے چلا گیا۔

"جلدی لا دلچین! جلدی لا!" میر نہال نے پھر چیخ کر کہا۔

دلچین گھبراہٹ میں ایک کنڈالی سے ٹھوکر کھاتی ہوئی ڈنڈا لے کر پہونچی۔ سانپ کو باہر نکالنے کے لئے میر نہال نے کابک پرے سرکائی اور وہ سر سے انگنائی میں پہونچ گیا۔ میر نہال تیزی سے باہر نکل آئے اور اسکے پیچھے دوڑے۔ بیشتر اس کے کہ وہ اسپر وار کریں سانپ موری میں گھس گیا میر نہال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنا پورا ہاتھ موری میں ڈال دیا۔ تخت پر سے بیگم نہال چلائیں:

"ہے ہے ایسا غضب نہ کرنا" اور وہ جلدی جلدی اگیڈُدنا گیڈا پڑھ کر سانپ کو کیلنے لگیں۔

لیکن میر نہال نے سانپ کی دُم پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا اور ایسا زور کا جھٹکا دیا کہ اسکی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سانپ تڑپتا رہا مگر آگے نہ بڑھ سکا۔ میر نہال نے ڈنڈے سے اس کا پھن کچل دیا۔ تھوڑی دیر تو سانپ بل کھاتا رہا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

کوٹھے پر سے میر نہال کی بھاوج جمال بیگم نے پوچھا:

"ہے ہے کیا تھا؟"

"کچھ نہیں بھابی جان کچھ نہیں سانپ تھا میں نے مار دیا۔" یہ کہہ کر میر نہال مسکرائے اور خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔

"اللہ نے بڑی خیر کی۔"

شمس بھی شور سے اٹھ گیا۔ اور سانپ کو دیکھنے آ پہونچا۔ دلچین نے جو ابھی سانپ کو الٹ پلٹ کر اس کی موٹائی دلمبائی کا معائنہ کر رہی تھی شمس کو ساری داستان سنائی۔ میر نہال مسکراتے ہوئے جال کے اندر گھس گئے اور کبوتروں کو دیکھنے لگے۔ ان کے شیرازی کے ایک پٹھے کو سانپ

نے ڈس لیا تھا۔ اس کا انہیں بہت قلق ہوا کیونکہ کئی حمول ضائع ہونے کے بعد یہ ایک بچا تھا۔
کبوتر کو کوٹھے پر ڈال ہاتھ دھو کر میر نہال پھر کھانا ختم کرنے بیٹھ گئے اور فارغ ہو کر انگر کھا
سنبھال کے بیٹھک کی طرف چلا یئے۔ جیسے ہی ڈیوڑھی میں پہونچے اصغر دبے پاؤں چوروں کی طرح
آتا دکھائی دیا۔ اصغر خوبرو تھا چوڑا سینہ متناسب ہاتھ پاؤں اور دراز قد۔ اس وقت بالوں میں
تیل لگا ئی ہی ہوتیا کا کنگھا اور سر پر ترکی ٹوپی پڑے۔ بنکین سے آڑی رکھی ہوئی تھی۔ شیروانی کے اوپر کے
بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اور انگریزی کالر کی رنگین قمیص دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مردانہ حسن سے
زیادہ نسوانیت کا احساس ہوتا تھا۔ میر نہال رک گئے اور غصہ میں بولے۔

"کیا شریفوں کے بیٹے آدھی رات کو گھر میں گھستے ہیں، کہاں غائب رہتے ہو؟ تمہارے لچھن
مجھے اچھے نظر نہیں آرہے۔ دنیا بھر کے لچے لفنگے آپ کے یار ہیں۔ تم سمجھتے ہو ابا کو خبر ہی نہیں۔
بال کوئی دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ باوا دادا کا نام خوب روشن کرو گے۔"

اصغر چپ چاپ گردن جھکا کر اندر جانے کو بڑھا ہی تھا کہ اسکے ولایتی بوٹ چر چرائے۔ اور
میر نہال جاتے جاتے رکے اور پھر اصغر سے کہنے لگے:

"تمہیں معلوم ہے مجھے ان انگریزی جوتوں سے چڑ ہے۔ نہ ادب رہا نہ لحاظ۔ باپ کے کہے کو
اس کان سنا اس کان اُڑا دیا۔ میر نہال کا بیٹا اور انگریزی بوٹ میں اکڑتا پھرے۔ ذرا گریبان
میں منہ ڈال کر دیکھو تو۔ کس کا خون ہو؟ میری اولاد اور یہ طور۔ کان کھول کر سن لو میاں
صاحب زادے جب تک میں زندہ ہوں تمہاری فرنگیت اس گھر میں نہیں چلے گی۔ جاؤ پھینکو
ابھی ان جوتوں کو۔ بس آخری بار کہہ رہا ہوں۔ آئندہ کسی قسم کی بے راہ روی میں نہ دیکھوں ورنہ
مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

میر نہال باہر چل دیئے اور اصغر کھسیانا سا ہو گیا۔ اسنے چپکے سے لالٹین اٹھائی اور کمرے
کا رُخ کیا۔ چبوترے پر سے کسی عورت کی کھسر پھسر کرنے کی آواز آئی:

"رہنے دو یہ جو نچلے وقت دیکھو نہ بھل۔"

اصغر کمرے میں سے نکل آیا۔ کھجور کے پتوں میں ہوا سرسرائی۔ ایک تارا ٹوٹ کر سرخ روشنی
چھوڑتا ہوا زمین کی طرف گرا اور کھجور کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور رات کی تاریکی تمام

دنیا پر حاوی ہو گئی۔

(پروفیسر احمد علی کے ناول TWILIGHT IN DELHI کا پہلا باب جس کا اردو ترجمہ پہلی بار بلقیس جہاں نے کیا ہے —)

سُرخ پھُول

غلام عباس

اُس کا اپنا گھر تو کوئی تھا نہیں۔ مگر گاؤں کے ہر گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ دن میں وہ کئی گھروں میں دیکھی جاتی۔ کبھی ذیلدار کے ہاں تمباکو کوٹ رہی ہوتی۔ کبھی ظفتے گوجر کے ہاں چھاچھ بلو رہی ہوتی۔ کبھی مائی تاباں کے ساتھ گاؤں کی دیوار پر اپلے تھاپتی دکھائی دیتی۔ کبھی پٹواری کی نئی بیوی کی کمر داب رہی ہوتی۔ غرض جب دیکھو وہ گاؤں والوں کے کسی نہ کسی کام میں جٹی ہی نظر آتی۔

کسی کسی دن وہ گاؤں والوں کی بکریاں اُس اونچی پہاڑی پہ چرانے لے جاتی جس پر حضرت شاہ ولی کا مزار تھا اور جہاں پیڑوں اور جھاڑیوں پر رنگ برنگے جھنڈے بارہ مہینے لہرایا کرتے۔ یہ جھنڈے آس پاس کے دیہات کے ان زائرین نے لگائے تھے جن کی مرادیں پیر شاہ ولی کے فیض سے بر آئی تھیں۔

وہ یہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی۔ اور صلے کا کبھی خیال ہی اُس کے ذہن میں نہ آتا۔ کسی نے کچھ کھلا دیا تو کھا لیا۔ کہیں سے کوئی پرانا جوڑا مل گیا تو پہن لیا۔ ورنہ اپنے پھٹے کپڑوں ہی میں مگن رہا کرتی۔ اُس کی اوڑھنی میں جگہ جگہ چھید ہو گئے تھے جن میں سے اُس کے لمبے کھردرے بال دھول اور تنکوں سے اُلجھے ہوئے کسی سادھو کی جٹاؤں کی طرح دکھائی دیا کرتے۔

وہ اسی گاؤں کی نائن کی بیٹی تھی۔ باپ کی اُس نے صورت نہیں دیکھی تھی۔ چار برس کی ہوئی تو ماں بھی چل بسی اور کوئی رشتہ دار تھا نہیں بس گاؤں ہی میں رُل رُلا کر پل گئی۔ گاؤں کی ہر عورت خواہ وہ ذیلدارنی ہوتی یا مزدورنی اُس کی "چاچی" تھی۔ اور گاؤں کا ہر مرد اُس کا "چاچا"۔

پندرہ برس کی عمر کو پہنچ کر اُس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے۔ رنگ روپ بھی نکل آیا۔ خاص کر آنکھیں تو بڑی رسیلی تھیں۔ ایسی بڑی بڑی جیسی ہرنیوں کی ہوتی ہیں۔ جو کوئی دیکھتا حیران رہ جاتا۔ اور دل میں کہتا۔ او ہو یہ وہی نائن کی چندھی آنکھوں والی کاکی ہے جو پانچ چھ برس اُدھر ننگ دھڑنگ نالیوں میں لوٹا کرتی تھی۔

کاکی کی عمر چھ سات برس ہی کی تھی کہ اُس میں مجذوبیت کے آثار نظر آنے لگے تھے اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید اُس کے علاج کی کچھ فکر کرتے یا کم سے کم اُسے تھوڑی بہت شعور کی باتیں سکھاتے۔ گاؤں والوں کو تو اس کی پروا تھی نہ ضرورت۔ انکی ہمدردی تو بس یہیں تک تھی کہ اسکے ہاتھ میں کبھی گڑ کی ڈلی دے دی۔ یا گاجر پکڑا دی۔

وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی اُسکے اور اعضا تو نشو و نما پاتے رہے مگر دماغ کمزور ہی رہا۔ جوانی کو پہنچ کر بھی وہ مجذوب کی مجذوب ہی رہی۔ مگر اُس کا یہ مجذوب پن گاؤں والوں کے لئے بڑے فائدے کا موجب تھا کیونکہ وہ دن بھر اُس سے طرح طرح کے کام لیتے رہتے۔ جنہیں وہ ناسمجھی میں بے تکان کرتی رہتی۔

کاکی نے اپنے دماغ کی کمزوری کے باوجود ایک بات میں بڑی ترقی کی تھی وہ یہ کہ اس کی زبان خوب چلنے لگی تھی۔ جس گھر میں بھی جاتی اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اس کے مکینوں کا دماغ چاٹ جایا کرتی۔ جب بات کرنے کو کوئی نہ ملتا تو آپ ہی آپ بولتی رہتی۔ کبھی کبھی اُسے مارا پیٹا بھی جاتا۔ مگر جلد ہی گھر کی کوئی بڑی بوڑھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسے بہلا لیتی اور یہ خطرہ دُور ہو جاتا۔ کہ کہیں وہ ناراض ہو کر اُس گھر کا آنا جانا ہی بند کر دے۔

جب کاکی کے کپڑے بہت میلے ہو جاتے تو پٹواری کی بیوی اُسے صابن کا ایک ٹکڑا دے کر کہتی: "کاکی تیرے کپڑوں سے بڑی بدبو آنے لگی ہے۔ جا انگنائی میں بیٹھ کر انہیں دھو لے" کاکی انکار کرتی تو پٹوارن زبردستی اسکے کپڑے اتروا کر اُس سے دھلواتی۔ شلوار یا کرتہ کہیں سے پھٹا ہوتا تو اُسے سوئی دھاگا دیا جاتا۔ مگر کاکی سینا پرونا نہ جانتی تھی۔ اس پر پٹوارن کو خود ہی اسکے پھٹے ہوئے کپڑے سینے پڑتے۔ مگر اسکے عوض کاکی کو گھنٹوں،

پٹواری کے ہاتھ پیر دابنے پڑتے۔

جس روز کاکی گاؤں والوں کی بکریاں چرانے لے جاتی۔ اُسے کسی نہ کسی گھر سے بیسن کی دو روٹیاں اور تھوڑا سا مکھن ایک پوٹلی میں باندھ کر دے دیا جاتا۔ پہاڑی پر پہنچکر بکریاں اپنے آپ چرتی رہتیں۔ اور وہ خود بھی ان ہی کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی رہتی۔ وہ اونچے اونچے سپاٹ ٹیلوں پہ بے دھڑک چڑھ جاتی۔ کبھی کسی درخت کی اونچی ڈال پر چڑھ بیٹھتی۔ کبھی کسی جھاڑی کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر لیٹ جاتی۔ اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتی۔ یا دُور سے آتی ہوئی رہٹ کی گھوں گھوں سنتی رہتی۔ کبھی پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچتی۔ جہاں سے ایک طرف حسن شاہ ولی کے مقبرے کا سبز گنبد نظر آتا۔ اور دوسری طرف گاؤں کا بڑا سہانا منظر دکھائی دیتا۔

منالی کی آبادی چار پانچ سو نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ دیہاتی کچے گھروندوں کا بے ترتیب مجموعہ تھا جیسے پنجاب کے اور گاؤں ہوتے ہیں۔ گرد اگرد کچی دیوار جس پہ اُپلے تھپے ہوئے۔ بیچوں بیچ بے ڈھنگی سڑک کہیں سے تنگ کہیں سے کشادہ ''بیچ کھاتی'' اور قریب قریب ہر گھر کے آگے سے گزرتی ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف بیل گاڑیوں کے پہیوں نے مستقل طور پہ نالیاں سی بنا دی تھیں۔ جب کیچڑ نہ ہوتی تو ان نالیوں میں پہیے بڑی روانی سے چلتے۔ اور بیلوں کو زور نہ لگانا پڑتا۔ گاؤں کی دیوار پر صبح ہی سے بہت سے کوّے آ بیٹھتے۔ اور دن بھر کائیں کائیں کا شور برپا رکھتے۔ ان کے علاوہ گاؤں کے لڑکے بھی کھدر کے میلے کچیلے کرتے پہنے۔ ننگی ٹانگیں۔ بعض لنگوٹی اور بعض صرف ایک دھاگا سا کمر پہ باندھے دیوار پر ایک ٹانگ اِدھر ایک ٹانگ اُدھر گھوڑے کی سی سواری کرتے نظر آتے۔

منالی میں دو تین مکان پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے بھی تھے۔ مگر یہ گاؤں کی دیوار سے باہر کھیتوں کے بیچ میں تھے۔ ان میں ایک بڑا مکان تو ذیل دار کا تھا اور دوسرا اس سے ذرا فاصلے پر چھوٹا مکان چودھری کا۔ کاکی کا آنا جانا زیادہ تر ان ہی دو مکانوں میں رہتا تھا۔

منالی تھا تو چھوٹا سا گاؤں مگر حسن شاہ ولی کے مزار کے باعث اس کی شہرت دُور

دور پھیلی ہوئی تھی۔ ہر سال چیت کی پچیسویں تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے عرس منایا جاتا۔ جس میں شامل ہونے کے لئے پچاس پچاس کوس سے زائرین بال بچوں سمیت آیا کرتے تھے۔

چن شاہ بڑے زبردست ولی مانے جاتے تھے۔ مشہور تھا کہ جو کوئی عرس کے روز ان کے مزار پر آکر مراد مانگے۔ خاص کر اولاد کی مراد، تو وہ جلد ہی یا کچھ عرصے بعد پوری ہو کے رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دیہاتی عورتیں خاص طور پر چن شاہ ولی کی بڑی معتقد تھیں۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ مراد مانگنے والی کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا کہ میری تمنا بر آئے گی یا نہیں۔ اگر بر آنے والی ہوتی تو چن شاہ ولی خود سائلہ کے خواب میں آکر اس کی بشارت دیتے۔ یہ بشارت کیا تھی سرخ گلاب کا ایک پھول۔ ولی سفید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں پھول تھامے، جیسے وہ بار بار سونگھنے، سائلہ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی جھولی میں پھینک دیتے۔ آنکھ کھلنے پر جب سائلہ گھر کے لوگوں کو یہ مژدہ سناتی تو سب اسے مبارک باد دینے لگتے۔

چن شاہ ولی کی ان کرامتوں کے تذکرے گاؤں کے ہر گھر میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ کاکی بڑے غور سے ان باتوں کو سنا کرتی تھی کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بات پوچھنے لگتی۔

"اچھا چاچی جب چن شاہ ولی نے تیری جھولی میں پھول پھینکا۔ تو وہ پیدل تھا یا گھوڑے پر؟"

"گھوڑے پر۔"

"وہ شکل صورت کا کیسا تھا؟ بڈھا تھا یا جوان؟"

"چپ کر پگلی کنواری لڑکیاں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتیں۔"

"کیوں کنواری لڑکیوں کو کیا ہوتا ہے؟"

گھر کی مالکہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ اور اُدھر کاکی جواب کا انتظار کئے بغیر چن شاہ کے بارے میں کوئی اور بات پوچھنے لگتی۔ اور مالکہ کو خواہ مخواہ کوئی کام پیدا کر کے کاکی کو اس میں الجھا دینا پڑتا۔

تیسرے پہر وہ بکریوں کو ہانکتی ہوئی پہاڑی پر سے اترتی۔ گاؤں میں پہنچ کر بکریاں تو

اپنے اپنے ٹھکانے پر خود بہ خود چلی جاتیں۔ اور وہ سیدھی مولے گنڈیری والے کی دکان پر پہنچتی اور اس سے گانٹھیں مانگتی۔ مولا گنڈیریاں تو گنے کے موسم ہی میں بیچا کرتا تھا۔ مگر سارا سال وہ اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا، خواہ اُس نے گڑ کی ریوڑیوں، میٹھے چنوں اور دال موٹھ کا خوانچہ ہی کیوں نہ لگا رکھا ہو۔ یہ شخص سیاہ فام اور بدرُو تھا اس پر چیچک میں اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ چالیس کے قریب عمر تھی۔ دس سال ہوئے اسکی بیوی مر گئی تھی مگر اسنے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بس دن بھر اپنی ایک آنکھ سے گاؤں کی لڑکیوں کو گھورا کرتا۔

وہ کاکی کو اس وقت سے جانتا تھا۔ جب وہ پانچ چھ برس کی بچی تھی اور عموماً ننگی پھرا کرتی تھی۔ اسی وقت سے وہ اس کے پاس گانٹھیں مانگنے آنے لگی تھی۔ کاکی کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ اسکے ساتھ ہی اسکی نگاہیں کاکی کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑتیں جن میں سے اسکے سڈول گھٹنے یا سفید سینے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا ہوتا۔ اور اس کا دل خواہ مخواہ کاکی سے محبت بازی کرنے کو چاہتا۔

"گانٹھیں نہیں ہیں پھر آنا۔"

"وہ جو پڑی ہیں چاچا تیرے گھٹنے کے نیچے۔"

"یہ میں نے اپنے لئے رکھی ہیں۔"

"تو گنڈیریاں کیوں نہیں چوستا چاچا؟"

"واہ۔ گنڈیریاں چوسوں تو بیچوں کیا! ...... میں کہتا ہوں کاکی۔ تو دن بھر جن لوگوں کے کام کرتی رہتی ہے ان سے پیسے کیوں نہیں مانگتی۔ پھر تو جتنی چاہے گنڈیریاں چوس سکتی ہے۔ گانٹھوں سے تیرے دانت نہیں دُکھتے؟"

"نہیں۔ اللہ کی سوں۔ مجھے گانٹھیں ہی اچھی لگتی ہیں ...... لا چاچا جلدی گانٹھیں دیدے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

اور مولا دو چار گانٹھیں اسے دے ہی دیتا۔

چیت کا مہینہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ چن شاہ ولی کے عرس کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ چونکہ یہ عرس ایسے زمانے میں ہوتا جب دیہاتی فصل کی کٹائی سے فارغ ہو چکے

ہوتے اور اپنی محنتوں کا صلہ پاکر خوشحالی کی ایک ہلکی سی جھلک ان کی زندگیوں میں نظر آنے لگتی۔ اس لئے وہ خوشی خوشی اپنی اپنی بساط کے مطابق عرس کی تیاریاں کرنے لگے۔
چن شاہ کے مزار کا پرانا مجاور جس کا نام جیون سائیں تھا، مزار کے آس پاس کی زمین کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرتا نظر آنے لگا۔ اسنے گاؤں والوں سے دو جوان مانگے اور ان کی مدد سے مزار کی دیواروں اور برجیوں پر سفیدی کی۔ اور گنبد پر سبز رنگ کیا۔
ادھر گاؤں کی عورتوں میں ہر وقت چن شاہ ولی ہی کا ذکر رہنے لگا۔ وہ ہر روز پہلے سے بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ عرس کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔
اب کے جن عورتوں کو مراد مانگنی تھی۔ ان میں گاؤں کے ذیل دار کی بیوی بھی تھی۔ جس کا نام خیر النساء تھا۔ وہ ایک موٹی بھچس بد مزاج اور غصہ ور عورت تھی۔ چند مہینوں سے وہ کا کی کو بہلا پھسلا کر زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھنے لگی تھی۔ وہ اس سے طرح طرح کے محنت مشقت کے کام لیا کرتی۔ جب عرس کے دن قریب آئے تو اسنے کچھ تو کا کی کی خدمت گزاریوں کے صلے میں اور کچھ مراد مانگنے کی خوشی میں اسے گھٹیا سا پانی ریشم کا ایک سوٹ سلوا دیا جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول چھپے ہوئے تھے۔
جب عرس کا دن آیا تو خیر النساء نے کا کی کو گرم پانی سے خوب نہلوایا۔ گھر کی ایک بوڑھی عورت نے اسکے سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر کنگھی کی۔ اور ایک سرخ چٹلا اس کی چوٹی میں گوندھا گیا۔ جو اسکے بھورے بالوں پر خوب سجنے لگا۔ اسکی آنکھوں میں کاجل ڈالا گیا۔ ریشمی کپڑوں اور بناؤ سنگھار سے اس کا روپ کئی گنا بڑھ گیا۔ اور وہ کسی زمیندار کی بہو بیٹی معلوم ہونے لگی۔
"کاکی" ذیل دارنی نے کہا "تو میرے ساتھ ساتھ ہی رہیو"
"اچھا چاچی۔"
"جانے کن کن گاؤں سے لوگ آئیں گے۔ ان میں شریف بھی ہوں گے، بدمعاش بھی۔ اور کہیں کوئی تجھے بھگا لے جائے"
"نہیں چاچی"

"اور جب میں مزار پر مراد مانگنے بیٹھوں تو تو بھی میرے پاس ہی بیٹھ جائیو۔"

"چاچی۔ تیرے تو اولاد ہے تو مراد کیوں مانگے گی؟"

"میرے اب تک لڑکیاں ہی ہوئی ہیں۔ میری تمنا ہے جن شاہ ولی مجھے ایک چاند سا بیٹا بھی دیں۔"

کاکی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"چاچی میں بھی مراد مانگوں؟"

"ہٹ پگلی تیرا ابھی بیاہ ہی کب ہوا ہے۔"

"تو میرا بیاہ کب ہوگا؟"

"چپ کم بخت کیسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔"

کاکی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ خیر النسا نے زور سے اسکی چٹیا کھینچ کر اُسے چُپ کرا دیا۔

جن شاہ ولی کا مزار زیادہ دور نہیں تھا اس لئے ذیلدارنی، کاکی اور چند رشتہ دار عورتوں کے ساتھ پیدل ہی پہاڑی کی طرف روانہ ہوگئی۔

اُس روز ابھی تڑکا ہی تھا کہ دُور دُور کے گاؤں سے عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر بھی سوار تھے۔ یہ گاؤں کے بانکے سجیلے نوجوان تھے۔ رنگ دار لنگیاں باندھے، بوسکی کی قمیصیں پہنے چاندی کے بٹن لگائے خواہ مخواہ گھوڑے کو ایڑ لگاتے۔ اور ٹخ ٹخ کرتے چلے آتے تھے۔ کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ میاں آگے گھوڑے پر بیٹھا ہے، بیوی پیچھے بیٹھی ہے۔ بیوی نے ایک ہاتھ سے میاں کی کمر پکڑ رکھی ہے اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو سہارا دے رکھا ہے جو ان دونوں کے بیچ ماں کی چھاتی سے چپٹا دودھ پی رہا ہے۔

بہت سی عورتیں جن کے گاؤں قریب ہی تھے ٹولیاں بنا کر پیدل آرہی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں تھیں۔ نئی نویلیاں پور پور مہندی رچی ہوئی، سُرخ جوڑا، سُرخ دوپٹہ جس میں چنٹیں پڑی ہوئی۔ کناروں پر گوٹا لگا ہوا۔ ہونٹ کثرت سے دنداسہ ملنے سے سیاہی مائل پیازی ہوگئے

تھے اور آنکھوں سے کاجل بہا جاتا تھا۔ ادھیڑ عمر کی دیہاتنیں۔ لمبی تڑنگی۔ ان کی اور ہی وضع تھی۔ موٹی ململ کے کرتے کھدر کی شلواریں جنہیں ہلکا ہلکا نیل دیا ہوا۔ سر اور سینے کو لٹھے کی چادر میں چھپائے۔ چلتے وقت ان کی گردن سیدھی اور نگاہیں سامنے رہتی تھیں۔ یہ عادت انہیں سالہا سال سر پر بدنے اور مٹکے یا اناج کی گٹھڑیاں بغیر ہاتھوں کے سہارے اٹھا کر چلنے کے باعث آپ ہی آپ پڑ گئی تھی۔

مزار سے ذرا فاصلے پر ایک جگہ کو ہموار کر کے میدان سا بنا لیا گیا تھا۔ جہاں لنگر کی دیگیں چڑھا دی گئی تھیں۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے کچھ دوکان دار سستے کھلونے لے آئے تھے اور زمین پر چادریں بچھا کر دوکانیں سجا دی تھیں۔ کچھ لوگ بانس کی چھتریوں پر غبارے پھرکیاں، پیپے، ہوے وغیرہ دھاگوں سے لٹکائے خود بین باجہ بجاتے ہوئے میلے کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ایک طرف پہاڑی کے نیچے چرخ اور گنڈولے گڑے تھے۔ جن کی چرخ چوں سے پیہم ایک گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ بچوں کے علاوہ خاصی بڑی عمر والے مرد بھی چرخ پر بیٹھے شور مچا رہے تھے۔ کبھی کبھی دو چار من چلی عورتیں بھی ہنڈولوں میں بیٹھ جاتیں۔ اور جب ہنڈولا اوپر آسمان کی طرف جاتا تو وہ ڈر کر چیخنے لگتیں۔ اور اپنے بچوں کو اور بھی بھینچ کر سینوں سے چمٹا لیتیں۔ کئی پیڑوں میں جھولے پڑے تھے۔ جن میں کہیں عورتیں اور کہیں مرد پینگیں بڑھا رہے تھے

سہ پہر ہوتے ہوتے اتنی مخلوق جمع ہو گئی۔ کہ پہاڑی پر چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ زمین کے علاوہ پہاڑی کے سب پیڑوں کی ڈالوں پر بھی آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے جو زائرین مراد مانگنے آئے تھے، وہ پہاڑی پر چڑھ کر مزار کے اندر پہنچتے۔ اور قبر کے سرہانے یا پائنتی جہاں بھی جگہ مل جاتی بیٹھ کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے۔ قبر پر سبز رنگ کی نئی ریشمی چادر ڈال دی گئی تھی۔ زائرین پھول اور چڑھاوے اسی پر چڑھاتے تھے۔

ذیلدارنی نے بھی قافلے کے ساتھ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ڈیرہ جمایا تھا۔ وہ شام سے کے قریب پھولوں کی چادر، لڈو اور نذر کی دوسری چیزیں لے کر مراد مانگنے گئی۔ کاکی اور دو ایک عورتیں اسکے ہمراہ تھیں۔ قبر کے سرہانے تھوڑی سی خالی جگہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے اس پر قبضہ

جما لیا۔ اور ٹھنس ٹھنسا کر وہیں بیٹھ گئیں۔ پھر ذیلی دار نی اور دوسری عورتوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ کاکی نے بھی ان کی پیروی کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ آخر دعا ختم ہوئی اور یہ عورتیں مزار سے نکل کر پھر اسی پیڑ کے نیچے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئیں۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہر چند گیسوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر ان کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ تھی۔ ایک گیس مزار کی کوٹھڑی کے باہر صحن میں رکھا گیا تھا ایک پہاڑی راستے کے بیچوں بیچ تاکہ زائرین ٹھوکر نہ کھائیں۔ اور ایک اس جگہ جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ باقی تمام جگہوں پر تیل کے دیئے یا چراغ یا مشعلیں جلائی گئی تھیں۔ کچھ لوگ گھر سے لالٹینیں لے آئے تھے۔ وہ بھی کہیں کہیں روشن تھیں۔ مگر ان سب کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ ہر طرف نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

رسم کے مطابق سب زائرین کو رات یہیں گزارنی تھی۔ دیہات کے لوگ اور خاص طور پر عورتیں رات کو جلدی ہی سو جانے کی عادی ہوتی ہیں۔ اس پر دن بھر میلہ دیکھنے اور گھومنے پھرنے سے وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بعض نے تو لنگر کا بھی انتظار نہ کیا اور دریوں اور چٹائیوں پر جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئیں۔

رات کو نو بجے کے قریب لنگر تقسیم کیا گیا۔ اور میلے میں ایک مرتبہ پھر چہل پہل پیدا ہو گئی۔ آخر دس بجتے بجتے یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا۔ اور اسکے ساتھ ہی زائرین کی بیشتر تعداد کو نیند نے بے سدھ کر دیا۔

کاکی ذیلی دارنی کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ عرس کی ریل پیل۔ ہنگامے، کھیل کود، شور غل بھانت بھانت کی صورتیں، عورتوں کا چن شاہ ولی کے مزار پر جانا، اور اولاد کی مراد مانگنا، دن بھر یہ سب تماشے دیکھ دیکھ کر اسکے کمزور دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس سے اسکی نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پڑی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہاڑی پر اب بھی کہیں کہیں لوگ ہنس بول رہے تھے ایک طرف ذرا فاصلے پر ملنگوں کی منڈلی جمی ہوئی تھی۔ اور کچھ لوگ مٹکے کی نے کے ساتھ گا رہے تھے۔

" چل سنتاں دے سنگ نی جے توں ہوناں سنت نی "

اس منڈلی سے بار بار ایک شعلہ اندھیرے میں لپکتا۔ اور لمحہ بھر کو بعض شکلوں کو اجاگر کر دیتا۔ کاکی کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہی۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت ذیل دارنی اور دوسری عورتیں نیند میں مدہوش تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اُس منڈلی کی طرف جانے لگی۔ جب ذرا قریب پہنچی تو ایک گرے ہوئے درخت کا تنا نظر آیا۔ اور وہ اُس پر بیٹھ گئی یہاں سے اُسے وہ شعلہ زیادہ روشن اور اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اور وہ پہلے سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ یہ تماشہ دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں اُس منڈلی میں سے ایک آدمی اٹھا۔ اور زور زور سے کھانستا ہوا اس طرف آنے لگا جدھر کاکی درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ کاکی نے اُسے جھٹ پہچان لیا۔

"چاچا مولا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"تو کون ہے؟"

"واہ مجھے نہیں پہچانا؟"

مو۔ے نے اپنی واحد آنکھ کو ملا۔ اور بے اختیار بول اٹھا۔

"او ہو ہو کھئی واہ یہ تو اپنی کاکی ہے۔"

اسنے کاکی کو ہمیشہ بُرے حال میں دیکھا تھا۔ مگر اب اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"کھئی ر۔ ۔ کی سوں کاکی تو ان کپڑوں میں بڑی خوبصورت لگ رہی ہے۔"

"چاچا یہ کپڑے ذیل دارنی نے سلوائے ہیں۔"

"اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ابش ہے کھئی۔"

"چاچا تجھے اک بات بتاؤں؟"

"۔۔۔"

"جب ذیل دارنی نے لڑکے کی مراد مانگی تو میں نے بھی لڑکے کی مراد مانگی۔ آہا ہا۔ چاچا یہ ۔۔۔ ذیل دارنی کو ۔ بتانا۔"

۔ ۔ لے نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عین اسوقت منڈلی میں

سے پھر ایک شعلہ لپکا۔ کاکی اُسے دیکھتے ہی چلا اٹھی:

"چاچا یہ آگ سی کیا نکلتی ہے؟"

"کون سی آگ؟"

"وہ دیکھو پھر نکلی۔"

اس اثنا میں کئی شعلے پے در پے لپکے۔ مولے نے دیکھا تو مسکرانے لگا۔

"اسکولاٹ، کہتے ہیں اسے۔ تو نے یہ لاٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی؟"

"کبھی نہیں۔ چاچا چل مجھے دکھا۔"

مولا گھبرا سا گیا۔

"آج نہیں پھر کبھی سہی۔"

"نہیں۔ میں آج ہی دیکھوں گی۔"

"اچھا ٹھہر۔" اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔ "ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"کسی کو بتائے گی تو نہیں۔"

"کبھی نہیں۔"

"قسم کھا چن شاہ ولی کی۔"

"چن شاہ ولی کی سوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"یاد رکھ تو نے قسم توڑی تو چن شاہ ولی تجھ پر غصے ہوگا اور تیری مراد کبھی پوری نہیں کریگا۔"

"کہہ جو دیا چاچا نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا تو ٹھہر۔ میں وہ لاٹ یہیں لاتا ہوں۔ . . . ."

علی الصباح ذیلدار نی کاکی کو جو دری سے ذرا ہٹ کر زمین پر بے ہوش پڑی تھی، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھ کھلنے میں نہ آتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کہتی جاتی۔

"خندی نے ایک ہی دن میں زمین پر لوٹ لوٹ کر کپڑوں کا کیا ناس کر دیا۔ اری

اٹھتی ہے یا دوں لیک لات "
"اٹھتی ہوں چاچی۔" آخر بڑی مشکل سے کاکی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ جو اس وقت بہت سرخ ہو رہی تھیں۔
"ما شاء اللہ۔ میلہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ جا رہے ہیں۔ جلدی سے برتن سنبھال۔ دری لپیٹ۔ ذیلدار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔"
کاکی کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے اٹھی مگر کھڑی ہوئی تو ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ گرتی پڑتی درخت کے تنے کے پاس پہنچی۔ جہاں پانی کی مشکی رکھی تھی۔ اور لوٹا بھر کر پانی پیا۔ پھر منہ پہ چھینٹے دیئے۔ رفتہ رفتہ اس کے حواس درست ہونے لگے . . . .
چمن شاہ ولی کے عرس کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گاؤں کی عورتوں نے کاکی کے مزاج میں ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ یہ کہ اسے کھانے پینے کی رغبت نہ رہی۔ کہاں تو ایسی پیٹو کہ دن میں کئی کئی مرتبہ کھانا کھاتی۔ اور چھاچ کے گڑوے کے گڑوے پی ڈالتی۔ یا اب یہ حال کہ کھانا دیکھ کر ہی اسے متلی سی ہونے لگتی۔ ویسے بھی اسے دن رات ابکائیاں آتی رہتیں۔ یہ کیفیت چار پانچ ہفتے تک رہی۔ اس کے بعد محلے کی عورتیں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئیں کہ کاکی کا پیٹ روز بروز پھولتا جا رہا ہے
سب سے پہلے ذیلدارنی پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔
"ارے کاکی، بچی۔ تجھے تو حمل ہے کم بخت۔"
ذیلدارنی کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور وہ حیوانوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی
"کاکی سچ سچ بتا تو کس آدمی سے ملی تھی؟"
"کسی سے بھی نہیں چاچی۔"
"تو پھر رنڈی یہ حرام کا بچہ تیرے پیٹ میں کیسا ہے؟"
"میرے پیٹ میں بچہ ہے چاچی؟" یک بارگی کاکی کی آنکھیں روشن ہو گئیں "تو سچ کہتی ہے چاچی؟ آہا تو پھر چمن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔"

دو چار دن میں یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ وہ جس طرف بھی جاتی مرد اسکو گھورتے۔ اور عورتیں اسپر سوالوں کی بوچھار کر دیتیں۔ مگر کاکی کو اب نہ جھڑکیوں کا ڈر تھا نہ مار پیٹ کا خوف۔ اس پر اب ہر وقت ایک جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ کبھی اس طرح خطاب کرنے لگتی۔ جیسے کوئی اسکے سامنے کھڑا ہے جس کو وہ تو دیکھ رہی ہے مگر کوئی اور نہیں دیکھ پاتا۔ کبھی ہنسنے لگتی تو ہنسے ہی چلی جاتی۔ اور رونے لگتی تو گھنٹوں روتی ہی رہتی۔ گاؤں کے اکثر گھروں میں اب بھی اس کا پھیرا رہتا۔ مگر کہیں چند منٹ سے زیادہ نہ ٹکتی۔ کبھی آپ ہی آپ کہہ اٹھتی۔

"ہاں چاچی میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ مجھے جن شاہ ولی نے دیا ہے۔ وہ اس رات میرے پاس آیا تھا۔ اسنے دانتوں میں سرخ گلاب کا پھول داب رکھا تھا۔ مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا۔ پھر اسنے وہ پھول میری جھولی میں پھینک دیا۔ . . . ."

اور شمے گوجر کی بیوی سے، جو ہمیشہ اس سے شفقت سے پیش آتی تھی۔ اس نے کہا۔

"جن شاہ ولی ہر رات میرے پاس آتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے سفید گھوڑے پر سوار تھا میں نے کہا۔ جن شاہ ولی مجھے سیر کرا۔ اسنے کہا اچھا۔ پھر اسنے مجھے اپنے پیچھے بٹھالیا۔ اور دور دور کی سیر کرائی۔ اس کا گھوڑا دریاؤں کے اوپر چلتا تھا۔ پہاڑوں پر چڑھتا تھا آسمان پہ اڑتا تھا۔ میں نے جن شاہ ولی کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا جن شاہ نے کہا۔ کاکی ڈر نہیں۔ تو گرے گی نہیں۔"

اور ہتاری کی نئی بیوی سے، جو عمر میں کاکی سے تین چار سال ہی بڑی تھی اسنے کہا۔

"تجھے پتہ ہے چاچی جن شاہ ولی بڈھا نہیں۔ نہ اسکے ڈاڑھی ہے۔ وہ بڑا گبھرو جوان ہے۔ اس کے لمبے لمبے گھنگریالے بال ہیں۔ جو اسکے شانوں پر لٹکتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ کاکی تیرے بال بڑے الجھے ہوئے ہیں۔ لا میں انہیں سلجھا دوں۔ اور وہ اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ . . . ."

کبھی کبھی وہ مولے گنڈیری والے کی دکان پر بھی جاتی۔

"چاچا مولا دیکھا چمن شاہ ولی نے میری مراد پوری کردی۔ لا تھوڑی سی گانٹھیں تو دے۔"
مویے کے چہرے کا رنگ یکبارگی زرد پڑ جاتا۔ اور وہ گھبراہٹ میں بہت سی گنڈیریاں اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

ایک دن وہ ذیل دار نی کے گھر پہنچی تو خیر النسا نے پہلے تو اُسے سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر جھپٹا پکڑ کر خوب گھسیٹا اور بہت سی لاتیں اور تھپڑ بھی رسید کئے۔
"خبردار رنڈی اگر پھر کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔"
"چاچی"۔ کاکی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے مارا ہے۔ رات چمن شاہ آئے گا تو میں اس سے کہوں گی۔ ذیل دارنی بہت بری ہے۔ اسکی مراد کبھی پوری نہ کرنا۔"
اور پھر گاؤں والوں نے پنچایت کی جس میں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے شامل ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ کاکی کی وجہ سے گاؤں کی سخت بدنامی ہو رہی ہے اس لئے اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

اس فیصلہ کو عمل میں لانے کے لئے علی الصباح ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا گیا اور اس میں کاکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے سوار کر دیا گیا۔ یہ بیل گاڑی دن بھر نامعلوم راہوں سے گزرتی رہی اور شام کو ایک اجاڑ مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں کاکی کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے اور اسے زبردستی بیل گاڑی سے اتار دیا گیا۔

منالی میں کچھ دنوں اس واقعہ کا چرچا رہا مگر جب دو تین مہینے گزر گئے اور کاکی کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی آئی۔ تو یہ بات آپ سے آپ گاؤں والوں کے ذہن سے اتر گئی۔

دن پر دن گزرتے گئے یہاں تک کہ پھر چیت کا مہینہ آ گیا۔ زمین سے ہر طرف پھر بہار کی مہک اٹھنے لگی۔ کسان فصلوں کی کٹائی سے فارغ ہوئے اور ایک بار پھر چمن شاہ ولی کے عرس کی تیاریاں ہونے لگیں۔
پچھلے برس خیر النسا کی مراد تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ مگر اسی گاؤں کی دو عورتوں پر چمن شاہ

کی نظرِ کرم ہوگئی تھی۔ ذیل دارنی کو اپنی محرومی کا رنج تو بہت تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اب کے چن شاہ ولی ضرور خواب میں اپنا دیدار کرائیں گے۔

آخر عرس کا دن آ پہنچا۔ اس دفعہ پچھلے سال سے بھی زیادہ زور شور سے میلہ بھرا۔ شام کو چن شاہ ولی کی قبر پر مراد مانگنے والی عورتوں کا اس قدر جمگھٹ ہو گیا۔ کہ سانس لینا مشکل تھا۔ مگر یہ عورتیں فرطِ عقیدت سے اور بھی قبر پر پلی پڑ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جس قدر زیادہ تکلیف اٹھائیں گے اُسی قدر جلد ہماری مراد پوری ہوگی۔

اس ہجوم میں خیر النساء بھی ولی کی قبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ چڑھاوا چڑھا چکی تھی۔ اور بہت منت وزاری سے بیٹے کے لئے دعا بھی مانگ چکی تھی۔ وہ درگاہ سے اٹھنے ہی کو تھی کہ ایک عورت جس کی وضع فقیرنیوں کی سی تھی ہجوم کو چیرتی ہوئی قبر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی گود میں تین چار مہینے کا بچہ تھا۔ دبلا پتلا ہڈیوں کی مالا۔ وہ یا تو سو رہا تھا۔ یا اس میں اتنی سکت ہی نہ تھی۔ کہ آنکھ کھولے۔

اس عورت کی نظر جیسے ہی خیر النساء پر پڑی۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔

"دیکھ او ذیل دارنی میرا بیٹا۔ دیکھ یہ مجھے چن شاہ نے دیا ہے"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا بچہ بڑے فخر سے خیر النساء کو دکھایا۔ ذیل دارنی نے کاکی کو فوراً پہچان لیا۔

"او بے حیا بے شرم یہ تُو ہے دور ہو یہاں سے اپنا حرام کا پلا لے کر"

"آہاہاہا۔ تو مجھ سے جلتی ہے ذیل دارنی۔ کیونکہ چن شاہ نے تجھے بیٹا نہیں دیا۔ اُس نے مجھے بیٹا دیا۔ آہاہاہا"

کاکی کے چہرے سے وحشیانہ خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ذیل دارنی غصے سے کانپنے لگی۔ اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر کاکی کا منہ نوچ لے مگر درمیان میں کئی عورتیں حائل تھیں۔ جو حیرت سے کبھی ذیل دارنی کا منہ تکتی تھیں کبھی کاکی کا۔

"ٹھہر تو جا رنڈی۔ ابھی تجھے اس گاؤں سے باہر نکلواتی ہوں۔ اب کے تیرا سر مونڈھا جائے گا۔ اور تیرا منہ کالا کر کے تجھے گدھے پر سوار کیا جائے گا"

مگر کاکی پر ذیل داری کی ان دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ خیرالنساء کو چڑانے کے لئے برابر کہے جا رہی تھی۔

"تو مجھ سے جلتی ہے ذیل داری۔ کیونکہ جن شاہ ولی تیرے پاس راتوں کو نہیں آتا۔ وہ تیرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی نہیں کرتا۔ وہ تجھے اپنے سفید گھوڑے پر بٹھا کر آسمان کی سیر نہیں کراتا۔ تو ہمیشہ جلتی بھنتی رہے گی ذیل داری۔ جن شاہ تجھے کبھی بیٹا نہیں دیگا۔"

وہ عورتیں جو پہلے تعجب سے کاکی کو دیکھ رہی تھیں اور جن میں سے بعض کو شاید اس سے کچھ کچھ ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی زبان سے اب جن شاہ ولی کی شان میں یہ گستاخ باتیں سنکر دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگیں۔

اتنے میں درگاہ کا متولی جیون سائیں جو باہر دالان میں چٹائی پر بیٹھا تھا شور سنکر اندر آ گیا۔ ذیلداری نے اُسے دیکھتے ہی چلانا شروع کیا۔

"دیکھو سائیں بابا۔ یہ کاکی بے حیا نہ جانے کہاں سے حرام کا پلا لے آئی ہے۔ اور درگاہ کی بے ادبی کر رہی ہے۔ اسے چٹیا سے پکڑ کر نکال دے۔"

جیون سائیں تھا تو ادھیڑ عمر مگر تھا خوب ہٹا کٹا۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کاکی نے سہم کر چیخ ماری۔

"جن شاہ۔ یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں۔ مجھے بچا، مجھے بچا۔"

مگر کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ اُدھر جیون سائیں عورتوں کو آگے سے ہٹاتا ہوا قریب آتا جا رہا تھا۔ اچانک کاکی نے گود کے بچے کو جو ابھی تک سویا ہوا تھا، جن شاہ ولی کی قبر کے نرم نرم پھولوں پر لٹا دیا۔ اور خود ایک ہرنی کی طرح طرارہ بھر درگاہ سے نکل بھاگی۔

کاکی کی یہ حرکت ایسی غیر متوقع تھی کہ سب لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آخر ذیلداری اور دو تین عورتوں نے "پکڑو پکڑو" کا شور مچایا۔ اس پر کچھ دیہاتی کاکی کے پیچھے بھاگے۔ مگر وہ کودتی پھاندتی پہاڑی کے ایک ایسے ٹیلے پر چڑھ گئی جو بالکل سپاٹ تھا اور جس پر چڑھنا سخت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ لوگ کچھ دیر نیچے کھڑے اُسے دیکھتے رہے۔ مگر کسی کو اس کے پیچھے جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر دو ایک من چلے نوجوانوں نے ہمت کی مگر

ابھی انہوں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کاکی نے ٹیلے کے دوسری طرف پہنچ کر، جس کے نیچے ایک کھائی تھی بے جھجک چھلانگ لگا دی۔ شاید اسے کچھ چوٹ آ گئی تھی۔ کیونکہ وہ کچھ دیر زمین پر ہی بیٹھی رہی۔ آخر وہاں سے اٹھی اور اس طرف کا رخ کیا جہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے بعد یہ جگہ اب ایک کھلا میدان بن گئی تھی۔

اب گاؤں کے کئی آدمی اسے پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے تھے مگر وہ ان سے آگے آگے ہی رہی۔ ہاں ایک دفعہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوتا۔ مگر اس میں نہ جانے کہاں سے ایک منہ زور گھوڑی کی سی طاقت آ گئی تھی کہ اسنے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور پھر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

ساری رات اس کا تعاقب جاری رہا۔ صبح کو جب سورج نکل رہا تھا تو وہ ایک میدان میں اپنا پیچھا کرنے والوں میں ایسی گھر گئی کہ فرار کی کوئی صورت نہ رہی۔ جب اسے پکڑا گیا تو وہ ایک درندے کی طرح ہانپ رہی تھی۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر اسکے کپڑوں کی دھجیاں اڑ گئی تھیں۔ اور اب اسکے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی نہیں رہا تھا۔

اسے کئی آدمیوں نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک آدمی اپنے سر سے پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ وہ پہلے تو چپ چاپ اپنے ہاتھ بندھتے دیکھتی رہی۔ پھر یکبارگی جوش آیا۔ اور اسنے وحشیانہ جدوجہد سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر اسنے اس شخص کی طرف جس نے اس کے ہاتھ باندھے تھے غضب ناک نظروں سے دیکھا پھر پیشتر اسکے کہ وہ کچھ مدافعت کر سکے، اچک کر اس کا کان اپنے دانتوں میں لے لیا۔ اور چبا ڈالا۔

ہاؤسنگ سوسائٹی

قرۃ العین حیدر

جنوری کی برفانی صبح کا کہرہ درختوں پر سے چھٹنے لگا۔ دور گومتی کے اس پار، ریت کے ٹیلوں کے پیچھے سورج نکل آیا تھا۔ اور ندی کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیاں چمکنے لگی تھیں۔ شبراتا مشعلچی باورچی خانے کی چھولداری کے آگے، نم زمین پر اکڑوں بیٹھا سیاہ مسالے والی لمبی تختی پر بہ نہایت پھرتی سے چھریاں صاف کر کر کے ایک طرف کو ڈھیر لگاتا جا رہا تھا۔ اور سردی کم کرنے کے لئے گانے میں مصروف تھا۔ تجلّی طور کی موسیٰ کلیم بنکے نکلیں گے۔ محمد مصطفٰے محشر میں دولہا بن کے نکلیں گے۔ پھر اس نے دوسری قوالی شروع کی ۔۔ دیکھنا ساکی گھٹا کلیجا پر چھائی نہ ہو۔

"باپ رے باپ ۔۔ اتنا بڑا جاڑا ۔۔" دوارکا پرشاد "مخادیم" نے چپراسیوں کی چھولداری میں سے نکل کر اظہارِ خیال کیا۔

"آج آدھی رات تک کی ڈیل ہو بیٹے ۔۔" شبراتا نے جواب دیا اور چھریاں چمکانے میں جٹا رہا۔

امرتیوں کے دھندلکے میں سے دو ہیولے نمودار ہوئے۔ کہر آلود فضا میں سورج کی کرنوں کا چوڑا راستہ سا بن گیا جو سورج سے شروع ہو کر عین شبراتا کے سر پر آن کے ختم ہو رہا تھا کرنوں کی زد میں آنکھیں میچتے ہوئے اس نے آگے آگے آتے ہوئے آدمی کو ذرا بلندی سے آواز دی ۔۔ "بندگی ۔۔ سلاما لے کُم ۔۔" اور دوارکا پرشاد سے مخاطب ہوا۔ "بڑے سبیرے سبیرے ڈالی لائے ہیں ۔۔"

سید مظہر علی جھینگا پاسی کے سر پر مرغیوں کا جھوا اٹھوائے نزدیک آ گئے۔ خشک میوے اور تازہ پھلوں کی کنڈیاں انہوں نے خود اٹھا رکھی تھیں۔

دوارکا پرشاد انگوچھا کندھے پر ڈالتے کافی لمبا فاصلہ طے کر کے میم صاحب کے خیمے

پر گئے اور باہر سے کہا ۔" حضور ۔۔۔ کوئی جنے ڈالی لائے ہیں ۔"

" واپس کر دو ۔۔۔" اندر سے آواز آئی ۔

چند منٹ بعد دوار کا پرشاد پھر خیمے میں گئے ۔" میم صاحب او کہت ہیں کی ۔۔۔

" ٹھیک ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے ۔۔۔ ہمارا اسلام دو اور ڈالی لوٹا دو ۔۔۔"

دوار کا پرشاد نے واپس آکر میم صاحب کے الفاظ دہرا دیئے ۔

" اچھا ۔۔۔" سید مظہر علی نے مزید اصرار نہیں کیا ۔ اور سر جھکائے گاؤں کی سمت لوٹ گئے انہوں نے سوتی اچکن پہ گاڑھے کی چادر کا لبکل مارا ہوا تھا اور کنٹوپ پہن رکھا تھا ۔ اور ادھوڑی کے جوتوں کے ساتھ ہاتھ سے بنے ہوئے سرخ موزے پہنے تھے جن کی ایڑیاں نکل چکی تھیں ۔ ان کے پیچھے پیچھے بڑا سا جھوا سر پر اٹھائے جھینگا یا سی اچکتا اور لنگڑاتا ہوا تیز تیز چلتا سنبر کو بہت قابل رحم سا معلوم ہوا ۔ دونوں آدمی بہت قابلِ رحم معلوم ہوئے ۔ اس نے تختی پہ پوڈر چھڑکا اور راجہ ہریش چندر" نوٹنکی کی "چیز" الاپنے میں مصروف ہو گیا ۔

" ہم محلن کے باسی رہے ناٹ
کت نک دور توری کاسی ۔ کت نت دور ۔۔۔"

سورج کی روشنی تیز ہوئی ۔ کیمپ میں چہل پہل شروع ہو گئی ۔ آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا ۔ دور دور تک کھیت کی منڈیروں کے ساتھ ساتھ یکے ، ادھے ، بہلیاں اور سائکلیں کھڑی تھیں ۔ اہلکار ، عرضی نویس ، محرر ، کسان ، زمیندار ، گواہ ، موکل درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے ۔ دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے ۔ ڈولی درخت کے نیچے رکھ دی گئی ، اس کے اندر بیٹھی ہوئی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی ۔ مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا عورت نے اپنا بیان دیا ۔ پھر وہ سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی ۔

دوپہر ہو گئی ۔۔۔ شیشم کے جھنڈ میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوا ۔ اور جھومتا جھامتا کیمپ کی جانب بڑھا ۔ وسط کے بڑے خیمے کے سامنے پیادے نے نیچے اتر کر دوار کا پرشاد کو آواز دی ۔

دوار کا پرشاد پھر میم صاحب کے خیمے کی طرف لپکے۔

"نواب شمس آرا بیگم کا ہاتھی آرا ہے ۔۔۔ چھوٹی بٹیا کھاطر ۔۔۔"

"واپس کر دو ۔۔۔" میم صاحب نے حسب معمول جواب دیا۔ وہ اس وقت خیمے کے عقب میں آرام کرسی پر بیٹھی اپنے بیٹے کو الہ آباد خط لکھ رہی تھی۔ چھوٹی بٹیا دوسرے خیمے سے تیر کی طرح نکلیں "ملما ۔۔۔ ماما ۔۔۔ ماما ۔۔۔" انہوں نے دھاڑنا شروع کیا۔ "ہم تو جمبو پر ضرور چڑھیں گے ۔۔۔ ہم تو جمبو کو امرود کھلائیں گے ۔۔۔ ماما ۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ زمین پر لوٹ گئیں۔

"اچھا ۔۔۔ اچھا۔ جاؤ۔ مٹی میں مت لوٹو ۔۔۔" میم صاحب نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ اور خط لکھنے میں منہمک ہو گئیں۔

چھوٹی بٹیا نے جھک کر اپنی سرخ جوتیوں کے بکل بند کئے اور گود میں اٹھائے جانے کے لئے دوار کا پرشاد کی طرف ہاتھ اٹھا دیئے۔ مدار بخش خدمت گار نے جلدی سے پھول دار ریشمی چھتری لا کر دی۔ مہاوت نے ہاتھی گھٹنوں کے بل بٹھایا۔ دوار کا پرشاد بٹیا کو گود میں لیکر ہودے میں فروکش ہو گئے۔ اور اپنی بڑی بڑی سفید مونچھوں پر بڑے وقار سے ہاتھ پھیرا۔ وہ کلکٹر صاحب کے چپراسی تھے۔ کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا۔ نواب شمس آرا بیگم کا پیادہ ان سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔ گھسی ہوئی زربفت کی جھول اور منقش ہودے والا ہاتھی اجلاس کے سامنے سے گذرتا بارہ بنکی پور کی گڑھی کی سمت روانہ ہوا۔

عدالت میں ڈولی کے اندر سے پردہ نشین بی بی کی فریاد جاری رہی۔ ڈولی کے پیچھے تین طرف چھوٹی سی قنات لگا دی گئی تھی۔ قنات کے اندر ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی ہری چھینٹ کا تنگ پاجامہ پہنے، گلابی ململ کا دوپٹہ سر سے لپیٹے زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اسنے ایک ہاتھ سے ڈولی کا پردہ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے زمین پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتی تھی۔ باہر اجلاس میں اس کا نام بار بار لیا جا رہا تھا۔ قنات کی درز میں سے جھانک کر اسنے باہر دیکھا۔ سامنے سے ہاتھی گذر رہا تھا۔ اس پر سنہرے بالوں والی ایک بہت چھوٹی سی بچی سوار تھی۔ بچی نے بھالو کی کھال ایسا بڑے بڑے بالوں والا کوٹ پہن رکھا تھا اور ایک سفید مونچھوں والے وردی پوش بڑے میاں نے رنگ برنگی چھتری سے اس پر سایہ

کررکھا تھا۔ بالکل جیسے پریوں کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ڈولی کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی حیرت سے جھانکتی رہی۔ یہاں تک کہ ہاتھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر گیلی مٹی پر انگلی سے تصویریں بنانے میں دوبارہ مشغول ہو گئی۔ اب کے سے اسنے ہاتھی کی تصویر بنائی۔ اسپر ہودے کی چار لکیریں کھینچیں اور اس میں تاج پہنے ہوئے شہزادی بٹھال دی۔ اسنے اپنے آپ سے کہا: یہ شہزادی میں خود ہوں ــــ میں بسنتی بیگم ــــ"

"مساۃ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم نابالغ ــــ" عدالت میں اس کا نام پکارا جا رہا تھا اسنے سہم کر ڈولی کا پردہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ہاتھی گاؤں سے باہر نکلا۔ آبادی کے سرے پر صدیوں پرانی خانقاہ تھی اور باؤلی۔ اور اس سے ذرا آگے بڑھ کر مخدوم زادہ شاہ منور علی کا مکان تھا ــــ ہاتھی مکان کے برابر کی گلی میں سے گذرا۔ ہودے میں سے چھوٹی بٹیا کو مکان کا کچا آنگن نظر آیا جس میں لمبی سیاہ داڑھی اور سیاہ کاکلوں والے ایک بزرگ نارنجی رنگ کی کفنی پہنے ایک کھاٹ پہ بیٹھے آسمان کو تک رہے تھے۔ چگی داڑھی اور اداس شکل والے ایک اور بزرگ مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ امرود کے پیڑ کے پیچھے ایک لڑکی سرخ رنگ کا تنگ پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مسالہ پیس رہی تھی۔ اسنے چاندی کی میلی میلی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

دھوپ تیز ہو گئی۔ اجلاس لنچ کے لئے برخاست ہوا۔ لالہ سین بخش منصدی نے وہ مسل لپیٹی جس میں مساۃ بوٹا بیگم مدعیہ کی درخواست منسلک تھی۔

"منکہ مساۃ بوٹا بیگم، بالغ، قوم مسلمان، ذات سید، سکنہ موضع محمد گنج، تحصیل سہرونی، ضلع سلطان پور، بیوہ سید زوار حسین جنت آرام گاہ، کاشت کار موضع ہذا کی ہوں۔ عرصہ تین سال کا ہوا، فدویہ کی اکلوتی دختر سیدہ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم کے واسطے جسکو اللہ تعالیٰ

جل شانہٗ نے بطفیل جناب بتولؑ پاک علیہ السلام دولتِ حسن صورت و سیرت و عصمت سے مالا مال کیا ہے۔ نواب سکندر قلی خان عرف نواب بھورے تعلقدار ستہر دلی، درگا کنڈ نے خواہش کتخدائی کی ظاہر کی۔ فدویہ نے پیغام نامنظور کیا کس واسطے کہ نواب صاحب موصوف باوجود تعداد کثیر از دواج منکوحہ و ممنوعہ و غیر ممنوعہ ہونیکے بعمر پینسٹھ سال ازحد عادی جبلِ فسق و فجور و لہو لعب کے ہیں۔ بعد چند روز مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۳۶ء چار گھڑی رات گئے بذریعہ پیادگان مسلح اغوا بستی بیگم سلمہا بعمر ساڑھے تیرہ سال عمل میں آیا۔ اور اس بانوئے معصوم عفیفہ کو گڑھی درگا کنڈ میں قید کر دیا گیا۔ نواب شمس آرا بیگم تعلقدار پاربتی پور اس وقت تک فدویہ سے بہت موافق تھیں کس واسطے کہ ممدوحہ نے بعالم طفولیت فدویہ سے درس قرآن حکیم لیا تھا اور فدویہ گڑھی پاربتی پور میں آتو جی کے عہدے پر مدت مدید تک منصوب رہی تھی۔ علاوہ ازیں شوہر فدویہ کا گڑھی کے ذاکروں میں اسم تھا اور وہ مرحوم اخیر ایام زندگی تک باوجود فتور بصارت امام باڑہ ممدوحہ میں سوزخوانی کرتے رہے تھے لہٰذا بیگم صاحبہ دام اقبالہا نے ازطرف فدویہ رجوع عدالت کیا اور مقدمہ فوجداری واغوا نواب بھورے پر دائر کر دیا کہ مابین تعلقہ ہائے ممدوحہ و نواب صاحب موصوف پشت ہا پشت سے سلسلہ مقدمہ بازی بہ وجوہ گوناگوں جاری ہے۔

بعد چند روز بوقت نصف شب نقاب پوش ڈاکوؤں نے غریب خانہ میں کود کر فدویہ کے دُرِّ یتیم سید کرار حسین سلمہٗ کو بعمر اٹھارہ سال گنڈاسوں سے شہید کر دیا اور غائب ہوگئے۔

بعد ازاں، عدالت حاکم پرگنہ کے روبرو میاں نوروز صاحبزادہ نواب شمس آرا بیگم نے بیان دیا کہ مسماۃ بستی بیگم منکوحہ ان کی ہے اور اس لڑکی کے وارث وہ خود ہیں ـــــ ازبسکہ بوجہ اس شعلہ جدید در خرمن و فتنہ ثانی کے یہ امر اب ازحد نازک و پیچیدہ ہو چکا ہے۔ بحکم جناب خلائق پناہ مسٹر رام سرن بھارگو حاکم پرگنہ مسماۃ بستی بیگم بذریعہ پولس گڑھی درگا کنڈ سے نکال کر میری تحویل میں دے دی گئی۔ مگر اب طاقت میاں نوروز کے دعوئے باطل کے مقابلے کی اس اجل گرفتہ میں نہیں ہے۔ اور فدویہ بحالتِ افلاس ولاچاری و بےکسی و اضطرار و اندیشۂ شدید حضور کیواں قدر نوشیرواں وقت ہمایوں شکوہ جناب کلکٹر صاحب بہادر سے

فرما دی ہے کہ مزید ابواب فساد و آتش افروزی اس ضمن میں بحکم خاص بند فرماویں اور یہ امر کہ اعانت مدعیہ استحقاق کی منظور نظر فیض منظر ہے باعث ثواب و حسنات اور زیادتی نام و نشان آپ کا ہووے گا۔

دیگر عرض یہ ہے کہ گواہی میں فدویہ دریں حالات پر آشوب فقط سید مظہر علی کا کاشتکار سکہ محمد گنج کو پیش کر سکتی ہے جو گو کہ رعیت نواب شمس آرا بیگم کی ہیں لیکن بکمال صفائے باطن ——

دھوپ اب اتر کر صحن کی دیوار پہ آ چکی تھی۔ سید مظہر علی اپنے کھیتوں کا ایک چکر لگا کر پھر موڑھے پر آن بیٹھے۔ ان کے بڑے بھائی شاہ منور علی مدینہ اخبار سے منہ ڈھانپ کر کھاٹ پر لیٹ گئے۔ سید مظہر علی کی بی بی نے دن بھر دھوپ میں سرخ مرچیں سکھائی تھیں جن کی دھانس سے سید مظہر علی کو دو تین چھینکیں آئیں۔ جھینگا پاسی کی عورت دہلیز میں بیٹھ کر منظور النساء کی سر میں جوئیں دیکھنے لگی۔ منظور النساء کے سرخ تول کے تنگ پاجامے کے پائنچے کیچڑ میں سنے ہوئے تھے کیونکہ وہ دن بھر اوسارے کے سامنے گیلی مٹی سے گھروندے بنا رہی تھی۔

شاہ منور علی بے چینی سے پھر اٹھے —— "اللہ غنی ——" انہوں نے زور سے نعرہ لگایا۔ مرغیاں کٹ کٹ کرنے لگیں۔ ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی کھڑکی اور سید اختر علی اندر داخل ہوئے۔

"بھیا لوٹ آئے تحصیل سے ——" سید مظہر علی کی بی بی نے کہا۔

"السلام علیکم" نووارد نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو ذرا دور سے مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام، جیتے رہو ——" سید مظہر علی نے کہا۔ سید اختر علی نے صحن کے کونے میں رکھے ہوئے مرغیوں کے جھوے پر نظر ڈالی۔

"میم صاحب نے ڈالی واپس کر دی۔" سید مظہر علی نے کہا۔

"پورے دس روپے اشرفی لال سے ادھار لے کر ای ڈالی لے گئے رہے تمہری خاطر۔"
بھاوج نے تلٹ پر سے مرچیں ڈھونڈتے ہوئے فریاداً کہا۔
"ہمارے کام کا کیا ہوا۔" سید اختر علی نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔
"ہم ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط لے کر اجلاس سے قبل کلکٹر صاحب سے ملے تھے۔ انہوں نے کہا ہمیں سفارش کی کوئی ضرورت نہیں۔ لکھنؤ درخواست بھجوا دیجئے۔ ہم جانسن صاحب سے بات کرلیں گے۔"
"جانسن صاحب شام کو پہونچیں گے۔ کل سویرے ہی شکار کے لئے چلے جائیں گے۔ ہم کیمپ سے سب معلوم کرتے آئے ہیں۔ دو روپے لالہ حسین بخش کی نذر کئے۔"
"میم صاحب انگریز ہیں نا ——؟" سید منظہر علی نے دریافت کیا۔
"دادا انگریز تھے۔ مرزا پور میں نیل کی کاشت کرتے تھے۔ وکرم پور کے نواب کی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ کلکٹر صاحب بہار کے کسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میم صاحب کو میکے سے زمینداری ملی ہے۔ الہ آباد اور مسوری میں کوٹھیاں ہیں۔ دو لڑکے ہیں۔" سید اختر علی نے جواب دیا۔
"اللہ کی شان ہے۔ وہ پاک پروردگار بعضے لوگن کو دنیا کی سر بنایت عطا کرتا ہے۔" بھاوج نے سوپ میں ارہر کی دال پھٹکتے ہوئے قناعت سے اظہارِ خیال کیا۔ خاموشی چھا گئی۔
"خداوند تعالےٰ عاشق کو بہت لمبی جائیداد عطا کرتا ہے۔ صبر کی جائداد ——"
شاہ منور علی نے دفعتاً کہا۔ اور اٹھ کر باہر چلے گئے اور سنسان گلی میں سے گذرتے درگاہ کی منڈیر پر جا بیٹھے۔
"بھائی صاحب نے بھی تمہارے لئے اتنے چلّے کھینچے —— کچھ نہ ہوا۔" سید منظہر علی نے آہستہ سے کہا۔ "پچھلے سال چھ مہینے تک گومتی کنارے کٹی میں پڑے رہے۔ چلّے کے جاڑے تھے نمونیہ ہو گیا۔ منظور یا حقّے آؤ بٹیا ——" انہوں نے لڑکی کو آواز دی۔ اس نے حقّہ تازہ کر کے باپ کے سامنے لا رکھا۔ سید منظہر علی نے جو بڑے بھائی کے سامنے حقّہ نہ پیتے تھے اب ایک کش

لگایا اور بات جاری رکھی "ہم بہت ہاتھ پیر جوڑ کر گھر واپس لائے آج کل جناتوں کو قابو کرنے کا عمل کر رہے ہیں ___ ہم نے کلکٹر صاحب سے کہلا کے لئے کہا کہ ہمارا چھوٹا بھائی وکیل ہے مگر قسمت کا ہیٹا ہے۔ ضلع کچہری میں وکالت کی وہاں نہیں چلی۔ کان پور میں پریکٹس شروع کی وہاں فاقوں کی نوبت آگئی۔ اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ سنا ہے لکھنو سکتر صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت خالی ہوئی ہے۔ اگر حضور کرم گستری فرما کر اس کی سفارش کر دیں۔ وہ کہنے لگے سید صاحب ہم کس قابل ہیں۔ البتہ بھروسہ رکھئے وہ دیر یا سویر سب کی سنتا ہے "

"اب ہم تیرہ تیزی کے مہینے میں سنبھلے جائیے کے شاہ مدار کے مزار پہ چادر چڑھا دیں جیسے تم کا ڈگری ملے ہے ___ بھاوج نے سوپ دیوار پہ ٹانگتے ہوئے کہا۔

سید اختر علی نے بیزاری سے بھاوج کو دیکھا اور گھڑونچی کی سمت نظر دوڑائی۔ بھاوج لپک کر گئیں اور جگر جگر کرتے مراد آبادی کٹورے میں گھڑے سے یخ ٹھنڈا پانی انڈیل کر دیور کو پیش کیا۔ وہ دیور سے ماں کی طرح محبت کرتی تھیں۔

سید منظر علی نے دو پلی ٹوپی سر پہ رکھی اور کھڑاؤں پہن کر عصر کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے۔ سید اختر علی نے مدینہ اخبار اٹھا کر حقے کی نے اپنی طرف کر لی۔ کیونکہ وہ بھی بڑے بھائی کے سامنے حقہ نہیں پیتے تھے۔ دور درگاہ کے منڈیر پر سے شاہ منور علی نے یا بدوح کا دل ہلا دینے والا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت اس مکان اور اس فضا پر ایسی اداسی طاری تھی کہ کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ باہر باؤلی کے نزدیک نیم تلے بھیڑ جمی تھی۔ نواب کمبودے کا بھتیجا مُنّن خان جو ڈاکوؤں میں مل گیا تھا بستی کے چند بے فکروں کے ساتھ بیٹھا چوسر کھیل رہا تھا اور پانسہ پھینکتے ہوئے بار بار جمشید کو چڑا رہا تھا۔ ___

مرغاں چمن دیتے ہیں جب جھیل میں انڈے
مختار لوگ دیتے ہیں تعطیل میں انڈے

جمشید علی ایک طرف کواکڑوں بیٹھا بے دلی سے کھیل رہا تھا۔ جب مُنّن خاں نے تین چار بار اس کے باپ کی بے روزگاری پر اس طرح چوٹ کی تو غم و غصے سے بھنا کر اسنے

مُنّن کو ایک تھپّڑ رسید کیا۔ ب اطالٹ دی اور باؤلی کی نالیاں پھلانگ کر لمبے لمبے قدم رکھتا خانقاہ کی طرف چلا گیا۔

کھنڈر کے پیچھے چھپ کر اس نے جھنگلیا سے پلکیں خشک کیں اور سامنے دیکھنے لگا۔ نرکٹ کی باڑ کے نیچے قبرستان تھا جس میں ادھر ادھر بدی کے چند پیڑ کھڑے تھے اور روئی کے سفید سفید پھول سائے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قبروں کے چاروں طرف اونچی اونچی گھاس تھی۔ اور خاردار جھاڑیاں۔ اور ناگ پھنی اور کروندے اور تھوہڑ کے پودے۔ چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے غار، ببول کے درخت۔ مٹی کی ڈھیریاں، سانپ کے بل۔ سفیدی سے لپے پتے مزار کچی قبریں۔ دور کونے میں شیشم کے نیچے مجاور اور گورکن کے کچے گھر کھڑے تھے۔ گورکن کی بیوی نے رات کے کھانے کے لئے چولہا سلگا دیا تھا اور کہرے کو لپٹتا ہوا دھواں آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ ایک گوشے میں تین چار ٹوٹے ہوئے گھڑے بکھرے پڑے تھے۔ ایک قبر پر کسی نے چراغ جلا دیا تھا اور اس کی لو سے کتبے کا طاقچہ سیاہ ہو چکا تھا۔ سڑک کی رُخ والی منڈیر کے نیچے چنبیلی کی خود رو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دو چرواہنیں اپنی بکریوں کو ہنکا کر گھر لے جاتی ہوئی ادھر سے گذریں اور چنبیلی کے سائے میں بنی ہوئی ایک نئی قبر کو دیکھ کر ایک چرواہن نے کہا ـــ "سہاگن کی قبر ہے۔ جبھی چنبیلی رات کو ایسی مہکتی ہے ـــ" شام کے سناٹے میں سرد ہوا قبر پر جھکی بیری کی ٹہنیوں میں سرسرانے لگی۔

جمشید کو ڈر سا لگا۔ اس نے چپل جھٹک کر تلوے کے نیچے سے ایک کنکری نکالی۔ اور مٹی کے تودوں اور اینٹوں کو پھلانگتا کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ شاید مہاوٹیں برسنے والی تھیں۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ جمشید بغلوں میں ہاتھ دیئے سُوں سُوں کرتا بہت دیر تک منڈیروں پر گھومتا رہا۔ ہاتھی پارتی پور کی گڑھی کی طرف سے واپس آ رہا تھا۔ تالاب کے کنارے گولر کے نیچے کھڑے ہو کر جمشید نے بڑی دلچسپی سے ہاتھی کو دیکھا اور اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چھوٹی بٹیا ہودے میں بیٹھی دوار کا پرشاد سے نل دمنیتی کا قصہ سننے میں اس قدر محو تھیں کہ ان کی سُرخ چھتری ان کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی۔ ہاتھی آگے بڑھ گیا۔

جمشید نے نقرئی موٹھ والی رنگ برنگی ریشمی چھتری زمین پر سے اٹھالی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے مہادت کو آواز دی۔ مگر ہاتھی برا حل کے درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ وہ چھتری ہاتھ میں لئے لئے گھر لوٹ آیا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے چھتری بیٹھک کے ایک کونے میں کھڑی کر دی۔ اور چکر لگا کر ڈیوڑھی کی طرف پہونچا۔ چپلیں اتار کر ان کی گرد جھاڑی۔ ان کو دیوار پر رکھا اور پھر ایک پاؤں ناند پہ ٹیک کر اندر آنگن میں کود گیا۔

اسکے تینوں اداس شکلوں والے بزرگ، بڑے ابا، چچا ابا اور ابا دالان میں تخت پر حسب معمول سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چچی دال میں بگھار لگا رہی تھیں۔ چچا ابا کی لڑکی منظور النساء بلاوجہ اصحلنی کو دی پھر رہی تھی اور زور زور سے الاپ رہی تھی۔

"ڈنڈا ہرایا گلی رووت ہے
ڈنڈے کی ماں روٹی پووت ہے

اتنے میں چچی باورچی خانے سے نکلیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور زور کا طمانچہ لگایا — "جب دیکھو تب کھیل —— اتنی بڑی ہو گئی جب دیکھو تب گدکڑے۔ دونوں وقت ملتے ہیں۔ ابا کے وضو کا پانی لگا ——"

منظور النساء بھائیں بھائیں کر کے رونے لگی اور پناہ لینے کے لئے باہیں پھیلا کر اپنے چچازاد بھائی کی طرف دوڑی جو اسی وقت دیوار پر سے اندر کود اتھا۔ جمشید نے بے پروائی سے اپنے چپلیں دیوار پر سے اتار کر اسے تھما دیئے۔

"جا انہیں کوٹھری میں رکھ آ" اسنے لڑکی سے کہا۔ منظور النساء نے فوراً رونا بند کر دیا۔ اور گرد آلود بڑے بڑے چپلوں کو بڑے پیار سے بانہوں میں سنبھالا گویا وہ اس کی جیبتی گڑیاں تھیں اور اندر چلی گئی۔

جمشید مونڈھا کھینچ کر اپنے بزرگوں کے قریب بیٹھ گیا۔ جھینگا پاسی کی عورت سائبان میں سے گائے کھول کر ناند کی طرف لے جارہی تھی۔ باہر گاؤں کے گھروں میں چراغ جل چکے تھے۔ سید منظر علی کی بی بی نے دالان میں آکر روئی کے پردے چھوڑ دیئے۔ مغرب

کی اذان ہوئی ــــ اندھیرا چھا گیا۔

شبر و اشیلی نے سارے خیموں میں، جا بجا گیس کے ہنڈے۔ لیمپ اور لالٹینیں جمع کیں۔ ان کو باورچی خانے کی چھولداری کے سامنے لا کر ایک قطار میں رکھا۔ مدار بخش خدمتگار آئے اور اس قطار کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور انہوں نے جھاڑن سے شیڈ اور چمنیاں صاف کرنی شروع کیں۔ چھوٹی بٹیا ایک طرف سے اچھلتی کودتی آئیں اور اکڑوں بیٹھ کر بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگیں۔ ان کو ہر شام یہ تماشہ دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ مدار بخش نے چمنیاں صاف کرنے کے بعد بتیاں روشن کرنا شروع کیں اور ہمیشہ کی طرح پہلا لیمپ روشن کرتے ہوئے انہوں نے زیر لب کہا۔

"چراغ روشن مراد حاصل صلوٰۃ صلوٰۃ سلام آلیکم یا منکر نکیر۔

دل میرا ایمان قبر میرا مکان ـــ"

"مدار بخش تمہارا مکان قبر میں کیوں ہے؟" چھوٹی بٹیا نے ایک بار پھر حیرت سے اپنا سوال دہرایا۔

"شبیر ـــ بلاقن کو بھیجو ـــ جرم جلی نے ابھی تلک استری گرم نہیں کی ـــ"

دور کے خیمے سے میم صاحب کی آواز آئی۔ چھوٹی بٹیا کو استری کا تماشہ بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ تیر کی طرح بھاگتی ادھر پہونچیں ـــ "ماما ـــ ماما ـــ بلاقن جرم جلی کیوں ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"بھاگ جاؤ۔ یہاں سے ـــ"

"نہیں ـــ بتایئے ناماما ـــ"

"بس وہ جرم جلی ـــ" میم صاحب نے غصے سے جواب دیا۔ در اصل اس وقت وہ دوارکا پرشاد سے مخاطب تھیں۔

"ماں باپ کو کھا گئی۔ میاں نے دوسری عورت کر لی۔ گھر کا بارہ باٹ ہو گیا مگر وہ بنجتی

بھی کیا کرے۔ سب کرموں کا پھل ہے —"

"ماما — ماما — کرموں کا پھل کیا ہوتا ہے —؟"

"بٹیا چلیے آپ کو کمشنر صاحب یاد کرتے ہیں —" دوسرے چپراسی نے اندر آ کر کہا۔ وہ اسی تیز رفتاری سے خیمے سے باہر نکل گئیں۔

کیمپ میں اس وقت بڑا بندوبست تھا۔ چاروں طرف گیس کے ہنڈے جھک جھک کر رہے تھے چھوٹی بٹیا کو خاص طور پر اجازت مل گئی تھی کہ وہ بڑوں کے ساتھ کھانا کھائیں وہ خیمہ طعام میں اپنی اونچی کرسی پر بیٹھی "انکل جانسن" کو جمبو کی سواری اور گڑھی پاریچ پور کے پالتو ہرنوں اور بارہ سنگھوں کا قصہ سنا رہی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے چھوٹی بٹیا کا قد بہت چھوٹا تھا اس لئے وہ اونچی کرسی پر بیٹھ کر ہی میز کے برابر آ سکتی تھیں۔ میز کے سرے پر میم صاحب شوفان کے نئے پہلی "پارٹی" بارڈر والی پیاری ریشمی ساری اور وائٹ ویز کلکتہ کے بیاں خریدا ہوا فر کوٹ پہنے روسٹ کاٹنے میں مشغول تھیں۔ سنہری مائل کتھئی بالوں کے گچھے مروجہ فیشن کے مطابق ان کی پیشانی اور کانوں پر چھائے ہوئے تھے اور انہوں نے کانوں میں انگریزی وضع کے بُندے پہن رکھے تھے جس میں طلائی زنجیروں کے سرے پر دو بڑے بڑے موتی لٹک رہے تھے۔ جب میم صاحب دوران گفتگو میں سر ہلاتیں تو یہ بُندے گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ہلتے۔ میم صاحب انگریز نژاد تھیں۔ مگر انگریزی انہیں واجبی ہی آتی تھی۔ اور شادی سے پہلے اپنے میکے میں سخت پردے میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن انکی سفید رنگت اور ذرا ولایتی چہرے مہرے کی وجہ سے نوکر چاکر انہیں "بیگم صاحب" کے بجائے ادب لا کے میم صاحب کہنے پر مصر تھے۔

میز کے نیچے انگیٹھی دہک رہی تھی۔ پیال پر بچھی ہوئی دری پر ملازمین قابیں اٹھائے دبے پاؤں ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ میم صاحب جانسن صاحب کو بسنتی بیگم کے اغوا کا قصہ سنانے لگیں۔ جانسن صاحب بہت نفیس اردو بولتے تھے۔

"مگر نواب بھوندے بھی ایک گھاگ ہیں۔ پرانے سیار۔ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ ہمیں بے چاری لوٹا بیگم پر بڑا ترس معلوم ہوتا ہے —" میم صاحب نے جانسن صاحب سے کہا۔

جنوری کی رات کی یخ بستہ ہوا تیز ہو گئی۔ خیمے کی دیواریں ہلنے لگیں۔ سن سن کرتے گیس کی روشنی ذرا مدھم پڑی تو سستبر زمانے پھرتی سے اس میں ہوا بھر دی۔ مدار بخش نے لپک کر آخری کورس کے لئے پلیٹیں بدلیں۔ جب انہوں نے ایک قاب جانسن صاحب کے آگے پیش کی۔ جانسن صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ مدار بخش نے بڑی متانت سے ان سے کہا ــــ "پھنس ــــ" یعنی فنش ــــ یعنی یہ آخری کورس ہے۔ مدار بخش پر تکلف دعوتوں کے موقعوں پر انگریز مہمانوں سے ہمیشہ انگریزی بولتے تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ان کے دادا پردادا صاحب لوگ کے بنگلوں پر بولتے آئے تھے۔

جانسن صاحب نے میزبان خاتون سے ڈنر سروس کی تعریف کی اور میم صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ روسی برتن انہوں نے پشاور سے منگوائے تھے۔ جہاں ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کے مشہور روسی برتنوں کی ایک دوکان تھی۔ اس کے بعد جانسن صاحب نے کلکٹر صاحب سے کل کے شکار کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔

خیمے کی ایک دیوار ذرا زور سے ہلی اور درز میں سے دو متجسس متحیر آنکھوں نے اندر جھانکا۔

جمشید نے ایک بار پھر ہمت کی کہ اندر جا کر چھتری میم صاحب کو دیدے لیکن ایک بار پھر اس الف لیلوی منظر میں کھو گیا۔

اب بلوری پیالے میز پر لائے گئے جن کے پانی پر گلاب کی سرخ پنکھڑیاں تیر رہی تھیں مگر ان لوگوں نے یہ پانی پینے کے بجائے پیالوں میں اپنی اپنی انگلیاں ڈبو دیں۔

جمشید نے سنہرے بالوں والی بچی کو دیکھا جس کے عین مغز کے اوپر بڑا سا سرخ ربن سجا تھا اسے اپنی چچازاد بہن منظور النساء یاد آئی۔ جو کانوں کے بہت سارے سوراخوں میں چاندی کی میلی میلی بالیاں پہنتی تھی اور موٹی چھوٹی مارکین، ڈوریے اور گاڑھے کے خاک آلود کپڑوں میں کھنکتی رہتی تھی اور بڑی ہو کر اس کے پلّے بندھے گی اور وہ دونوں

کان پور کی ایک تنگ و تاریک گلی میں اسی سفید پوشی اور تنگدستی کی زندگی گذار دینگے جیسی زندگیاں ان کے باپ اور چچا اور دادا اور پردادا نے گذاری تھیں۔ جب کہ میم صاحب اور کلکٹر صاحب اور ان کی برادری والے اسی طرح معطر پانی کے بلوریں پیالوں میں لفاست سے اپنی انگلیاں ڈبوتے رہیں گے۔

دیوار کا پردہ ہلتا دیکھ کر مدار بخش اچانک اس طرف متوجہ ہوئے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اندر جانسن صاحب نے سگار سلگایا۔ میزبانوں کو شب بخیر کہا۔ بچی کو پیار کیا۔ اور کھڑکھڑاتا ہوا چمکیلا، سفید نیپکن میز پہ رکھ کے کرسی سے اٹھے۔ دوارکا پرشاد نے باہر سے لپک کر دروازے کا پردہ اٹھایا۔ جانسن صاحب بے حد لمبے تڑنگے انگریز تھے وہ سر خم کرکے دروازے سے نکلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔ دوارکا پرشاد سرخ بانات کی چپکن پہنے پھر دروازے کے پاس اپنی اسٹول پہ آن بیٹھے۔ انہوں نے جمشید کے پیروں کی چاپ سن لی اور آہٹ پر کان لگا دیئے۔ "کون ہے ---؟" انہوں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

" جمشید بڑبڑا کر سرپٹ بھاگا۔ بھاگتے میں وہ خیمے کے رسّوں سے الجھ گیا۔ دوارکا پرشاد اور دوسرے چپراسیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ چور۔ چور۔ وہ سب چلائے اور اس کے ہاتھ سے چھتری چھین لی۔

" چور ---- سرڈُ ---- چوٹّے۔" دوارکا پرشاد نے جمشید کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔

" ہم چور نہیں ہیں ----" اسنے بھنّا کر کہا اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آگئے۔

" ہم بٹیا کی چھتری دینے آئے تھے۔ ہمیں تالاب کے کنارے پڑی ملی تھی۔"

" سرڈُ ---- ہم کا پڑھاوت ہو بے ایمان۔" دوارکا پرشاد گرجے اور تین چار طمانچے اور لگا دیئے۔

" مدار بخش۔" اندر سے میم صاحب نے آواز دی۔ مگر مدار بخش بھی موقع واردات پہ پہنچ چکے تھے۔

چھوٹی بٹیا نے دروازے میں سے جھانکا "ماما ––– ماما ––– دوار کا پرشاد نے چھ
ٹا ہے" انہوں نے بے حد خوش ہو کر کہا۔
"یہ کیا ہلا ہو رہا ہے –––" میم صاحب نے دروازے میں آکر دریافت کیا۔ دفعتاً اس نے آنسو
نک کئے اور میم صاحب کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔
"ہم چوہا یا بے ایمان نہیں ہیں۔ ہم سید جمشید علی ہیں۔ ہم درگاہ شریف کے شاہ منور علی
ے بھتیجے ہیں۔ ہمارے چچا سید مظہر علی صبح آپ کو سلام کرنے" پھر اس نے جلدی سے الفاظ
بدل کئے ––– "آپ سے ملنے آئے تھے مگر آپ نے ان کو باہر ہی سے لوٹا دیا –––"
"شاہ منور علی –––" میم صاحب نے ذرا دلچسپی سے دہرایا ––– "شاہ منور علی۔ ہم نے ان کی
بہت تعریف سنی ہے۔ وہ جناتوں کو قبضے میں کرتے ہیں نا –––؟"
"بڑے ابا کے قبضے میں کوئی جنات نہیں ہیں مسلسل افلاس اور احساسِ محرومی سے ان
ے دماغ پہ اثر ہو گیا ہے –––" جمشید نے تلخی سے جواب دیا۔ سردی کی وجہ سے اسکے دانت بجنے
لگے۔ اور اس نے ایک سسکی بھری۔
"اندر آجاؤ ––– باہر کیوں کھڑے ہو –––" میم صاحب نے کہا "مدار بخش پلیٹ لگاؤ"
"جی نہیں۔ میں کھانا گھر سے کھا کر آیا ہوں"
میم صاحب نے اس کی بدلتی رنگت دیکھی۔ انہیں اپنا بیٹا سلمان یاد آگیا جو اسی
طرح غیور اور خود دار تھا۔
وہ خیمے کے اندر آکر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔
"بٹیا۔ جمشید بھیا کا شکریہ ادا کرو۔ یہ اتنی سردی میں تمہاری چھتری دینے آئے ہیں"
چھوٹی بٹیا نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا۔
"اب گڈ نائٹ کہو –––"
"گڈ نائٹ –––!" اور اسکے بعد وہ بلاقن کے ساتھ باہر چلی گئیں۔
"تمہاری نواب شمس آرا بیگم سے قرابت داری ہے نا؟" میم صاحب نے دریافت کیا۔
"جی نہیں۔ چچا ابا ان کی زمین جوتتے ہیں۔ راجاؤں اور نوابوں سے ہماری کوئی

قرابت داری نہیں "

میم صاحب چونکیں ۔ لیکچر کی یہ تلخی انہیں بہت مانوس سی معلوم ہوئی ۔ ان کا لاڈلا بیٹا سلطان یونیورسٹی سے گھر آکر اپنے دوستوں کے ساتھ جانے کیا کیا اڑایا کرتا تھا ۔ جاگیردار طبقہ ۔ برطانوی استحصال ۔ زرعی انقلاب ۔ ناقابل فہم الفاظ اور اصطلاحات ۔

"کہیں پڑھتے ہو —؟"

"کالج میں پڑھتے ہیں سیکنڈ ائر میں —"

"شاباش !"

"اب اجازت دیجئے ۔"

"کافی تو پی لو ۔"

کافی —؟ کافی اسنے آج تک نہ پی تھی ۔ "جی نہیں " اسنے مضبوطی سے جواب دیا ۔ "ہمارا گھر گاؤں کے آخری سرے پر ہے ۔ پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی — اچھا آداب عرض " اتنا کہہ کر وہ خیمے سے نکلا اور تاریکی میں غائب ہو گیا ۔

گھر پہنچ کر وہ دبے پاؤں دالان میں داخل ہوا ۔ برابر چھوٹے سے دالان میں برابر برابر چار پائیوں پر تینوں بھائی سو رہے تھے ۔ چچی اماں اور منظور النساء دوسری طرف تخت پر فرخ آباد چھاپے کے میلے میلے لحافوں سے منہ ڈھانپے خوابیدہ تھیں ۔ وہ آہستہ سے جاکر اپنی کھاٹ پر گر گیا — اور پتلا سا لحاف اوپر تک کھینچ لیا ۔ زیادہ سردی لگی تو الگنی پر ٹنگی ہوئی لوئی بھی لحاف پر ڈال لی ۔ اور ٹانگیں سکیڑ کے کروٹ کے بل گڑی مڑی ہو کر سو گیا ۔

تہجد کے وقت شاہ منور علی اٹھے ۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے اسکے سرہانے آئے ۔ کچھ پڑھ کر اسکے ماتھے پر دم کیا ۔ اپنے تکیئے کے نیچے سے نکال کر ایک تعویذ اس کے بازو پر باندھا اور پھر جاکر اپنی چار پائی پر پڑ رہے ۔ اسکی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دم سادھے لیٹا رہا ۔ اور اسکا جی چاہا کہ خوب روئے ۔ کچھ دیر بعد چچی اماں اٹھیں اور انہوں نے لالٹین جلائی ۔

منظورالنسا بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔ دونوں ماں بیٹیاں دلائیاں سر سے اوڑھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور وہاں انہوں نے جمشید کے سفر کے لئے ناشتہ تیار کرنا شروع کیا۔ وہ پھر اونگھنے لگا۔ صبح کاذب کے وقت مرغ نے صحن کی دیوار پر جا کر اذان دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسکے پاس گھڑی نہیں تھی۔ اسنے جلدی سے اندھیری گھپ کوٹھری میں جا کر اپنا ٹین کا بکس نکالا۔ دری میں بستر لپیٹا اور در میں جا کر آہستہ سے آواز دی۔

"منظوریا —— ہمارے چپل کہاں ہیں؟"

منظورالنسا بھاگی بھاگی آئی۔ دالان کی دیوار پر ٹنگی ہوئی تیل کی ڈبیا روشن کی مچان پر سے چپل اتارے۔ اس کا کوٹ لائی۔ کھونٹی پر سے اس کا مفلر اتار کر دیا۔ منہ دھونے کے لئے گرم پانی لے کر آئی اور لوٹا اور سینی دانی تخت کے کنارے رکھ دی۔

چچی اماں نے ناشتہ دان بھر کر تخت پر رکھا اور چائے بنانے کے لئے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"بھیا —— تمہرے لئے پوری ہم خود بناوا ہے" منظورالنسا نے کہا۔

"اچھا" جمشید نے جوتوں کے فیتے باندھتے ہوئے ذرا محبت سے اُسے دیکھا اور اس کا دل پسیج گیا۔ بے چاری۔ بے چاری۔ بدنصیب۔ لڑکی۔ اسنے دل میں کہا۔

ڈیوڑھی پر آکر گودندرا نے آواز لگائی۔ اسکے باپ اور چچا جاگ اٹھے۔ چچی نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھا۔ وہ گودندرا کے یکے پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ چنے کے کھیتوں پر کہر ڈولتا تھا۔ اور چاند کی روشنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ بہت دُور کلکٹر صاحب کے کیمپ میں اکا دکا روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دریا پار سے ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ آم کے باغات۔ خانقاہ۔ تالاب۔ منو آن جی کا مندر۔ جھینگا پاسی کا جھونپڑا۔ بڑے ابا چچا ابا۔ چچی اماں۔ منظورالنسا —— یہ سارے ہیولے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بڑے دھند لکے میں غائب ہو گئے۔ اس رات کیمپ سے واپس آکر اسنے طے کر لیا تھا کہ وہ کان پور لوٹ کر جی توڑ کر محنت کرے گا۔ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔ مقابلے کے امتحان پاس کرے گا۔ اور ایک دن اسکے نام کے آگے لکھا جائے گا —— ایس۔ جے۔ علی، آئی، سی، ایس۔

پھر جب میں محمد گنج گاؤں کا تو کسان کہیں گے۔ جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں۔ صاحب۔ کلکٹر صاحب۔ کمشنر صاحب۔ کچے راستے پر یکے کو زور کا دھچکا لگا۔ اسنے جلدی سے یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب میں سے پاسنگ شو کی ڈبیا اور ماچس نکالی۔ جب اسنے ماچس جلائی تو گوبند دا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"ای کا کرت ہو ——" اسنے صدمے سے کہا۔

"گھر پہ نہ بتانا گوبند چاچا ——" جمشید نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔ آئی سی ایس کے سارے خواب گوبند دا کی تیوری پر بل دیکھ کر پل کی پل میں ہوا ہو گئے۔

"اچھا۔ نہ کہبا۔ مل سہرن مارہ کے ای سب نہ سیکھو۔" گوبند دانے مریل گھوڑے کو دوبارہ چابک لگائی —— "جیلت نہیں سسر۔"

"تو ہو کا سگرٹ چاہی —— ؟"

جمشید نے ایک طویل کش لے کر ناک سے دھواں نکالا۔ اتنے میں سامنے سے گوبردھن چاچا آتے دکھائی دیئے۔ وہ کندھے پر ہل رکھے بیلوں کی جوڑی ہنکاتے اپنے کھیت کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جمشید نے گھبرا کر سگریٹ مٹھی میں چھپا لیا۔

"گوبر چاچا نے اگر دیکھ لیا تو یکے سے اتار کر پچاس جوتے لگائیں گے اور گنیں گے ایک نہیں۔

گاؤوں میں کس قدر دقیانوسیت ہے اس نے شدت کی جھنجلاہٹ کے ساتھ سوچا۔ ہندوستان کے گاؤں —— ہا ہا۔ ہندوستان کے گاؤں ——

اسے معلوم نہ تھا کہ اس صبح وہ تقریباً آخری بار اپنے گاؤں سے جا رہا تھا۔ اسکے بعد وہ کبھی اس طرح محمد گنج نہ آئے گا۔ اس طرح گوبند دا کے یکے پر نہ بیٹھے گا۔ گوبردھن چاچا سے خائف ہونے کی ضرورت اسے پھر کبھی محسوس نہ ہو گی۔

۲

کان پور پہنچ کر وہ اپنے گھر کی سیڑھیوں پر چڑھا۔ سامنے گلی کی دیوار پر "بھابی" اور پکار"

غلوں کے اشتہار اور کانگریس کے جلسے کے پوسٹر لگے تھے۔ بیٹھک کے دروازے پر چق پڑی تھی اندر اینٹوں کی فرش پر ایک میز اور موکلوں کے لئے تین چار کرسیاں پڑی تھیں کونے میں قانون کی موٹی موٹی گرد آلود کتابیں الماری کے تختوں پر چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر سید اختر علی کی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں وہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کا گاؤن پہنے کیمرے کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ باقی دیواروں پر سر سید احمد خاں، اور تاج محل کی تصاویر آویزاں تھیں۔ پنجتن پاک کے نام اور کلمے اور "فاعتبروا یا اولی الابصار" فریموں میں لگے تھے اور مدینہ منورہ کا ایک کلنڈر لٹک رہا تھا۔ ایک کونے میں تذکرہ غوثیہ کی جلد اور نظام المشائخ، دین و دنیا اور مدینہ کے فائل دھرے تھے۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز کی درگاہ کی ایک بڑی سی تصویر کارنس پر رکھی تھی۔ کئی برس قبل سید اختر علی نے اپنے حصے کے کھیت بیچ کر کان پور میں یہ مکان خریدا تھا اور پریکٹس شروع کی تھی۔ جمشید میلا سا سوتی پردہ اٹھا کر زنانخانے میں گیا۔ اندر پتلے اور لمبے کمرے کے چاروں دروازے دالان میں کھلتے تھے۔ کمرے میں اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائیوں کی چار پائیاں بچھی تھیں۔ اس کی اپنی چارپائی کے سرہانے اس کی میز لگی تھی جس پر اس کی کتابوں کا انبار تھا جن پر اخبار اور باتصویر رسالوں کے کاغذوں کے کور چڑھے ہوئے تھے۔ اور کڑھے ہوئے میلے میز پوش پر سیاہی کا بڑا سا دھبہ لگ گیا تھا۔ ایک کونے میں اس کی سائیکل کھڑی تھی۔ اس کی اماں سِل میں مبتلا دالان میں لیٹی تھیں۔ چھوٹی بہن عالیہ باورچی خانے میں تھی۔

جمشید نے اسباب ایک چارپائی پر رکھا اور دالان کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے فیتے کھولنے لگا۔

"بھیا ـــ گاؤں سے روپیہ لائے؟" عالیہ کی آواز پر وہ چونکا۔

"روپئے؟"

"ابا نے کہا تھا کہ چچا ابا سے لے کر روپیہ بھیجیں گے۔ ان کو گئے اتنے دن ہو گئے۔ چھٹیوں میں تم بھی چلے گئے۔ یہاں سب پڑوسیوں کا قرضہ چڑھ گیا ہے۔"

"نہیں۔ ہم روپے نہیں لائے۔ مگر ابا کو جلد نوکری مل جائے گی شاید۔ ورنہ ہم کالج چھوڑ

کر خود ڈکری کر لیں گے ـــــ ارے ارے ـــــ رو تی کیوں ہے گدھیا ـــــ!" اس نے عالیہ
کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اماں نے جو برسوں سے پلنگ پر پڑے پڑے حد سے زیادہ چڑچڑی
اور بدمزاج ہو گئی تھیں حسبِ معمول جھنجھنا چلانا اور کھانسنا شروع کر دیا۔ جمشید تخت کے کنارے
چپ چاپ بیٹھا رہا۔

الہ آباد سول لائنز کی ایک پرانے طرز کی کوٹھی کی برساتی میں ایک لمبی چوڑی ۳۵ء کے
ماڈل کی سیلون کار تیزی سے آن کر رکی۔ اور ایک حساس شکل اور سانولی رنگت والا نوجوان
بے حد اکسائٹیڈ انداز میں کار سے اتر کر اپنے کمرے میں گیا۔ جلدی جلدی میز کی درازیں کھولیں۔
کاغذات الٹ پلٹ کر ایک پرس تلاش کیا۔ سرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا دوہرا کارڈ جیب
میں سے نکالا۔ ایک دفعہ اسکے اندر لکھا ہوا اپنا نام پڑھا۔ اور بڑی احتیاط سے اسے پرس
میں رکھ دیا۔

ملازم ڈاک لے کر آیا۔ ماما کی لکھائی لفافے پر دیکھ کر وہ محبت سے مسکرایا۔ اور خط پڑھنا
شروع کیا ـــــ "ہم دورہ ختم ہوتے ہی سیدھے الہ آباد آرہے ہیں۔ اب تمہیں آئی، سی، ایس
کے امتحان کی تیاری کرنا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں نیازی بیگم تمہارے کھانے پینے کا بالکل
خیال نہیں رکھتیں۔ اب تم ماشاء اللہ سے ـــــ" خط ختم کر کے اس نے واپس لفافے میں
رکھ دیا۔ اور اداسی سے مسکرایا۔ پھر وہ دریچے میں جا کر کھڑا ہوا۔ اور سگریٹ جلا کر سوچنے لگا۔
ـــــ ہم بابا اور ماما کو یہ اطلاع کن الفاظ میں دیں کہ ہم اُن کی ساری درخشاں اُمیدوں پر پانی
پھیرنے والے ہیں ـــــ

محمد گنج کی خانقاہ کی منڈیر پر بیٹھ کر سید مظہر علی نے خطِ شکستہ میں پوسٹ کارڈ لکھنا
شروع کیا ـــــ

برخوردار سعادت آثار راحت جان عزیزی جمشید میاں طول عمرہٗ۔ واضح ہو کہ تمہارے ابا
چند در چند وجوہات کی بنا پر ہنوز محمد گنج میں ہیں۔ کیمپ اُٹھ چکا ہے۔ تمہارے ابا نے متعدد

درخواستیں لکھ کر سکتر صاحب کے دفتر بمقام لکھنؤ روانہ کر دی ہیں۔ اللہ بہتری کرے گا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ثریا بیگم کے مقدمے کی پیشی ملتوی ہو گئی ہے۔ کلکٹر صاحب نے بہ کمال مہربانی ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے۔ اور دوران مقدمہ ثریا بیگم مع اپنی لڑکی کے شہر الہ آباد میں کلکٹر صاحب کی سرپرستی میں رہیں گی۔ نواب شمس آرا بیگم نے حرفہائے خلاف نامعقول اس ضمن میں سب سے کہے ہیں۔ و نیز تمہارے ابا کہتے ہیں کہ اپنی سیکل فروخت کر دو۔

چھ مہینے بعد جمشید کو ایک اور پوسٹ کارڈ ملا۔

برخوردار نورچشمی سلمہ تعالیٰ۔ یہ معلوم کر کے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ تم نے ٹیوشن شروع کر دیئے ہیں۔ تمہارے ابا کے روزگار کی ہنوز کوئی صورت نہیں نکلی۔ اب وہ دن بھر خانقاہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم کو فکر شدید اس امر کی ہے کہ خدانخواستہ ان کا خطرہ نہ ٹل جاوے۔ کیونکہ کل شب وہ ہم سے کہتے تھے کہ ان کو بشارتیں ہو رہی ہیں۔ بھائی صاحب قبلہ کو بھی ان کی طرف سے از حد تشویش لاحق ہے۔ اللہ سے دعا کرتے رہو وہ مسبب الاسباب ہے۔

دو سال بعد پوسٹ کارڈ آیا۔

"۔۔۔ نورچشمی منظور النساء سلمہا اب اس لائق ہو چکی ہے کہ اُسے اُس کے گھر بھیجا جاوے۔ لہٰذا عید کے چاند اسے رخصت کر کے لے جاؤ۔ تمہارے ابا اب مستقل ندی کے کنارے کٹی میں رہتے ہیں۔"

دو روپے گز والی سُرخ ساٹن کے غرارے اور ریشمی ململ کے سرخ دوپٹے قمیص میں ملبوس، گلے میں چاندی کا طوق، ملکہ وکٹوریہ کے روپوں والی ہمیل، اور کانوں میں چاندی کے بالی پتے پہنے، لانبی چوٹی میں گوٹے کا موباف ڈالے، لمبا سا گھونگھٹ کاڑھے منظور النساء دلہن بنی برقعے میں لپٹی تانگے سے اتری۔ اس کے جوڑے پر چھوٹا سا لچکہ ٹکا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں فیروزآباد کی سُرخ ریشمی چوڑیاں اور چاندی کی پہونچیاں پہن رکھی تھیں، انگلیوں میں چاندی کے چھلّے تھے

ہتھیلیوں میں تیز سرخ مہندی رچی تھی۔ بازوؤں پر چاندی کے جوشن بندھے تھے۔ سرخ ریشمی موزوں اور انگریزی گرگابی والے پیروں میں چھڑے اور چھاگل چھن چھن کر رہے تھے۔ تین موتیوں والی ٹوٹی ہی نتھ اس کا واحد زیور تھا۔ یہ سارے گہنے اس کی ماں کے جہیز کے تھے۔ صرف اسکے سات جوڑے۔ دولہا کا ریشمی اچکن کا جوڑا اور تانبے کے چار برتن، اور مراد آبادی پاندان سید مظہر علی اشرفی لال مہاجن سے ادھار لے کر بنوا سکے تھے۔ تانبے کے باقی سات برتنوں پر جو ان کی بیوی نے منظور النساء کی پیدائش کے وقت سے سینت سینت کر پچھلی کوٹھری میں چن رکھے تھے۔ دوبارہ قلعی کروا دی گئی تھی۔ نیم تلے شادی کا کھانا ہوا تھا۔ آلو گوشت کا شوربہ تنوری روٹیاں اور زردہ۔ مٹی کے کونڈوں رکابیوں اور سکوریوں میں نکال کر مہمانوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ تام چینی کی پھولدار رکابیاں صرف دولہا اور مولوی صاحب اور چند اور خاص خاص مہمانوں کے لئے تھیں۔ ہندو احباب کے لئے کچھ فاصلے پر۔ پنڈت لچھمی نارائن نے برگد تلے اپنی نگرانی میں بھوجن بنوایا تھا۔ جو کیلے کے پتوں پر پروسا گیا تھا۔ شہنائی بجی تھی۔ مہمانوں کو محظوظ کرنے کے فرائض چپاتی بھانڈ کے سپرد تھے۔ شادی کے خرچے میں سید مظہر علی کا بال بال قرضے سے بندھ گیا تھا۔ منظور النساء ان کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی صورت دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اشرفی لال کی سود در سود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی لاڈلی بچی کے بیاہ میں دل کے سارے ارمان نکالیں۔ مگر قدم قدم پر ان کے افلاس کا بھوت سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور وہ جی مسوس کر رہ جاتے تھے۔ جب رخصتی کا وقت قریب آیا تو وہ گھر سے چلے گئے تھے۔ اور درگاہ کی منڈیر پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے۔ بیٹی کی سرخ پالکی نیم تلے رکھی گئی تو اسے وداع کرتے ہوئے انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں جمشید سے کہا تھا ـــــ "بھیا۔ یہ بڑی بے زبان اور غریب بچی ہے۔ تمہاری کنیز بن کے رہے گی۔ اس کا دل کبھی نہ دکھانا۔"

سرخ رنگ کی سوتی چادر اوڑھے جس پر ابرق کے بڑے بڑے پھول چھپے تھے۔ منظور النساء پالکی میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ پھر اس کی پالکی اسٹیشن روانہ ہو گئی تھی۔ جھینگا پاسی اور اسکے لڑکوں نے جہیز کے ٹرنک اپنے سروں پر اٹھا رکھے تھے۔ اور سب

سے آگے آگے، جامہ پہنے سہرا باندھے ہاتھ میں سُرخ رومال لئے جمشید دولہا بنا گوبندوا کے یکے پر بیٹھا تھا۔

تانگے سے اُتر کر منظورالنساء اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ شہر کی پروردہ عالیہ نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور ذرا منہ بنا کے آواز دی ——" اماں۔ دلہن بھابھی آگئیں۔" منظورالنساء کو دالان کے برابر والی کوٹھری میں بٹھال دیا گیا جو اس کا حجلۂ عروسی تھا۔ یہاں محلے والیوں کے سامنے اس کی منہ دکھائی ہوئی۔ جو ایک ایک روپیہ دو دو روپے اسکے سامنے بچھے ہوئے سُرخ رومال میں ڈالتی گئیں۔ ایک ہفتے تک وہ دن دن بھر بغیر ہلے جلے پلنگ پر سرنگوں بیٹھی رہی اور جب کوئی محلے والی اس کا گھونگھٹ اٹھاتی تو وہ دستور کے مطابق فوراً آنکھیں بند کر لیتی۔

اسکے بعد منظورالنساء نے آنکھیں کھولیں اور اپنے گھر کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا مکان اس کے لئے محل کے برابر تھا۔ اس میں برقی روشنی تھی۔ میز کرسیاں تھیں۔ چینی کے برتن تھے۔ کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے نیلی کانچ کے گلدان طاقچوں میں رکھے تھے اور اس کی بجلی لبنت نند عالیہ اسکول میں انگریزی پڑھتی تھی۔

جمشید اب ایم۔ اے فائنل میں تھا اور رات گئے تک ٹیوشن کر کے گھر کا خرچ چلاتا تھا۔ اس نے بیٹھک کا کمرہ بھی کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔ اور کفایت کے خیال سے سگریٹ پینے چھوڑ دیئے تھے۔ بائیس تئیس سال کی عمر میں وہ تلخ مزاج۔ قنوطی اور ذہنی اور جذباتی طور پر بوڑھا ہو چکا تھا۔

منظورالنساء نے گھر کا سارا کام مشین کی طرح سنبھال لیا وہ دونوں وقت کا کھانا پکاتی۔ بڑی لگن سے ساس کی تیمارداری کرتی۔ اُن کی جھڑکیاں اور طعنے سنتی۔ دیوروں کی خاطر کرتی اور عالیہ سے مرعوب رہتی۔ جمشید اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ مگر اسے اس کا بھی کوئی غم نہ تھا۔ اس کا فرض اپنے شوہر کی خدمت کرنا تھا۔ اور وہ اپنے شوہر کی پرستش کرتی تھی۔

لیکن جب وہ پہلوٹھی کے بچے کی پیدائش کے لئے محمد گنج گئی تو اسکے بعد جمشید نے

اُسے کانپور واپس نہ بلایا۔ اُس نے سید مظہر علی کے تشویش ناک اور بعد میں الم ناک خطوں کا جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

جنگ شروع ہوئے تین سال گذر چکے تھے۔ وہ ملٹری اسٹور کے محکمہ میں حوالدار کلرک ہو گیا۔ سال بھر میں اسے ترقی مل گئی اور وہ شہر کا مکان کرائے پر اٹھا کر گھر والوں سمیت چھاؤنی کے ایک کشادہ اور ہوادار کوارٹر میں منتقل ہو گیا۔ اب وہ چار سو روپے ماہوار پاتا تھا اور گھر میں کینٹین کے سامان کی ریل پیل تھی۔ آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ ایمرجنسی کمیشن میں درخواست نہ دے سکتا تھا جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔ اسی زمانے میں اُس نے سگریٹ کا پورا ڈبہ رات بھر میں پھونک ڈالنے کے بعد منظور النسا کو طلاق لکھ بھیجی۔

جب منظور النسا کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی تو سید اختر علی کو ان کی کوٹھی سے پکڑ کر منگوایا گیا تھا اور انہوں نے پوتی کے کان میں اذان دی تھی۔ شاہ منوّر علی نے ان گنت دعائیں پڑھ کر بچی پر پھونکی تھیں۔ محلے کی عورتوں نے چاول کے کھم بنا کر اور گلگلے تل کے خدائی رات منائی تھی۔ نیم تلے چپاتی بھانڈ نے نقلیں دکھائی تھیں اور گاؤں کی البیلی پاتر حشمت ٹھٹکی لگا لگا کر "— کھیکے ڈبل — کھیکے ڈبل —" الاپتی سید مظہر علی کے نزدیک پہونچی تھی جو احباب کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اور نواسی کی پیدائش کی خوشی میں انہوں نے بڑے رومال کی گرہ میں سے دو روپے نکال کر اُسے دیئے تھے۔ اندر صحن میں چھینگا پاسی کی عورت گھونگھٹ کاڑھ کے اور کمر پہ ہاتھ رکھ کے ناچی تھی حیدری ڈومنی اور اُس کی بہنوں نے "جچہ گیریاں" گائی تھیں۔ اور چونکہ منظور النسا بچی کی پیدائش میں مرتے مرتے بچی تھی، اس لئے، چند روز بعد شکرانے کے طور پر بی بی کی صحنک بھی کی گئی تھی۔

جب بچی کا عقیقہ ہوا تو نانا نے اُس کا نام فرحت النسا بیگم رکھا۔ شاہ منوّر علی

نے اُسے گنڈے تعویذوں سے لاد دیا۔ صحن میں ڈھولک رکھی گئی اور منظور النساء آنکھ کے نشتے کا فالسئی جوڑا پہنے بچی کو گود میں لئے چارپائی پر بیٹھی سہیلیوں کو حسبِ معمول کان پور شہر کے حیرت ناک قصے سناتی رہی "سڑکوں پر ٹن ٹن کرتی ریلیں چلت ہیں۔ یہ بڑے بڑے کارخانے۔ رات کو آنگن میں سوؤ صبح کو دھواں دھار اٹھو۔ ایک دفعے ہم ان کے ساتھ سینما بھی گئے رہے۔"
اسی وقت سبھو دادا جو گاؤں کے ڈاکئے بھی تھے رجسٹری خط لے کر آئے۔

سید منظر کی بی بی گم سم بیٹھی پالنے کی ڈوری ہلایا کیں۔ گاؤں بھر کی عورتیں صحن میں جمع ہوگئیں۔ نوزائیدہ بچی جس کے ماتھے پر نظر کا ٹیکہ لگا تھا اور کلائی میں سیاہ ڈوری بندھی تھی۔ اسی طرح ہنس ہنس کر کلکاریاں مارتی رہی۔ باہر نیم تلے توقیر میاں، گوبر چاچا لالہ مخلص رائے۔ شیخ رمضان، مولوی محمد حسن، پنڈت لچھمی نارائن، گوسائیں کاکا اور گوبند داس سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ منور علی خانقاہ کے اندر خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے صرف ایک نعرہ لگایا ــــ "بڑی لمبی جائداد اُسنے عطا کی ہے ــــ شکر ہے ــــ شکر ہے۔"

سید اختر علی کومنی کے ساحل پر مرتبے میں مصروف رہے انکو کسی نے یہ اطلاع نہیں دی۔ کئی برس گذر گئے۔ بچی کو اُس کی نانی پال رہی تھی۔ منظور النساء بچہ جننے کے بعد زیادہ تر خاموش بیٹھی آسمان کو تکا کرتی۔ صبح صبح وضو کے لئے اٹھتی تو کھیرنی کے درخت کے نیچے پڑے پر بیٹھ کر مناجاتیں پڑھتی۔

توئی سروری، اور توئی اکبری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

کبھی وہ میلاد اکبر کھول کر بیٹھ جاتی اور چپکے چپکے ہونٹ ہلاتی۔

جب باغِ جہاں کے مالی نے کی دیکھا بھالی پھولوں کی!
اک پھول اس میں سے چھانٹ لیا تھی جتنی ڈالی پھولوں کی

گرمیوں کے طویل دوپہروں کے سناٹے میں۔ جاڑوں کی رات کے سرد اندھیرے

میں، برسات کی بھیگی دوپہروں میں اُس کی آواز اس چھوٹے سے مکان میں گونجا کرتی۔

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جلّ جلالہٗ
ترا نام عادلِ کبریا، تری شان جلّ جلالہٗ
جسے چاہے جیسا بنا دیا تری شان جلّ جلالہٗ

اکثر وہ روٹیاں بیلتے بیلتے، فرحت النسار کی چٹیا کرتے کرتے، دھان پھٹکتے پھٹکتے وہ شعر گنگناتی جو اسنے مولوی محمد حسن کی بی بی سے سنا تھا ـــــ

دو پھول ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے
اک قبر پہ چڑھا ہے اک سہرے میں گندھا ہے

اسکے دل میں برچھی سی اتر جاتی اور وہ سوچتی۔ ان کے سہرے میں جانے اب کون سا پھول گندھے گا۔ روز روز وہ اس انتظار میں رہتی کہ اب شہر سے اطلاع آئے گی کہ جمشید نے کسی بی۔ اے پاس لڑکی سے شادی کرلی۔ مگر دن گذرتے گئے اور کچھ نہ ہوا۔ تب وہ یہ آس لگاتی کہ شاید جمشید اس سے رجوع کرلے۔ بیس برس کی عمر میں وہ چالیس سال دکھی عورت معلوم ہوتی تھی۔

سلمان مرزا کو بمبئی گئے عرصہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ الہ آباد آتا اور چند روز بعد پھر غائب ہو جاتا۔ قصرِ سلمان کے ایک سائڈ روم میں بوٹا بیگم مع اپنی لڑکی تسنیم کے گذشتہ چند برس سے رہ رہی تھیں۔ ان کا کیس چیف کورٹ تک گیا تھا۔ اور وہ مقدمہ ہار کر نواب شمس آرا بیگم اور نواب پھوپھی دونوں کو نیچا دکھا چکی تھیں۔ اور اب دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی شریف معمولی حیثیت کے برسر روزگار نوجوان سے تسنیم بیگم کا نکاح ہو جائے۔ قصرِ سلمان میں ان کی حیثیت ہاؤس کیپر کی سی تھی۔ وہ جمعرات کے روز مجلس بھی پڑھتی تھیں اور جب چھوٹی بیٹیا مسوری کانونٹ سے چھٹیوں میں گھر آتیں تو ان کے ملبوسات کی دیکھ بھال بھی بوٹا بیگم کے ذمے تھی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے کلکٹر صاحب کو دعائیں دیا کرتی تھیں کلکٹر صاحب

ریٹائر ہو چکے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کرسی پر نیم دراز تصوف کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ بسنتی بیگم اسکول جاتی تھی اور واپس آکر ساونڈ روم میں بیٹھی آبی رنگوں سے تصویریں بناتی رہتی تھی۔

جس روز اسکول کی سالانہ نمائش میں نقد سو روپے آرٹ کا پہلا انعام ملا۔ لوٹا بیگم سجدے میں گر کر دیر تک روتی رہیں۔ مدتوں بعد پہلی مرتبہ اُن کے ہاتھ میں سو روپے آئے تھے۔ اُن کا چھوٹا موٹا زیور، گاؤں کی تین بیگھ زمین، محمد گنج کا آبائی مکان، سارا اثاثہ مقدمے کی نذر ہو چکا تھا۔ اب میم صاحب اُن کو بیس روپے ماہوار تنخواہ دیتی تھیں۔ پان تمباکو کا خرچ، بسنتی بیگم کے اسکول کی فیس، کتابیں، اُس کے کپڑے لتے، یہ سب بھی میم صاحب نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ دونوں وقت کا کھانا لوٹا بیگم، بسنتی اور سلمان کی بوڑھی انا نیازی بوا کے لئے پچھلے برآمدے کے تخت پر چُن دیا جاتا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد اکثر لوٹا بیگم اپنے جواں مرد بیٹے کو یاد کر کے تڑپا کرتیں۔ اور آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہ تربتر ہو جاتی۔ محرم کے دنوں میں وہ علموں کی بلائیں لیتیں۔ ضریحوں اور تعزیوں کی دھول آنکھوں سے لگاتیں اور جناب علی اصغرؑ کے گہوارے اور ذوالجناح کے سامنے کھڑے ہو کر بلک بلک کر دعائیں مانگتیں ــــ "یا مولاؑ ــــ یا مشکلکشا ــــ یا سید الشہداء ــــ یا امام مظلومؑ۔ بسنتی کا نصیبہ کھول دیجئے۔ بسنتی کو عزت آبرو کے ساتھ کہیں ٹھکانے لگا دیجئے ــــ"

اس وقت سو روپے کا نوٹ بسنتی نے ان کو لا کر دیا تو انہیں پھریری سی چھوٹی۔ یہ کثیر رقم ان کی دکھیاری بیٹی کی صلاحیت اور محنت کا صلہ تھا ــــ "یا الہٰی اس کا مقدر اچھا کر۔"

آنند موہن گھوش اسکول کی ہیڈ مسٹریس کا چھوٹا بھائی تھا۔ نمائش میں بسنتی بیگم کی تصاویر دیکھنے کے بعد اس نے ایل۔ ایم سین کو لکھا ــــ "اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ ہم نے ایک تقریباً جینیس کو ڈسکور کیا ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا۔"

اگلی مرتبہ لکھنؤ آرٹ اسکول کے پرنسپل ایل۔ ایم سین جب الہ آباد آئے تو مسز گھوش نے اپنی ہونہار طالبِ علم کو ان سے ملوایا۔

۔تند سال میٹرک کے بعد بسنتی بیگم سرکاری وظیفے پر لکھنؤ آرٹ اسکول میں داخل ہوگئی
ابھی وہ سٹرڈ ایر میں تھی کہ بوٹا بیگم سخت بیمار پڑیں اور اسے الہ آباد واپس آنا پڑا۔ یہاں وہ
کالج میں داخل ہوگئی۔ اور اسنے اپنے آپ کو بسنتی بیگم کہلوانا ترک کیا۔ کیونکہ یہ نام اسکے
شدید دکھی بچپن کی یادگار تھا۔ ایف۔ اے کے بعد وہ اپنے پرانے اسکول میں
ڈرائنگ ٹیچر ہوگئی۔ اسنے بوٹا بیگم سے کہا۔

[illegible] برس کی عمر سے دھکے کھا رہی ہوں۔ سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ
رہے ہیں۔ مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب بڑی شرم آتی ہے۔ مجھے سوا سو ماہوار کی
[illegible] ہے۔ شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی۔ اور شہر میں مکان لے کر رہوں
[illegible] سامان باندھ لیجیے ———"

"اکیلی بیٹیا کیسے رہیو؟" بوٹا بیگم نے بھونچکی ہو کر پوچھا۔

[illegible] ——" اسنے اگنا کر بحث قطعی طور پر ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔" میں وہ بسنتی بیگم
[illegible] ہے نواب بھوپے کے سپاہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلی
[illegible] ملک کے سارے عوام، سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے ——" اس نے
[illegible] موہن گھوش کے الفاظ دہرائے جس نے اس سے بے حد جوشیلے انداز میں کہا تھا ——
[illegible] ——— دیش کی ساری جنتا، ساری ورکنگ کلاس تمہارے ساتھ ہے ——" بوٹا بیگم
[illegible] یہ نئی، حیرت انگیز بسنتی کیا کہہ رہی ہے۔ انہوں نے جا کر میم صاحب سے کہا۔
[illegible] سمجھتی ہوں۔" میم صاحب نے آہستہ سے جواب دیا ——" میرا بیٹا اسی طرح گھر کا عیش
[illegible] گلیوں کی خاک چھاننے نکل گیا۔ یہ آج کل کی اولاد ہے ان کو سمجھانا لا حاصل ہے
[illegible] من مانی کرینگے ——— جمعرات کی جمعرات تو آتی رہیے گا نا ——؟ میں موٹر بھیج دیا کروں گی"
[illegible] بیگم رونے لگیں۔

[illegible] ایک روز الہ آباد آیا تو آنند موہن گھوش نے اس سے ثریا حسین کا ذکر کیا

جو صحیح معنوں میں عوامی فنکار بن سکتی تھی۔ کیونکہ وہ خود ایک کسان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔
شام کو آنند موہن گھوش سلمان کو پرانے لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے مکان پہ لے گیا۔ اور دروازے پر دستک دی۔ بوڑھا بیگم نے اندر سے جھانکا۔

"مس حسین ہیں؟" آنند موہن گھوش نے پوچھا۔

"کو۔۔۔؟"

"مس حسین۔۔۔"

بوڑھا بیگم کی سمجھ میں نہ آیا۔۔۔ "بسنتی۔۔۔" انہوں نے آواز دی۔ وہ دروازے پر آ گئی۔

"ارے بسنتی بیگم!۔۔۔" سلمان نے حیرت اور مسرت سے کہا۔۔۔ "تم اتنی پر اسرار بن گئیں ہیں یہاں مس حسین کے رعب میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا ہوں!!"

ثریا نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔۔۔ "آیئے، آیئے۔ اندر آ جایئے" بوڑھا بیگم سر پر دوپٹہ رکھ کر جلدی سے اندر دبک گئیں۔ ثریا دونوں لڑکوں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی۔ جو اس کا اسٹوڈیو بھی تھا۔ سلمان نے چاروں طرف دیکھا "حد ہے۔۔۔ کمال ہو گیا۔!!"
اس نے قیصر سلمان میں ثریا کو آتو جی کی لڑکی بسنتی کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ جو اس سے کانا پردہ کرتی تھی اور عموماً اِدھر اُدھر دبکی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ہونہار آرٹسٹ ثریا حسین کے نگار خانے میں کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے ثریا کو پہلی مرتبہ غور سے اور توجہ سے دیکھا اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔

سلمان اب پھر الہ آباد بھیجا گیا تھا۔ وہ ثریا کو اپنے ساتھ جلسوں، تقریبوں اور سیاسی اور ادبی محفلوں میں لے جانے لگا۔ اور وہ اسکے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو گئی۔

ثریا اس طبقے سے آئی تھی۔ جو ان نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ تھا۔ وہ خود اس بھیانک طریقے سے فیوڈل نظام کا شکار رہ چکی تھی۔ وہ سب اس سے دُرگا کنڈ کی گڑھی کے واقعات سنتے جہاں اسے چھ مہینے تک قید رکھا گیا تھا۔ وہ اس قیامت کی رات کا ذکر کرتی جب ڈھاٹے باندھے ہوئے بدمعاشوں نے اسکے اکلوتے بھائی کو گنڈاسوں سے ہلاک کیا تھا۔ وہ

بنے ندھے اور حسرت زدہ باپ کو یاد کرتی جو ایسی درد بھری آواز میں مرثیے اور سوز پڑھتے
تھے کہ سننے والوں کا کلیجہ دہل جاتا تھا۔ وہ ساتھیوں کے لئے بیرونِ اور سلمان کے لئے اس
کا آدرش بن گئی۔ اسی زمانے میں اس نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے بھی کر لیا۔

چھوٹی بٹیا اب کراسویٹ کالج میں تھیں۔ بوا بیگم ہر جمعرات کو قصرِ سلمان جا کر مجلسیں
پڑھتیں مگر ثریا ان کے ساتھ بہت کم جاتی تھی۔ اس کی اور سلمان کی دوستی کے متعلق خیال
کر کے بوا بیگم کا دل ہلا جاتا تھا۔ "صاحب میم صاحب مجھے کتنا نمک حرام سمجھیں ــــ"
وہ لرز لرز کر سوچتیں۔ ثریا سے کچھ کہنے کی ان کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر قصرِ سلمان وہ جھینپی
جھینپی آتیں۔ میم صاحب نے اس سلسلے میں کبھی کوئی ذکر ان سے نہ چھیڑا۔

۴۷ء کے اپریل میں چھوٹی بٹیا نے ایف۔ اے کا امتحان دیا۔ اور اسی مہینے والدین
کے ہمراہ حسبِ معمول مسوری چلی گئیں۔ سلمان الٰہ آباد ہی تھا جب تقسیمِ ہند کا اعلان کیا گیا۔

جنگ کے بعد وہ محکمہ ٹوٹ گیا جس میں جمشید ملازم تھا۔ وہ عمر بڑھ جانے کی وجہ سے
آئی۔ سی۔ ایس اور پی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں میں نہ بیٹھ سکتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد وہ
قسمت آزمانے کراچی روانہ ہو گیا۔

دن بھر جھڑی لگی رہی تھی۔ برساتی کا کالر اونچا کئے تیز تیز قدم رکھتا سلمان مرزا ثریا
کے گھر پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ پڑوس میں ریڈیو بج رہا تھا۔
اور پنجاب اور دہلی سے نکلنے والے پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کے پتے ان کے عزیزوں کو
سنائے جا رہے تھے۔ فضا پر عجیب سی نحوست اور ویرانی طاری تھی۔ سلمان کے قدموں

کی آہٹ پر ثریا نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ وہ اندر گیا۔ ثریا نے اس کے لئے کرسی کھڑکی کے نزدیک کھینچ دی۔ "ایک دم حبس ہو گیا ہے۔" اسنے خالی خالی آواز میں کہا۔ سلمان نے کرسی پر ٹک کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اور سگریٹ جلایا۔

"وقت بہت کم ہے ـــــ" اسنے متوازن آواز میں کہا ـــــ "اور ہمیں معلوم ہے کہ کسی کرائسس میں تمہارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے۔ تم ہمیشہ ہمارا ساتھ دو گی ـــــ ٹھیک ہے نا ثریا ـــــ ؟" دفعتاً اس کی آواز میں بچوں کا سا لہجہ عود کر آیا۔ چھوٹی بیٹیا کا سا لہجہ۔

"تقریر مت جھاڑو۔" ثریا نے اکتاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اتنے برسوں سے متواتر تمہاری تقریریں سن رہی ہوں کرائسس۔ آدرش۔ اصول۔ اقدار۔"

"تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی ـــــ ہمیں مایوس نہ کرنا۔" سلمان نے بھونچکا ہو کر بڑے کرب سے کہا۔

"یوں بہتر ہے کہ تم انسانوں کی طرف سے اب تک خوش فہمی میں مبتلا ہو ـــــ!"

گلی میں ریڈیو کی آواز گونجی ـــــ "شری ذاب چند کھنہ کا خاندان ڈکوٹا کے ذریعہ پنڈی سے امرتسر پہنچ رہا ہے ـــــ جناب فضل دین وکیل کا خاندان خیریت کے ساتھ ہوشیار پور سے لاہور پہنچ چکا ہے ـــــ چودھری ٹیکا رام اور ان کے خاندان کے لئے ایک ٹرک جہلم بھیجا جا رہا ہے ـــــ ایک بار پھر سن لیجئے ـــــ"

ثریا نے کھڑکی بند کر دی۔

"ثریا ـــــ" سلمان نے اسی کرب کے ساتھ کہا ـــــ "تم تجریدی تصویریں بناتے بناتے حقیقت سے بالکل کٹ گئیں ـــــ"

"ایک اور مفروضہ! اور سلمان مرزا۔ میں تم سے آرٹ پر بحث کرنا نہیں چاہتی یہ تمہارا میدان نہیں ـــــ"

ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔

"میں یہاں بیٹھ کر روز شام کو خبریں سنتی ہوں مگر تمہارے گھر والوں کی خیریت اب تک نہیں سنی۔" اس کی آواز میں خفیف سی بے رحمی تھی۔

"ایک بار پھر سن لیجئے ۔۔۔ جناب قمرالدین مرزا ۔ بیگم مرزا اور مس مرزا ۔۔۔"
سلمان نے سانس روک لیا اور اس کا رنگ سفید پڑ گیا ۔
"۔۔۔ اتوار کے روز فوجی کونوائے کے ساتھ مسوری سے لاہور روانہ ہو گئے ۔ ڈاکٹر
ہری رام ملہوترہ ۔ سردار خوشحال سنگھ اور لالہ گلاب چند ۔۔۔"
کچھ دیر کمرے میں مکمل سکوت طاری رہا ۔ سلمان اسی طرح ساکت و صامت بیٹھا رہا ۔ ثریا
نے فکرمندی سے اسے دیکھا ۔ اسے اپنے کمینے پن پر پشیمانی ہوئی ۔ وہ جلدی سے اسکے لئے
چاء بنا کر لے آئی ۔
"ماما کا خط چند روز ہوئے آیا تھا" سلمان نے چاء میں شکر گھولتے ہوئے آہستہ
سے کہا "جس دن ان کی مسوری کی کوٹھی جلائی گئی اسکے اگلے روز انہوں نے لکھا تھا ۔
وہ چھوٹی بیٹیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھیں ۔ اب تک سینکڑوں نوجوان لڑکیوں کا اغوا کیا
جا چکا ہے ۔"
"گھبراؤ مت ۔۔۔" ثریا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا ۔۔۔ "وہ لوگ خیریت سے پہنچ
جائیں گے ۔"
کمرے کی بجلی فیل ہو گئی ۔
"ہمیں ایک سگریٹ جلا دو ۔"
ثریا نے فرش پر ٹٹول کر سگریٹ اور ماچس تلاش کی اور اسکے ہاتھ میں دے دی ۔
سلمان نے سگریٹ جلایا ۔ ثریا مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ کچھ دیر بعد سلمان نے
آہستہ آہستہ کہا ۔۔۔ "بابا بہار کے ایک قحط زدہ گاؤں میں ، ایک خانقاہ کے سائے میں ،
نفر دفاقے سے ادھر صوفیوں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ۔ وہ پی سی ، ایس میں
نامزد ہوئے اور با اقتدار متوسط طبقے میں شامل ہو گئے ۔ مگر ذہنی لحاظ سے وہ ہمیشہ
فقیر رہے ۔۔۔ مجھے ماما اور چھوٹی بیٹیا کی فکر ہے ۔ انہیں بڑے شدید جذباتی صدموں کا
سامنا کرنا پڑے گا ۔۔۔"
"تمہاری مسوری والی کوٹھی جلا دی گئی ۔۔۔؟" ثریا نے پوچھا ۔

"ہاں ۔۔" اندھیرے میں سلمان کی آواز آئی ۔۔۔"جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا اسی عصبیت کے ہاتھوں اس سماج کے محل جلا دیئے گئے ۔ مگر ثریا محض اسی وجہ سے آج ان بنیادی تضادوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے ۔ ماضی کی محل سرائیں جل کر راکھ ہو گئیں ۔ مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے ۔۔۔ کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا ۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہو رہا ہے ۔۔۔" اسنے ماچس جلا کر گھڑی دیکھی اور دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا ۔۔ "ثریا ۔ مجھے سرحد پار بھیجا جا رہا ہے ۔۔۔ میرا ساتھ دو گی ۔۔۔؟"

وہ خاموش رہی ۔

"میرے ساتھ تمہیں زندگی بھر تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی ۔ اور خدا جانتا ہے تم زندگی میں تھوڑے سے آرام ۔ تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو ۔۔۔ مگر میرے ساتھ تم کو دل کا چین ملے گا ۔ اور ذہنی سکون ۔ اور میری اتھاہ محبت ۔۔۔"

"تم وہاں جا کر جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرو گے ۔ میں کہاں رہوں گی ؟"

"تم سپاہی آدمی ہو ثریا ۔ جنگ جاری ہے ۔ صرف محاذ بدل جائیں گے ۔"

وہ خاموش رہی ۔

"ثریا ۔۔"

وہ خاموش رہی ۔

وہ دیوار سے ٹک گیا ۔۔۔ "ثریا ۔۔" اسنے آخری بار کہا ۔

وہ پھر بھی چپ رہی ۔

کسی نے مقابل کے مکان میں لالٹین جلائی ۔ اس کی مدھم سی روشنی کھڑکی میں سے آ کر کمرے میں پڑنے لگی ۔ سلمان نے ثریا پر نظر ڈالی اور ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں ۔ گویا آخری بار اس کی تصویر اپنے دل میں محفوظ کر لینا چاہتا ہو ۔۔۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اسنے بڑی نارمل آواز میں کہا ۔۔۔ "اچھا بھئی ثریا ۔۔۔ اب ہم جاتے ہیں ۔ صبح سویرے سفر پر روانہ ہونا ہے ۔۔ ع زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے ۔ وغیرہ وغیرہ !!"

اس نے ذرا ہنس کر اضافہ کیا۔ "خدا حافظ" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "COME ON SHAKE HAND LIKE A MAN"

وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دفعتاً اس سے لپٹ گئی۔

"سلمان — سلمان — سلمان —" اس نے سلمان کے شانوں سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے کہا۔ "میں وقتی طور پر قنوطی اور بزدل ہو گئی تھی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ساتھی ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں گی — میں تمہیں کبھی دھوکا نہیں دے سکتی۔"

سلمان نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اس کے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"وعدہ — ؟"

"وعدہ —" ثریا نے آنسوؤں سے بھری آواز میں دہرایا۔

"لاؤ ہاتھ — !" سلمان نے کہا۔

"BUT NOT LIKE A MAN —" ثریا نے بیک وقت روتے اور ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اس کے دل میں مادرانہ شفقت کا سیلاب امنڈ آیا جو ہر لڑکی اپنے محبوب کے لئے محسوس کرتی ہے۔

"صلح —؟" سلمان نے دوبارہ پوچھا۔

"صلح — ! سلمان۔ کریک داس! کیا میرے وقتی ڈپریشن سے تم اتنا ڈر گئے — ؟ تمہیں معلوم ہے میں کتنی موڈی ہوں۔ — !"

"کیا کہنے ہیں آپ کے! پکاسو کی خالہ نہیں تو — !! اچھا — یہ بتاؤ کہ کب تک آسکو گی — ؟"

"جیسے ہی اسکول نے استعفےٰ منظور کیا۔ مجھے اپنی خیریت کی اطلاع پہونچتے ہی بھجوا دینا سلمان —"

وہ دروازے میں جاکر چند لمحوں تک نیم تاریک کمرے میں کھڑی اس تنہا باہمت لڑکی
کو دیکھتا رہا اور جلدی سے گلی میں اُتر گیا۔

گلی کے موڑ پر پہونچ کر وہ ٹھٹھکا۔ اور آخری مرتبہ اس چھوٹے سے مکان پر نظر ڈالی۔
جسے اتنے برسوں تک اسنے اپنی جدوجہد کا سمبل اور اپنی آرزوؤں کا مرکز بنا رکھا تھا۔
یہاں کتنی شامیں اسنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر جدلیاتی مادیت اور انقلاب پر بحثیں
کرتے گذاری تھیں۔ ثریا کو اپنی پسندیدہ کتابیں لاکر دی تھیں۔ ٹالسٹائی۔ گورکی۔ رومن رولاں۔
جواہر لال نہرو۔ کرسٹفر کاڈویل۔ ہاورڈ فاسٹ (جن میں سے بیشتر کتابیں ثریا نے ابتدائی
صفحوں سے آگے نہیں پڑھیں) اسنے ثریا کو اہم مضامین اور اسپین کی خانہ جنگی کے واقعات
پڑھ کر سنائے تھے۔ وہ پڑھتا جاتا اور وہ ایزل کے سامنے کھڑی تصویریں بناتی رہتی۔ بعض
مرتبہ وہ جھنجھلا کر کہتا۔

"ثریا ___ ثریا ___ تم تو بالکل اسپ جہالت پر سوار ہو۔ سنو لینن کا نظریہ آرٹ
کے متعلق کیا ہے ___"

"ثریا ___ احمق نہ بنو۔ بالزاک پڑھا کرو ___"

"ثریا ___ اب کی ٹرم یونیورسٹی جوائن کر لو ___"

"ساری دنیا میری یونیورسٹی ہے!" وہ آنکھیں گھما کر بڑے ڈرامائی طریقے سے گورکی
کا جملہ دہراتی۔ پھر وہ دونوں خوب ہنستے۔ ایک رات اسنے ثریا کو جیولیس فیوچک پڑھ کر
سنایا تھا۔ اور کتاب ختم کرنے کے بعد وہ رونے لگا تھا۔

مکمل ذہنی رفاقت، مکمل جذباتی ہم آہنگی ___ کس قدر خوبصورت اور مکمل ترین دوستی
ان دونوں کی تھی ___ ثریا حسین اور سلمان مرزا ___ ساتھیوں کے حلقے میں کتنے احترام سے
ان کا نام لیا جاتا تھا۔ اس نرم و نازک، ذہین، دلکش، بہادر کسان لڑکی میں سلمان کو
اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔ مستقبل کی عورت، آنے والے سماج کی ہیروئن۔ جو محبوبہ، بہن،
بیوی اور ماں، عورت کے ہر روپ میں مکمل ثابت ہوسکتی تھی۔ اسے کسی خاندانی جاہ و
جلال کے چھننے، کسی محلسرا کے جلنے کا غیر شعوری تاسف بھی نہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس

طبقے کی ایک فرد تھی جسے اپنی زنجیروں کے سوا اور کچھ نہیں کھونا۔

اسکے پاس ریشمی ساری ایک بھی نہ تھی نہ زیورات کے نام سے ناآشنا تھی۔ پاؤڈر لپ اسٹک سے اسے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ فیشن ایبل سوسائٹی کے ڈنر پارٹیوں کا تذکرہ اس کے لئے وحشت خیز تھا۔ وہ چھوٹی بٹیا کو خاصی قابلِ رحم ہستی سمجھتی اور ہمدردی کے ساتھ اکثر سوچا کرتی ـــ "یا اللہ ـــ یہ بے چاری اپنی ساری زندگی موٹر میں سوار ہو کر ایک پارٹی سے دوسری پارٹی میں جاتے اور سوئمنگ اور رولر اسکیٹنگ کرتے گذار دیگی۔"

سلمان اکثر اپنی بہن سے کہتا ـــ "بٹیا چلو آج تمہیں ثریا کے یہاں لے چلیں۔ ڈھنگ کی چار باتیں ذرا تمہارے کان میں پڑیں گی ـــ!"

"ہرگز نہیں ـــ" چھوٹی بٹیا جواب دیتیں: "ایک بات تو یہ کہ آج ہمارے کلب میں فینسی ڈریس ہے۔ دوسرے یہ کہ ثریا باجی اس قدر بلندی سے ہم سے بات کرتی ہیں کہ ہمیں رونا آجاتا ہے ـــ قسم سے!"

"ثریا کو تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ اور تم بھی کیا کرو۔ اپنے طبقے کی نمائندہ لڑکی ہو!" وہ ہنس کر کہتا۔

اسی سال ثریا کی تصویریں آل انڈیا نمائش میں دہلی بھیجی گئیں۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام اس کا "ون مین شو" الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اور ایل۔ ایم سین نے لکھنؤ سے آکر اس کا افتتاح کیا ـــ بڑے بڑے ادیب اور دانشور اس خستہ حال مکان میں اس سے ملنے آتے جس کا سارا فرنیچر چند مونڈھوں اور دو تین کرسیوں پر مشتمل تھا۔

سلمان کو اس ثریا پر کتنا فخر تھا۔ یہ اس کا جی ہی جانتا تھا۔ آج وہ اس ثریا کو ایک لمبی مدت کے لئے تنہا چھوڑ کر بہت دور جا رہا تھا۔

ثریا کے کمرے کی کھڑکی بند ہو گئی۔ اسنے دوسرا سگریٹ جلایا اور تیز تیز قدم رکھتا گھپ اندھیری رات میں گلی کے باہر نکل گیا۔

نئے ملک میں پہنچ کر سلمان سال بھر تک روپوش رہا۔ اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے

گھر والے کہاں ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ بیاس عبور کرتے وقت ہی مار ڈالے گئے ہوں۔ لیکن ایک رات اسے اطلاع ملی کہ اس کے والدین اور چھوٹی بہن لاڑکانہ میں مقیم ہیں۔ اپنے لئے حالات ساز گار ہوتے ہی وہ لاڑکانہ پہونچا۔ پُر شور۔ گرد آلود بازار میں سے گذرتا سندھی عاملوں کے ان سارے مکانوں پر نظر ڈالتا جن میں اب یو۔پی کے مہاجر آباد تھے۔ وہ بالآخر اس پتے پر پہونچ گیا جو اسے اطلاع میں بتلایا گیا تھا۔

یہ کسی ہندو بنیے کا مکان تھا۔ دروازے پر ہنومان جی۔ لکشمی اور گنیش جی کی مورتیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں پر رنگ برنگے نقش و نگار بنے تھے۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر جھانکا۔ اماں صحن میں انگیٹھی رکھے کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ بابا پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔

وہ دبے پاؤں اندر آ گیا۔

"بھیا ——" بابا نے دیوانِ حافظ ایک طرف رکھ کر تکئے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا "ہم تمہارے استقبال کے لئے اٹھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارے پاؤں مفلوج ہو گئے ہیں۔"

"بھیا ——" اماں نے اس کے آگے کھانا چنتے ہوئے کہا —— "اگر ممکن ہو تو کراچی میں مکان لے کر ہم لوگوں کو وہاں بلا لو۔ یہاں ان کے علاج کی بڑی دقت ہے۔ دنیا بھر کی بیماریوں نے انہیں آن گھیرا ہے ——"

"پروونشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے ہیں۔ قصر سلمان متروکہ جائداد قرار دے دیا گیا۔ الہ آباد بنک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس انہوں نے منجمد کر دیئے ہیں تا وقتیکہ دونوں ملکوں میں موو یبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ تمہاری اماں کی زمینیں زمینداری کے خاتمے کے ساتھ چلی گئیں وغیرہ وغیرہ ——" بابا نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ انہوں نے اضافہ کیا۔ " نہ عیش نہ دکھ درد نہ آرام رہے گا۔ آخر بس اللہ کا اک نام رہے گا۔"

چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں۔ انہوں نے سلمان کو ہکا بکا ہو کر دیکھا۔ وہ بہت دبلا اور اور کالا ہو گیا تھا۔ چھوٹی بٹیا کی رنگت بھی صحرا کی دھوپ میں کمہلا چکی تھی۔ دونوں بہن بھائی ایک

دوسرے سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

دوسرے روز چھوٹی بٹیا نے بھی سلمان سے کہا۔

"بھیا ___ اگر ہو سکے تو ہمیں کراچی لے چلو۔ ہماری پڑھائی کا دوسرا سال برباد جا رہا ہے ___"

"کوئی جگہ وہاں سنا ہے۔ الٰہی بخش کولونی کہلاتی ہے۔ وہاں کواٹروں کے کرائے سستے ہیں۔ وہیں انتظام کرو۔ ہم سے پیسے لیتے جاؤ۔" ماما نے کہا۔

"پیسے ہیں؟" سلمان نے دریافت کیا۔

"مسوری سے نکلتے وقت جو گہنے ساتھ تھے وہی اب تک فروخت ہو رہے ہیں۔ چھوٹی بٹیا گریجویٹ نہیں ہیں اس لئے ان کی تنخواہ بہت کم ہے۔ ماما نے جواب دیا۔

"بٹیا کو بی۔ اے بی ٹی کر لینا چاہئے۔" بابا نے کہا۔

"بھیا جاتے ہی مکان ڈھونڈنا۔" ماما نے کہا۔

"جی اچھا۔"

"چا۔ پی لو۔"

"جی اچھا۔"

"کراچی میں اپنے کھانے پینے کا خیال رکھو۔"

"جی اچھا۔"

وہ مدتوں سے اس طرح کی اوائی توائی اور خطرناک زندگی گذار رہا تھا۔ میم صاحب بظاہر اس کی عادی ہو چکی تھیں مگر دل میں بری طرح کڑھا کرتیں۔ ان کے چاند سے بیٹے نے برسوں سے کیسی بھکل گانٹھ رکھی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو جاتا۔ ان کے کیسے کیسے ارمان خاک میں مل گئے۔ وطن میں تھیں تو سارے ہم چشم دروذ کھپٹ پھٹ کرتے۔ خاندان کی بیبیاں الاہنا دیتیں ___ "انجمن آرا کا اکلوتا پوت ___ آوارہ نکل گیا۔ روز دوڑ آتی ہے۔ تین بار چھ چھ مہینے کی کاٹ چکا ہے۔ ایسے لڑکے کو کون اپنی بٹیا دے گا ___"

وہ خود ثریا سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ بے چاری بوڑھا بیگم خود تو اللہ کا جی تھیں۔ لڑکی بڑی

ہو کر ایسی بے فکر نکلی ـــــ بھیا کو تو ایسی لڑکی چاہئیے ' جو انٹلکچوئل ، شوشلسٹ ، آرٹسٹ ، وار لسٹ کچھ نہ ہو بلکہ ان کے آرام اور کھلانے پینے کا خیال رکھے " میم صاحب نے ایک دفعہ اظہار خیال کیا تھا ۔

" خیر ثریا باجی ایسی لمبی چوڑی انٹلکچوئل بھی نہیں ہیں ۔ ـــ " چھوٹی بٹیا نے ذرا جل کر جواب دیا تھا ۔

" بیچاری ثریا کے متعلق تم یہ خالص نندوں والی جلی کٹی باتیں نہ کرو گی تو اور کون کرے گا ـــ " سلمان نے قہقہہ لگا کر کہا تھا ۔

" ثریا باجی آ گئیں ـــ ؟ " چھوٹی بٹیا نے بیٹھے بیٹھے دفعتاً سوال کیا ۔

" معلوم نہیں ۔ " سلمان نے جواب دیا ۔ پھر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ـــ " ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ لیں تو اچھا ہے ۔ پرسوں صبح ایک اخبار کی ملازمت کا انٹرویو ہے ۔ اتنی مایوس نہ ہو بٹیا ۔ حالات اتنے خراب نہیں ہیں ۔ " اس نے بہن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ماں باپ سے رخصت ہوا ۔

باہر جھکڑ چل رہا تھا ۔ زرد رنگ کی جلتی جلتی ریت آنکھوں میں گھسی جاتی تھی ۔ تارکِ وطن ہندوؤں کے رنگ برنگے ٹائیلوں والے مکانوں کی چھتوں پر بادگیر کے جنگل کھڑے تھے ۔ اور گرم ہوا بادگیر کے سوراخوں میں منڈلا منڈلا کر سیٹیاں بجا رہی تھی ۔ گلیوں میں مہاجر چل پھر رہے تھے ۔ روزانہ کھوکھرا پار عبور کر کے راجستھان ۔ دلی اور یو ۔ پی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلوں میں چھاؤنی چھاتا ۔ کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر یہ لوگ ہندوستان سے نکلے تھے ۔ اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں ۔ سلمان نے اسٹیشن کے راستے پر چلنا شروع کیا ۔ سرخ رنگ کی عبائیں پہنے سندھی عورتیں خچروں پر بیٹھی سامنے سے گذر گئیں ۔ چار خانوں میں ثریا اور شمشاد بیگم کے ریکارڈ چیخ رہے تھے ۔ ایک غلیظ سے ریسٹوراں کے آگے جس پر " کیفِ ڈی پیرس " کا بورڈ لگا تھا ۔ رام پور کے چند مہاجر ٹین کی کرسیوں پر بیٹھے زور زور سے باتیں کرنے میں منہمک تھے ۔

" ابے چھنن خاں ۔ میں نے کہا ـــ اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرا لیا ۔ یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے

دی۔ میاں اگر تم نے اڑائی ہیں یا تو ہم نے معجون کھائی ہے۔ ہمیں بتا تباتے ہو —
جھمّن میاں سے نہ کہہ دیا ہو تو —"

"امیں جاؤ یار — میاں ریاضت حسین خاں بھی کسی سے ہیٹے نہیں ہیں۔ اپنی بات
کروانی —"

"کہاں ہیں رہو کہاں ہیں — میں نے کیا —"

وہ آگے بڑھتا گیا۔ بازار میں چو طرفہ غل مچا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں رنگا رنگ
لہجے۔ رنگ برنگے لباس۔ خوانچے والوں کی صدائیں۔ ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے
لئے از سرِ نو زندگی شروع کرنے کے لئے بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سلمان نے سامنے
کے منظر کو دیکھا اور سر اٹھا کر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

اسٹیشن پر بھی مہاجروں کی ریل پیل تھی۔ سلمان ان کو دیکھ کر سوچ گیا۔ یہ جانے کون
کون لوگ ہوں گے۔ کہاں کہاں سے آئے ہوں گے۔ پورب اور بہار کے باشندے جنکے
چہروں پر امٹ اداسی تھی۔ گول مخملی ٹوپیوں اور مخملی واسکٹوں والے، رام پور اور بریلی کے
بانکے۔ مراد آباد کے برتن فروش۔ علی گڈھ کے قفل گر۔ فیروز آباد کے چوڑی والے۔ فرخ آباد کے
رنگریز۔ لکھنؤ کے زردوز اور شاعر۔ دلی کے کرخندار۔ اعظم گڈھ اور بنارس کے جولاہے۔
مرزا پور کے قالین باف۔ ان کی برقعہ پوش عورتیں اور بچے۔

ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اس گھمسان کا نظارہ کرتا رہا۔ وقت
گذارنے کے لئے بک اسٹال سے کوئی رسالہ خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں
تھے۔ اسنے سندھی کی تیسری کتاب نکال لی۔

پیر الٰہی بخش کولونی کے اس دو کمروں کے مکان میں دونوں طرف کیچڑ اور گڑھے تھے۔
صحن کے پچھواڑے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ کمروں کی دیواریں بے حد میلی تھیں۔ اور
کواڑوں میں شیشے کی جگہ اخبار کے کاغذ اور گتے چپکا دیئے گئے تھے۔ آس پاس بھی زیادہ تر

مہاجر آباد تھے جو زیادہ تر سرکاری ملازم تھے۔ ان کی زندگیاں خاصی بے آرام گذر رہی تھیں مگر ایک عجیب و غریب ولولہ اور قومی جوش سارے میں طاری تھا۔

چھوٹی بٹیا بی۔ اے کر کے۔ لئے کالج میں داخل ہو گئیں۔ سلمان کو ان کی طرف سے بہت فکر تھی۔ اپنے "ڈی کلاس" ہونے پر کڑھتے کڑھتے انہوں نے اپنی صحت تباہ کر لی تھی۔

ایک روز کالج سے لوٹ کر انہوں نے کہا۔

"بابا ــــ بابا۔ ہمیں ایک کالا برقعہ بنوا دیجئے۔"

"کیا ــــ ؟" سلمان نے چونک کر پوچھا۔ جو پلنگ پر لیٹا پاؤں ہلا ہلا کر اخبار پڑھ رہا تھا۔

"بس میں سب لوگ ہمیں بری طرح گھورتے ہیں۔ ہمیں سخت شرم آتی ہے۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ سب کی نظریں تیر کی ایسی ہمیں چبھتی ہیں۔ برقعے میں کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ کون جا رہا ہے۔" اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔

سلمان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اور ایسی ایسی بسیں جن کو دیکھنے سے دل دہلتا ہے۔" چھوٹی بٹیا نے پلکیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ان بسوں میں تمہارے جیسے انسان ہی سوار ہوتے ہیں بٹیا۔ تم اوروں سے قطعی مختلف نہیں ہو۔" سلمان نے کہا۔

"بٹیا ــــ" بابا نے اپنی چارپائی پر سے کہا ــــ "یہ تمہارا خیال ہے۔ تمہیں "چھوٹی بٹیا" سمجھ کر کوئی نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو تمہاری اتنی پرواہ نہیں ہے۔ انہیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں۔"

"لیکن بابا، پرانے شناساؤں کے سامنے کتنی بے عزتی ہوتی ہے ہماری۔ رضیہ باجی وغیرہ ہمیں روز بس اسٹاپ پر کھڑا دیکھتی ہیں اور زن سے کاریں نکل جاتی ہیں ــــ

اور آج ــــ"

"آج ــــ؟" سلمان نے پوچھا۔

"آج ہم گھنٹہ بھر بس کا انتظار کرنے کے بعد پیدل صدر کی طرف آ رہے تھے تو وہ ٹیبل ٹینس چمپین نہیں ہیں عالیہ سعید ــــ انہوں نے کار روک لی اور کہنے لگیں دھوپ بہت تیز ہے ــــ آیئے میں آپ لفٹ دے دوں ــــ یہ شکر ہے کہ وہ ہمیں جانتی نہیں ــــ" اتنا کہہ کر وہ شُوں سُوں کرتی منہ دھونے کے لئے غسل خانے کی طرف چلی گئیں۔

کراچی پہونچ کر جمشید نے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد ایک دوست کے اشتراک سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا اور میکلوڈ روڈ پر ایک متروکہ دفتر حاصل کیا۔ وہ ہندو تاجروں کے انخلا کا زمانہ تھا۔ اس لئے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی رہی۔ جنوری سنہ ۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دو منزلہ کوٹھی عامل کولونی میں خالی ہوئی تو اسے اپنے نام الاٹ کروالی۔ اسنے بڑی محنت اور توجہ سے اپنا کاروبار پھیلایا اور ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی تجارتی دنیا میں اسکے قدم مضبوطی سے جم گئے۔

دوسرے سال وہ کان پور گیا اور اپنی ماں سے کہا۔

"اصغر اور انور کے امتحان ختم ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر چلی آیئے۔ ورنہ عالیہ اور آپ میرے ساتھ ہی چلی چلئے۔ یہ لوگ بعد میں آجائیں گے۔ میں نے ایک بہت اچھے سنے ٹوریم میں آپ کے داخلے کا انتظام کر دیا ہے ــــ"

"اور فرحت بٹیا کو دیکھے محمد گنج نہ جیہو ــــ؟"

میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں مصروف آدمی ہوں۔ آپ لوگ فوراً میرے ہمراہ چلئے ورنہ بعد میں آجایئے گا۔"

اگلے ہفتے وہ اپنی ماں اور بہن کو لے کر کراچی آگیا۔ عالیہ کان پور سے بی اے کر چکی تھی یہاں آکر اسنے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ وہ کان پور کالج میں بھی ٹیبل ٹینس کے کئی مقابلے جیت

جکی تھی۔ یہاں وہ بہت جلد یونیورسٹی چیمپین بن گئی۔

جمشید نے نوعمری میں آئی۔سی۔ایس کہلانے کے جو خواب دیکھے تھے وہ ان کو اب تک نہ بھولا تھا۔ وہ لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر جانتا تھا کہ بڑے افسر کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اسنے طے کر لیا کہ چھوٹے بھائیوں کو سی۔ایس۔پی کے امتحانات دلوائے گا۔ بزنس مین کا ایک بھائی اعلیٰ عہدیدار بھی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

اپنی بیٹی فرحت النساء کو اسنے آج تک نہ دیکھا تھا۔ کچھ دنوں سے اسکے خیال نے جمشید کو بُری طرح ستانا شروع کر دیا۔ اس کی بچی جو بہت دور، کسی دوسری دنیا میں، ایک پسماندہ گاؤں کے ایک غربت زدہ کچے گھر میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اسنے ڈرتے ڈرتے چچا ابا کو خط لکھا۔ ویزا بنوایا اور ہندوستان روانہ ہو گیا۔

گیارہ برس کے طویل عرصے کے بعد جمشید محمد گنج پہونچا۔ (وہ ۱۹۴۱ء میں منظور النساء کو بیاہنے جانے کے لئے آخری بار یہاں آیا تھا)۔ اسٹیشن پر اتر کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسنے دیکھا کہ گوبند وا یکہ لئے اسی طرح اس کا منتظر ہے گویا وہ دسہرے کی چھٹیوں میں اسکول سے گھر آیا ہو۔

"بھیا آئے گئیں ۔۔۔؟" گوبند والنے آگے بڑھ کر کہا۔

"گوبند ۔۔۔ چاچا ۔۔۔ ؟" اس نے ذرا جھجکتے ہوئے چاچا کے لفظ کا اضافہ کیا۔ "تم کیسے آئے ۔۔۔؟"

"چھوٹے ساہ جی بتائے رہن کی آج کی گاڑی سے آوت ہو ۔۔۔"

جمشید نے یکے پر چڑھتے ہوئے دقت محسوس کی اور ذرا جھینپ کر اپنی قیمتی پتلون کی کریز پر نظر ڈالی۔

سید منظر علی کے مکان پر تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ شمبھو دادا۔ شیخ رمضان۔ مولوی محمد حسین۔ توقیر میاں۔ پنڈت لچھمی نرائن۔ گوبردھن چاچا۔ رحمت بھیا۔ گوسائیں کاکا اور جانے کون کون۔ بچے جوان ہو گئے تھے۔ جوان ادھیڑ ہو چلے تھے۔ اور بوڑھے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے ۔۔۔ گوبر چاچا نے اسے گلے لگایا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر کے رونے۔

جھینگا پاسی کی خوشی کے مارے باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور وہ احمقوں کی طرح منہ کھولے بھیا کو تک رہا تھا۔ ساری بستی میں اودھم مچی ہوئی تھی۔۔۔ "جمشید بھیا پاکستان سے آئے ہیں ۔۔۔ بڑے رئیس ہو گئے ہیں ۔۔۔ یہ بڑی سونے کی گھڑی لگائے ہیں۔ بالکل جنٹ صاحب معلوم پڑے ہیں ۔۔۔"

جمشید کی نظروں نے بہت سے مانوس چہروں کو تلاش کیا جواب موجود نہ تھے۔ چپا آتی بعد انڈمر چکا تھا۔ سلاّمو ہبو ٹرن مر چکی تھی جو نکڑ پر سگریٹ پان بیچا کرتی تھی۔ نواب متن اب بھی ڈاکے ڈالتے تھے اور ان دنوں جیل گئے ہوئے تھے۔

منظور النساء کو جب سے معلوم ہوا تھا کہ جمشید آنے والے ہیں وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھرتی رہی تھی۔ اسنے دالان اور کوٹھریوں کی تندہی سے صفائی کی تھی۔ گھر کے سارے برتن مانجھ مانجھ کر چمکا دیئے تھے۔ جھینگا پاسی کی عورت کے ساتھ مل کر دالان اور اوسارا لیپا تھا۔ پلاؤ اور فیرنی کے لئے چاول صاف کئے تھے۔ آدھی رات سے اٹھ کر صبح کا ناشتہ تیار کیا تھا۔ اسکے ماں باپ اس کی یہ سرگرمی اور مصروفیت دیکھتے اور الم سے نظریں جھکا لیتے۔ فرحت النساء کے لئے اسنے تین دن اندھیرا پڑے تک صحن میں بیٹھ کر ہاتھ سے نیا جوڑا سیا تھا۔

ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو منظور النساء نے لڑکی کو نہلا دھلا کر گوٹے لچکے کا نیا جوڑا پہنایا۔ اسکے بالوں میں تیل لگا کر مینڈھیاں گوندھیں۔ ناشتے کا سامان تخت پر چنا اور خود اسی طرح بکھرے بالوں کو میلے ڈوپٹے میں سمیٹتی چہرے کا پسینہ خشک کرتی کوٹھے پر چلی گئی۔ وہاں وہ چھت کی منڈیر سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور پرنالے کے موکھے میں سے اسٹیشن کی طرف سے آنے والی سڑک کو تکتی رہی۔ جب جمشید یکے سے اترا تو منظور النساء نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا اور لرزتی رہی۔ جمشید نے سید مظہر علی کو جھک کر سلام کیا ۔۔۔ گاؤں والوں کے گلے لگا۔ اور اندر آکر اپنی بیٹی کو لپٹا لیا۔

شاہ منور علی خانقاہ کے حجرے میں سے نکل آئے۔ اسکے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔ اور پھر خانقاہ واپس چلے گئے۔ سید اختر علی کو بلانے کے لئے بہت سے

آدمی دوڑے۔ مگر گومتی کے کنارے ان کی جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ وہ غائب ہو چکے تھے۔
جمشید ہفتہ بھر وہاں رہا۔ اور سارے وقت اسنے سید مظہر علی اور ان کے احباب کو کراچی کی ایسی ایسی محیر العقول داستانیں سنائیں کہ ان لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بڑی مشکل اور محنت سے اسنے ان بوڑھوں کو ایکسپورٹ، امپورٹ، بلیک مارکیٹ، پگڑی، لائسنس، پرمٹ، اور الاٹ منٹ کے معنی سمجھائے۔
"سمجھ گئے۔ پگڑی تو یوں جانو جیسس ہم پہنچ کے یہاں صاحب لوگ کی ڈالی ہوت رہی ___" شمبھو دادا نے سر ہلا کر کہا۔ "مجز یعنیٹ نہ کہو پگڑی کہہ لو۔"
"ای سب تو ہم ہو جانت ہیں ___" پنڈت لچھمی نارائن مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ اس پوری محفل میں محض وہی واقف اسرار تھے۔ کیونکہ ان کا انگریزی دان بھانجا کئی برس سے دہلی میں ٹھیکے لے رہا تھا۔ اور اب اسنے بمبئی میں بھی بزنس اور ایکسپورٹ امپورٹ شروع کر دی تھی۔ اور ایک مرتبہ اسنے محمد گنج آ کر اپنے ماما کو دہلی اور بمبئی کے بے انتہا محیر العقول داستانیں سنائی تھیں۔
"ہمرے گاؤں سے خالی دوئی ٹھو منئی بہوتے قابل نکسے ہن۔" توقیر میاں نے فخر یہ کہا۔
"ایک تمہرا بھیگو اور ایک ای جمشید دا۔"
"اسلامی دارالخلافہ ہے۔ کراچی میں مساجد تو ایک سے ایک شاندار بن گئی ہوں گی۔" مولوی محمد حسن نے کہا۔
"جی ___" جمشید نے مختصراً جواب دیا۔
"انگریزوں کو بڑی دقت پڑتی ہو گی تمہارے کے یہاں۔" مولوی صاحب نے مزید اظہار خیال کیا۔
"کیوں ___؟" جمشید نے پوچھا۔
"ارے ام الخبائث جو ممنوع ہو گی۔ ماشاء اللہ سے اسلامی ملک ہے۔"
جمشید نے دل میں سوچا کہ اگر ان بے چاروں کو معلوم ہو جائے کہ ان کا عزیز بھتیجا کراچی جم خانہ میں روز شام کو گھڑوں وسکی لنڈھاتا ہے ___ "جی نہیں ___ابھی تو ممنوع

نہیں ہوئی ۔۔۔ جمشید نے ذرا بے تعلقی سے جواب دیا۔
"ہمارے کے ہاں تو لگ گئی ہے پابندی ۔۔۔" مولوی صاحب نے کہا۔
"پابندی سے کیا ہوت ہے ۔" پنڈت لچھمی نارائن نے جو واقف اسرار تھے کہا۔
بھیّو بتاوت رہا کی لوگ اب لُک چھپ کے اور جیاستی پیت ہیں دارو۔"
پابندی کیا شئے ہے۔ جمشید نے فلسفیانہ انداز میں سوچا ۔ اخلاقی سیاسی،
مذہبی پابندیاں ۔۔۔ گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے ۔
بنے گا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا ۔ اسنے دل میں دہرایا۔ مگر اب اس کا
دماغ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ وہ پھر محمد گنج کی درگاہ کے نیم تلے واپس لوٹا۔
"بھیا تنک ای تو بتاؤ ہمارے کے ہاں قومی پہناوا کیا ہے ۔" توقیر میاں نے سوال
کیا ۔ "ہمارے کے یہاں تو افسرن کو حکم مل گیا ہے کی ولایت جائیں تو قومی پہناوا پہنیں ۔"
وہ مدینہ (بجنور) اور قومی آواز (لکھنؤ) باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔
"پاکستان میں تو مستورات پردے میں رہتی ہوں گی۔ اسلامی ملک ہے ۔" مولوی صاحب
نے کہا۔ "ہمارے کے ہاں تو آزادی کی ہوا بہت چل گئی ہے ۔"
شیخ رمضان اور توقیر میاں اور دوسرے مسلمان بوڑھے پاکستان کی باتوں کو بے حد
عقیدت سے سُن رہے تھے۔
"فرحت النساء کیا پڑھ رہی ہے ۔" جمشید نے موضوع گفتگو تبدیل کرنے کے لئے اپنے
چچا سے استفسار کیا۔
"ہم خود پڑھاتے ہیں۔ اردو اور قرآن شریف۔ شمبھو بھیا انگریزی بھی پڑھا دیتے ہیں۔
اے۔ بی۔ سی۔ ڈی ۔۔۔ گوسائیں بھیا اسے ہندی پڑھا رہے ہیں۔" سید مظہر علی نے فخر
سے بتایا۔ جمشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو اپنی ذاتی "ذمے داری"
سمجھتے تھے۔ وہ یہ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ
فرحت النساء کو تعلیم کے لئے سوئیزرلینڈ بھیج دے۔ مگر اب چچا ابا اور شمبھو دادا اور گوسائیں
کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اسے بے حد شرم آئی۔ جیسے وہ ان افلاس زدہ لوگوں کا مذاق اڑانے

دالا ہو۔ اپنی پستی اور ان معصوم لوگوں کی بلندی کا اُسے شدت سے احساس ہوا۔ وہ سر جھکا کر چبوترے پر نیم کے تنکے سے لکیریں کھینچنے لگا۔

منظور النسار کو اُس سے پردہ تھا مگر جب تک وہ یہاں رہا۔ وہ کواڑوں کی درزوں میں سے چھپ چھپ کر متواتر اسے دیکھا کی۔ لیک بار اسکی ماں نے اسے اس طرح جھانکتے دیکھ پایا تو وہ اسپر برس پڑیں ۔" اری جنم جلی ۔ بھیا اب تیرے لئے نامحرم آئیں۔ تیرا سامنا ہوگا تو گناہ ہو ییہے ۔ پاپ ہو ییہے ۔"

"نامحرم آئیں۔ ہمرے چچا کے پوت تو ہوں ۔" منظور النسار نے غم و غصے سے کھولتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔

"بے حیا ۔ بے شرم ۔ بے غیرت ۔" سید منظہر علی کی بی بی بکتی جھکتی مہمان کے لئے پلاؤ دم کرنے باورچی خانے میں چلی گئیں۔ منظور النسار وہیں کواڑ سے لگ کر زمین پر بیٹھ گئی اور بلک بلک کر آہستہ آہستہ روتی رہی۔

جمشید فرحت النسار کو محمد گنج سے اپنے ساتھ کراچی لے آیا۔ وہاں پہونچتے ہی اُس کے لئے ایک اینگلو انڈین گورنس مقرر کی اور اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ عالیہ نے بھتیجی کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب وہ گھر پہ اور اسکول میں نیری کہلاتی تھی۔ اور چند سال کے اندر اندر بڑی اسمارٹ اور تیز و طرار TEEN - AGER بن چکی تھی۔ جو تنگ موریوں کی شلوار، بغیر آستین کی نہایت چست قمیص پہنتی تھی اور دوپٹے کے بجائے ایک قسم کا پٹہ سا کندھے پر لٹکائے رہتی تھی۔ اور راک این رول کی ماہر تھی۔ اپنے نانا کے آنگن کو اسنے کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کیا۔

عالیہ گاہے بہ گاہے سید منظہر علی کو یہاں کی خیر خبر سے مطلع کرتی رہتی۔

—— آج بھیا نے نئی کار خریدلی۔ ماشاءاللہ سے چالیس ہزار کی آئی ہے۔

—— کل بھیا کاروبار کے سلسلے میں یورپ روانہ ہو گئے ۔ یہ بھیا کا یورپ کا چوتھا سفر ہے۔

—— میں اگلے مہینے نیویارک جارہی ہوں۔ (یہ امریکہ میں ایک بہت بڑا شہر ہے۔)

——فیری بٹیا اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ مری گئی ہیں۔ (مری مغربی پاکستان میں ایک پہاڑی مقام ہے)

* ——میں یہ سطریں پرسکون اور بے حد بے کر سہلٹ کے رسٹ ہاؤس میں بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ سامنے ڈھلوان پر شور مچاتی ندی بہہ رہی ہے۔ عقب میں درختوں سے گھری ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ پہلو میں ندی کے سرخ رنگ کے عظیم الشان اور بلند و بالا آہنی پل پر سے راہگیروں، سائیکل رکشاؤں اور اکا دکا موٹروں کا لامتناہی جلوس گزر رہا ہے۔ میں کھڑکی کے پاس پلنگ پہ بیٹھ کر تم کو دن بھر یہ "خط" لکھتی رہوں گی۔ اور پھر اسے اپنے ٹرنک کی تہہ میں چھپا دوں گی۔ پچھلے برسوں میں میں نے اس طرح کتنے ان گنت مفصل "خط" لکھ لکھ کر بکس میں مقفل کر دیئے ہیں یا تلف کر دیئے ہیں۔ ان مختصر اکا دکا سطروں میں جو ہم دونوں فرضی ناموں سے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں ان کے رمز و کنائے، مبہم الفاظ، تلمیحات اور محتاط استعاروں میں تم سے باتیں کرنے کی کوشش کے بعد جب میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ تو میں بیٹھ کر بے حد لمبے چوڑے کھرے تمہیں لکھتی ہوں۔ جب بھی تم سے "بلا کم و کاست" اور مفصل باتیں اور گپ شپ کرنے کو بے طرح جی چاہتا ہے تو میں کاغذ قلم لے کے بیٹھ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں کاش یہ پلندے تم تک پہونچ سکتے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب میں یہ سارے طولانی دفتر تمہیں پڑھنے کو دوں گی تاکہ "RETROSPECT" میں تم سے ہمکلام ہو سکوں۔

ابھی سرکٹ ہاؤس کا چھدری داڑھی اور لمبے لمبے دانتوں والا شفیق بوڑھا بیرہ میرے لئے چائے کر آیا ہے۔ وہ مجھے اپنے گاؤں کے۔ اور سہلٹ کے اولیا کے بڑے دلآویز قصے سنایا کرتا ہے۔

رات کو سہلٹ کے بازار میں دور دور تک شمعیں جلتی ہیں۔ بڑا عجیب، غیر حقیقی پرستان کا ایسا نظارہ ہوتا ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے پہلو میں غدر کے وقت کے کسی انگریز فوجی افسر

کی قبر ہے۔ اسکے چاروں طرف سبز گھاس پر ایک گائے دن بھر چرا کرتی ہے۔ یہاں پر کس قدر امٹ سکون ہے۔ کل میں نے چائے کے باغوں میں گھوم کر دن بھر اسکیچ بنائے۔

آج مجھے مشرقی پاکستان آئے پورے چھ سال ہوگئے۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ۴۹ء کے آخر میں مجھے تمہارے متعلق اطلاع ملی تھی کہ تم مشرقی پاکستان میں ہو۔ اس مبہم سی خبر کے بھروسے پر میں نے اسکول سے استعفیٰ دیا اور ڈھاکے آگئی۔ یہاں پہونچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اطلاع غلط تھی۔ یہاں میں نے وہی جد و جہد اور محنت کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے تم کو مجھ پر اتنا فخر تھا اور جس سے اب میں بُری طرح تھک چکی ہوں۔ میرے کانوں میں تمہاری آواز گونجتی ہے ـــــ "خدا جانتا ہے ثریا، تم زندگی میں تھوڑے سے آرام، تھوڑی سی آسائش کی مستحق ہو ـــــ" کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب پدما کے گہرے پانیوں میں میری کشتی پہونچتی ہے تو بے اختیار میرا جی چاہا ہے کہ ندی میں کود کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں ـــــ لیکن پھر تمہاری آواز میرے دل کے کانوں میں آتی ہے "ـــــ تم بھی ہمیں مایوس کر رہی ہو لڑکی؟ ہمیں مایوس نہ کرنا ـــــ بہادر لڑکی۔ سپاہی لڑکی ـــــ!"

بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ سب بکواس ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم جھک مار رہے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے۔ میں بھی جھک مار رہی ہوں۔ مگر پھر مستقبل کا بھروسہ آڑے آتا ہے۔ خود کو یقین دلاتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز مجھے ضرور ہی زندگی میں خوشی ملے گی۔ "امید" بھی کیا چیز ہے ـــــ! اگر نہ ہو یہ فریب پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا۔

آج کل اسکول میں چھٹیاں ہیں، جہاں میں آرٹ ٹیچر ہوں۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ہمراہ سلہٹ آئی ہوئی ہوں۔ اس کا شوہر یہاں دورے پر آیا ہے۔ وہ دونوں کل سے مولوی بازار گئے ہوئے ہیں۔ اور میں آج دن بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔

مشرقی بنگال کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں کے لوگ کتنے پیارے ہیں۔ کبھی ایسا ہوگا کہ تم میرے ساتھ ہوگے اور میں تمہاری موجودگی میں ان جنگلوں اور ان ندیوں کی تصویریں بناؤں گی؟

تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یار لوگوں نے اڑا دیا ہے کہ میرے فن کا "بنگالی پیریڈ"

شروع ہو گیا ہے۔ بلکہ بس! میں تو اپنی زندگی کا ایک اہم ترین، خوبصورت ترین، پیریڈ شروع کرنا چاہتی ہوں اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ اس پیریڈ کا نام کیا ہو گا! ڈھاکے میں میری دو نمائشیں ہو چکی ہیں۔ تمہارے بغیر یہ سارا گورکھ دھندا مجھے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔

آج میری اکتیسویں (۳۱) سالگرہ ہے۔ یعنی آج سے اکتیس برس قبل میں اس آنسوؤں کی وادی میں روتی چلاتی داخل ہوئی تھی۔ جس ماحول میں میں نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں چاندی کے شمعدانوں کے بجائے شکستہ لالٹینیں تھیں۔ "ہیپی برتھ ڈے" کے سُروں کے بجائے گلے سڑے بیلوں کی گھنٹیاں تھیں اور چاکلیٹ کیک کے بجائے اوپلے تھے۔ میری اس دنیا میں سالگرہ کے جشن نہیں منائے جاتے تھے۔ تم جس طلسماتی دنیا میں پیدا ہوئے وہاں تمہاری "برتھ ڈے" پر قصرِ سلطانی میں دھوم کی مینی ڈریس پارٹی منعقد کی جاتی تھی۔ بہرحال۔ آج میں اس وقت پہلی بار اپنی سالگرہ منا رہی ہوں۔ اور سالگرہ منانے کا طریقہ میں نے یہ سوچا ہے کہ میں تم کو اکتیس (۳۱) صفحے کا خط لکھوں گی۔ اور اس کے بعد اڑتیس (۳۸) صفحات کا اس میں مزید اضافہ کروں گی۔ جو تمہاری عمر کے اعداد ہیں۔ اس حساب سے ہم دونوں کی مجموعی عمر انہتر (۶۹) برس کی ہے۔ یعنی تم اور میں ہم دونوں انہتر (۶۹) برس کے بوڑھے ہیں۔ ابھی میں نے آنکھیں بند کر کے تصور کیا ہے کہ ہم دونوں نے یہ انہتر برس اکٹھے گذارے ہیں۔ جوانی کے خواب اور ولولے اور جنوں خیزیاں ——— پختہ سالی کا جذباتی توازن۔ بڑھاپے کا آرام اور سکون اور رفاقت اور دردمندی ———

CALM OF MIND ALL PASSION SPENT!

پچھلے ہفتے یہاں آ کر جب میں "قمر جہاں بیگم" کو ایک مختصر سا خط پوسٹ کرنے گئی تو مجھے ڈاک خانے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ اور میں سڑک پر چلتی ہوئی ایک سرکاری بنگلے میں داخل ہو گئی۔ جسے دُور سے میں ڈاک خانہ سمجھی تھی۔ میں سیدھے کمرے میں چلی گئی اور وہاں ایک شکستہ سا سیاہ گاؤن پہنے ایک بنگالی وکیل مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا جرح کر رہا تھا! میں ضلع کی عدالت میں گھس گئی تھی! اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میرا اور تمہارا ——— ہم دونوں کا ——— عدالتوں سے کتنا تعلق رہا ہے!

تمہارا آخری خط مجھے چھ مہینے ہوئے ملا تھا۔ جس میں تم نے صرف اتنا لکھا تھا ——— "پرسوں

رات بابا کا انتقال ہو گیا۔ اگر تم اس وقت ہمارے پاس ہوتیں تو ہم اپنی آنکھیں تمہارے ہاتھوں میں چھپا لیتے اور خوب روتے ـــــ بابا نے کبھی اس کا شکوہ نہ کیا کہ اگر ان کا بیٹا کہیں افسری کر رہا ہوتا تو ان کو یہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے ـــــ
اس کے بعد سے تم بالکل خاموش ہو۔ گذشتہ مدتوں میں تم مجھے برابر لکھتے رہے ہو۔ میں سوچ سوچ کر باؤلی ہوئی جا رہی ہوں۔
اب سرمائی ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی ہے۔ اور بازار میں موم بتیاں جھلملانے لگی ہیں۔ اور ـــــ"

جمشید اپنے ڈرائنگ روم میں چند مہمانوں کے لئے کاک ٹیل تیار کر رہا تھا جب نوکر نے آکر اطلاع دی ـــــ
"صاحب ـــ کوئی بڑے میاں آئے ہیں کہتے ہیں کہ آپ کے والد ہیں ـــــ"
"میرے والد ـــ؟" جمشید جلدی سے باہر گیا۔
نارنجی کفنی میں ملبوس سید اختر علی موٹر رکشا میں بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا ٹین کا بکس، دری میں لپٹا ہوا بستر اور لوٹا ان کے قدموں میں رکھا تھا۔ انہوں نے آنکھیں اٹھا کر جمشید کو دیکھا اور مسکرائے۔
"ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے آئیں۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"میں یہ اہم اطلاع تمہیں بھجوا رہی ہوں کہ میں عنقریب کراچی پہنچنے والی ہوں۔ یہ چند سطریں میں تم کو نرائن گنج جاتے ہوئے لانچ میں لکھ رہی ہوں۔ میں نے اتنا روپیہ جمع کر لیا ہے کہ کراچی پہنچ سکوں اور جب تک وہاں کام نہ ملے میں ـــــ"

ایک روز چھوٹی بٹیا اسکول پڑھا کر لوٹیں تو انہوں نے چار پیتے ہوئے حسبِ معمول

صبح کے اخبار میں "ضرورت ہے" کا کالم پڑھنا شروع کیا ۔۔۔ ایک بڑی فرم میں اسسٹنٹ کی جگہ خالی تھی۔

دوسری صبح اسکول سے چھٹی لے کر وہ اس پتے پر ویسٹ وہارف کی ایک نئی عمارت میں پہنچیں۔ تیسری فلور کی گیلری میں ایک اینگلو انڈین لڑکی نے ان سے پوچھا۔

"یس پلیز ۔۔۔ ؟"

چھوٹی بٹیا نے بہت گھبرائے ہوئے بیگ سے اخبار کا تراشہ نکالا۔

"امید واروں کا انٹرویو کون کرتا ہے ۔۔۔ ؟"

"۔۔۔ منیجنگ ڈائرکٹر خود۔ آپ کا ان سے اپوائنٹمنٹ ہے ؟"

"نہیں ۔۔۔"

"اپنی درخواست مجھے دے دیجئے ۔۔۔"

"درخواست تو میں نے لکھی نہیں ۔۔۔"

لڑکی کو چھوٹی بٹیا کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر ترس آ گیا ۔۔۔

"آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں بوس سے کہتی ہوں۔"

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور چھوٹی بٹیا اسکے ساتھ ساتھ ایک اور خنک اور نیم تاریک جھل مل کرتی گیلری میں سے گذرتی ایک وسیع ایرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوئیں جس میں بہت بڑا اسبز رنگ کا قالین بچھا تھا۔ اور ہلکی سبزی مائل سفید جھلملیوں والے طویل دریچے کے نیچے اور ایک طویل و عریض میز کے اس پار منیجنگ ڈائرکٹر گھومنے والی کرسی پر بیٹھا کاغذات پر دستخط کرنے میں مصروف تھا۔ وہ سانولی رنگت کا خاصا خوش شکل آدمی تھا۔ اسکی عمر چالیس بیالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ آنکھوں میں سنجیدگی اور ایک نوع کی سوچ تھی۔ دستخط کرنے کے بعد اسنے ڈکٹا فون میں کچھ کہا۔ اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ اینگلو انڈین لڑکی چھوٹی بٹیا کو اندر پہونچا کر جا چکی تھی۔ وہ میز کے قریب جا کر کھڑی ہوگئیں۔ مگر منیجنگ ڈائرکٹر اسی طرح کاغذات میں منہمک رہا۔ (یہ اس کی خاص تکنیک تھی تاکہ نو وارد پر ظاہر ہو سکے کہ اس کا ایک ایک منٹ کتنا قیمتی ہے ۔۔۔)

"فائل بند کرنے کے بعد اسنے سر اٹھایا۔

"سلام علیکم" چھوٹی بٹیا نے کہا۔

"سلام علیکم۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ کے یہاں ایک جگہ خالی ہے"

"جی ہاں —— جی ہاں۔ تشریف رکھئے" اسنے امیدوار کا ماہرانہ نظروں سے جائزہ لیا۔ لڑکی پہ شدت کی سیکس اپیل تھی۔ چھوٹا سا قد، بہت سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی شربتی آنکھیں، سنہری مائل بال۔ بالکل جاپانی گڑیا ایسی۔ بالوں کی اسنے خوب موٹی سی ایک چوٹی گوندھ رکھی تھی جو تراشیدہ بالوں کے مروجہ فیشن کے مقابلے میں بہت انوکھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اسنے دل میں فوری فیصلہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"سلمیٰ مرزا"

اسنے کاغذ پہ نام لکھ لیا۔

"کوالی فی کیشنز؟"

"بی، اے۔ بی ٹی"

"پہلے کبھی کام کیا ہے؟"

"جی نہیں —— جی ہاں —— جی ہمارا مطلب ہے ہم نے کسی دفتر میں کام نہیں کیا۔ ہم اسکول ٹیچر ہیں"

منیجنگ ڈائرکٹر لڑکی کے اس "ہم" کہنے کے انداز پہ زیر لب مسکرایا۔ پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اسنے کہا۔

"بہت خوب۔ دیکھئے ہمارے یہاں صرف یہ کام ہے کہ یہاں دفتر میں آپ کو ہمارے غیر ملکی کلائنٹس کو ریسیو کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں جب کبھی ہم غیر ملکی تاجروں، اعلیٰ افسروں وغیرہ کو میٹروپول یا جم خانہ وغیرہ میں مدعو کریں تو ان کو انٹرٹین کرنے کے سلسلے میں بھی آپ میرا ہاتھ بٹائیں گی ——"

"مگر ——" چھوٹی بنٹیا نے کہنا چاہا۔

مینیجنگ ڈائرکٹر نے ان کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی —— "آپ یقیناً آج کل کے مغربی طور طریقوں سے واقف ہوں گی۔ اور ڈانس بھی کر سکتی ہوں گی۔ معاف کیجئے گا یہ سوال میں کس لئے کر رہا ہوں کہ میں نے پچھلے دنوں ایک پاکستانی لڑکی کا اسی کام پر تقرر کیا مگر وہ پارٹیوں میں بات کرتے گھبراتی تھی اور ٹیبل میرز TABLE MANNERS سے اچھی طرح واقف نہ تھی۔ تو میرا مطلب ہے کہ آج کل اعلےٰ پیمانے کے کاروبار میں پبلک ریلیشنز کی اہمیت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ میں کسی یوروپین لڑکی کو بآسانی اس جگہ پر رکھ سکتا ہوں مگر آپ جانتی ہیں آج کل یوروپین اور امریکن حضرات مشرقی خواتین سے کس قدر متاثر ہیں۔

"جی —— لیکن —— ہم ——"

مینیجنگ ڈائرکٹر فوراً بھانپ گیا کہ امیدوار یہ عہدہ قبول کرتے ہوئے جھجک رہی ہے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی غیر معمولی دلکشی اور سیکس اپیل کی مالک لڑکی اسے آسانی سے دستیاب نہ ہو گی۔ اور اسے اپنا "آئیڈیا" "سیل" کرنا بھی خوب آتا تھا۔ اسنے لڑکی کو سمجھانا شروع کیا —— چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے وہ پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹا۔

—— "مثال کے طور پر —— یہ دیکھئے کہ مغربی ممالک کی مشہور ایر لائنز اپنی ایر ہوسٹس لڑکیوں کو ساریاں اور کیمونو پہنا رہی ہیں۔ محض اس لئے کہ مسافروں کو ——"

"جی —— مگر ——"

"نیویارک کی اقوام متحدہ میں خود دیکھ کر آیا ہوں جو گائڈ لڑکیاں مشرقی ممالک کی ہیں۔ ان کے پیچھے سیاحوں کا جم غفیر چلتا ہے۔ یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں ہے۔ تو پھر طے ہے —— مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بڑی مکمل سکریٹری ثابت ہوں گی۔ پہلی مارچ سے میں آپ کا تقرر کئے لیتا ہوں۔ آپ کی تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ہو گی ——" اس نے کن انکھیوں سے امیدوار لڑکی کا ردِ عمل دیکھا اور گھنٹی بجائی۔ دبیز پردوں میں سے ایک سیاہ فام گوانیز کلرک جن کی طرح نمودار ہوا۔

"مسٹر ہیرڈک — آپ مس مرزا ہیں۔ ان کو میں اپنا سوشل سکریٹری مقرر کر رہا ہوں ان کا ذاتی فائل تیار کیجئے —"

"یس سر —"

پندرہ منٹ کے اندر اندر ساڑھے سات سو روپے ماہوار پہ اس کا تقرر ہو گیا۔ یہ بات چھوٹی بٹیا کو بہت عجیب لگی۔

"لیکن ہم سمجھتے تھے کہ یہ اشتہار آفس ریسپشنسٹ کے لئے تھا۔" انہوں نے ایک بار پھر احتجاج کیا۔

"جی ہاں۔ مگر آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔" منیجنگ ڈائرکٹر نے کرسی کا رخ گھمایا۔ اور لڑکی کی بڑھتی ہوئی گھبراہٹ دیکھ کر دل میں سوچا۔ بہت بھولی اور ذرا بے وقوف بھی ہے۔ اور بے حد ضرورت مند۔ اور ناتجربہ کار تو یقیناً ہے —

"دوسری بات یہ —" اسنے باآواز بلند کہا — "کہ آپ رہتی کہاں ہیں؟"

چھوٹی بٹیا نے اپنا پتہ بتلایا۔

"اوہ —" منیجنگ ڈائرکٹر کے منہ سے نکلا۔

"چھوٹی بٹیا ساری کا پلو سنبھال کر اٹھیں۔

"آپ کو یہ ملازمت منظور نہیں؟"

چھوٹی بٹیا نے لحظے بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

بابا کے انتقال اور بھیا کے چلے جانے کے بعد وہ اسی طرح لشٹم پشٹم ایک پرائیویٹ سکول میں پونے دو سو روپے ماہوار پر پڑھاتی رہی تھیں۔ وہ ہر اتوار کو بھیا کے لئے اچھے اچھے پھل، اور ان کے پسندیدہ سگریٹ اور نئی نئی کتابیں اور رسالے لے جانا چاہتی تھیں۔ مگر وہ اس تنخواہ میں ممکن نہ تھا۔ پھر بھیا یہاں سے کہیں بہت دور بھیج دیئے گئے تھے۔ اور اسے بھاول پور کے ایک گرلز اسکول میں سکنڈ مسٹریس کی جگہ مل گئی تھی۔ کوٹھی کا مکان انہوں نے بہار سے آئے ہوئے ایک دو سیالی رشتے دار کے حوالے کیا تھا اور ماما کو ساتھ لے کر بھاولپور چلی گئی تھیں۔ وہاں زندگی کے مزید پانچ جھلسے ہوئے برس انہوں نے تپتے ہوئے ریگستان کے

وسط میں ایک دور افتادہ، گمنام تحصیل میں لڑکیاں پڑھاتے گذارے تھے۔ وہاں ماما پر دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس تحصیل میں ان کا علاج ناممکن تھا۔ اس لئے وہ ماما کو ساتھ لے کر پھر کراچی آ گئیں تھیں پچھلے ایک برس سے وہ پھر کولونی کے اسی مکان کے ایک کمرے میں رہ رہی تھیں جس پر اب ددھیالی رشتے دار نے قبضہ کر لیا تھا اور کسی پرائیویٹ اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ اس ایک برس میں کلیم کے دفتر کے چکر لگاتے لگاتے ان کی ٹانگیں تھک چکی تھیں۔ ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے اور ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی دوڑ بھاگ میں بسوں اور سائیکل رکشاؤں پر اور پیدل، شہر کی خاک چھانتے چھانتے اب ان میں سکت نہ رہی تھی۔ مگر بھیا کا کبھی کبھار جو خط آتا تھا۔ وہ اس میں کتنے پیارے الفاظ میں ان کی ہمت بندھاتے تھے ـــــ اور وہ پھر سر اٹھا کے زندہ رہنے کی جد و جہد میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ وقت کتنی تیزی سے گذر رہا تھا۔ بابا کو مرے، بھیا کو گھر سے گئے کتنی مدت گذر گئی تھی۔ سنہ ۶۱ء آ چکا تھا۔ پچھلے پندرہ برس میں ایک دن۔ ایک رات ایسی نہ آئی تھی جب وہ فکروں اور پریشانیوں اور غم و الم سے ایک لمحے کے لئے آزاد ہوئی ہوں۔ جب انہیں روزی کمانے کے لئے جی توڑ کر محنت اور تگ و دو نہ کرنا پڑی ہو۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ـــــ ساڑھے سات سو روپے ماہوار ـــــ ناقابلِ یقین ـــــ اور دنیا کی لڑکیاں دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔ دفتر میں سکریٹری کا کام کرنا قطعاً کوئی گھٹیا بات نہ تھی ـــ بھیا نے انکو کتنی بار سمجھایا تھا ــ "بیٹا تم دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف نہیں ہو ـــ" اور پچھلے پندرہ ۱۵ برسوں میں انہوں نے بھیا پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نہیں تھیں۔ اور بھیا کو ان پر کتنا بے پناہ فخر تھا ــ میری بہادر بہن ـــ میری سپاہی بہن"

انہوں نے فیصلہ کر لیا ـــ

"جی ہاں ـــ"

"گڈ! پہلی تاریخ کو ساڑھے آٹھ بجے صبح ہماری مائیکرو بس آپ کو پک اپ کرنے آ جائے گی ـــ"

دفعتاً چھوٹی بٹیا ایک بار پھر گھبرا گئیں ـــ "مگر۔ مگر ہمیں شارٹ ہینڈ اور

ٹائپ تو آتا ہی نہیں "

"نیور مائنڈ ــــ ہمارے یہاں آدھی درجن ٹائپسٹ لڑکیاں موجود ہیں۔ پہلی تاریخ ساڑھے آٹھ بجے۔ خدا حافظ، مس مرزا"

گھر میں داخل ہو کر چھوٹی بٹیا نے پھولے ہوئے سانس سے آواز دی "ــــ ماما ــــ ماما ــــ ماما ــــ ہمیں ساڑھے سات سو کی نوکری مل گئی ــــ ایک دم ساڑھے سات سو ــــ اور آنے جانے کے لئے موٹر ــــ"

"اچھا ــــ" ماما نے مختصر جواب دیا۔ انہوں نے کلکٹر صاحب کی موت کو برداشت کر لیا تھا مگر سلمان کے جانے کے بعد سے انہیں چپ لگ گئی تھی۔

دہلیز پر اکڑوں بیٹھ کر لوٹے سے منہ پر چھپکے مارتے ہوئے اور اسکے بعد کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بٹیا سوچا کیں ــــ منیجنگ ڈائرکٹر آدمی تو خاصا معقول نظر آتا تھا۔ اسکے فوراً بعد بوس اور سکریٹری کے تعلقات کی مخصوص نوعیت، اس سے متعلق لطیفے اور کہانیاں۔ ان کے ذہن میں گھوم گئیں۔ لوگ ہمیں کیا سمجھیں گے ــــ سستی، گھٹیا سکرٹری لوگ کیا کہیں گے ــــ بٹیا۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ لوگوں کو تمہاری اتنی پرواہ نہیں ہے۔ انہیں اپنے ہی غم بہتیرے ہیں، انہیں بابا کے الفاظ یاد آئے، مگر نجم بارچ سے وہ اس مشتبہ ملازمت پر جانے والی تھیں۔ انہوں نے فوراً ساڑھے سات سو روپے کا تصور کیا۔ ساڑھے سات سو روپے ماہوار یکمشت ــــ فنٹاسٹک ــــ اتنی بڑی رقم انہوں نے مدتوں سے نہ دیکھی تھی۔ انہوں نے پہلی تنخواہ کا بجٹ بنایا۔ سب سے پہلے تو بھیا کے لئے ڈھیر ساری چیزیں خریدیں گے۔ سب سے پہلے ایک عمدہ سا شیونگ سیٹ۔ بھیا کا شیونگ سیٹ اب تک کتنا خستہ حال ہو چکا ہوگا۔ نئے پاجامے اور قمیص بنوائیں گے۔ بہت سارے چاکلیٹ کے ڈبے اور سگریٹ کے ٹین لیں گے۔ بھیا نے پچھلی مرتبہ ایک کتاب کے لئے لکھا تھا جو وہ بے حد پڑھنا چاہتے تھے۔ اور طامس اینڈ طامس میں جا کر دیکھا تو اس کی قیمت پچیس روپے نکلی۔ اب ان کے لئے پچیس پچیس روپے کی کتابیں خریدنا کیا مشکل ہے۔ ہمارے پاس ساریاں بالکل ختم ہو چکی ہیں۔ اس مہینے تو صرف سَو روپے کی ساریاں خریدیں گے۔ اور ایک

جوڑا نئی سینڈلز، سیاہ رنگ کی۔ جو ہر ساڑی کے ساتھ چل جائے۔ اور منیجنگ ڈائرکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کی پارٹیوں میں جانا ہوگا۔ اس کے لئے کیا ہوگا؟ اس کے لئے تو بہت عمدہ ساریاں خریدنی پڑیں گی ــــ اور میک اپ کا سامان ــــ خیر میک اپ تو میں کبھی نہ کروں گی ــــ کھبا کو پاؤڈر لپ اسٹک والی لڑکیوں سے کتنی نفرت ہے۔

اچھا اور دوسری بات یہ کہ اس آدمی نے کوئی ذرا سی بھی بدتمیزی کی تو ہم فوراً استعفےٰ دے دیں گے۔ یہ طے کرکے ان کو یک گونہ سکون ہوا اور وہ کھانے کے برتن سمیٹ کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔

سید اختر علی کا کمرہ جمشید کی کوٹھی کی دوسری منزل پر تھا جہاں وہ سہ پہر پر دن بھر چپ چاپ لیٹے رہتے۔ ان کی بیوی سینے ٹریم سے صحتیاب ہو کر آ چکی تھیں مگر ان سے شوہر کی ملاقات بہت کم ہوتی۔ سید اختر علی کو زندگی میں پہلی بار آرام، آسائش، اور سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ پیٹ بھر کر اچھے سے اچھا کھانا کھاتے اور سوتے رہتے۔ ایک ملازم محسن انکی خدمت پہ مامور تھا۔ مکمل اطمینان اور سکون کی وجہ سے ان کی دماغی حالت رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ اور جب ان کے دماغ نے دوبارہ باقاعدگی سے کام کرنا شروع کیا تو وہ اس مسلسل بیکاری سے اکتا گئے ــــ "ابا ــــ" جمشید نے ان سے کہا جس کا بیسیوں نارمل اور "اب نارمل" ہر طرح کے انسانوں سے سابقہ پڑتا تھا اور جو اچھا خاصا ماہر نفسیات ہو چکا تھا ــــ "کمپنی لاء کی کتابوں پر ایک نظر ڈال لیا کیجئے۔ آپکی قانون دانی میری فرم کے کام آئے گی۔" چنانچہ سید اختر علی بصد ذوق و شوق سے قانون میں کھو گئے۔ تقریباً اٹھارہ سال بعد انہوں نے اپنے ایل ایل بی کے علم کو دوبارہ بٹّے کا لانا شروع کیا۔ کبھی کبھی وہ جمشید کے دفتر بھی جانے لگے۔ اور اسکے بعد آہستہ آہستہ بیٹے کے کاروباری معاملات میں گھل مل گئے۔

ثریا کراچی پہنچ کر ناظم آباد میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں اتری جو چند برس قبل ڈھاکہ

اسکول میں اسٹاف پر اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ اسنے دبی دبی زبان سے سلمان کے متعلق پوچھ گچھ شروع کی مگر جن لوگوں سے اسنے یہ استفسار کیا انہوں نے اسے ذرا عجیب سی اور مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ چند روز بعد اسے پتہ چلا کہ سلمان کو کراچی سے بہت دور کسی نامعلوم جگہ پر ایک نامعلوم مدت کے لئے منتقل کر دیا گیا ہے۔ اسنے چھوٹی بٹیا کی تلاش شروع کی۔ سلمان نے اپنے خطوں میں احتیاط کی وجہ سے کبھی چھوٹی بٹیا کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ نہ کبھی ان کا پتہ تحریر کیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں چھوٹی بٹیا جیسی گمنام اور مختصر ہستی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ایک روز ثریا کو معلوم ہوا کہ وہ بھی اب کراچی میں نہیں ہیں اور کسی غیر معروف دور افتادہ مقام پر کسی اسکول میں کام کر رہی ہیں۔ ان کا پتہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ ثریا خاصی مشہور آرٹسٹ تھی۔ اسے ایک گرلز کالج میں آرٹ کی لیکچرر شپ مل گئی۔

اسٹاف کی چار پانچ لڑکیوں نے ناظم آباد اور پی ای سی ایچ ایس میں تین تین سو چار چار سو گز کے پلاٹ خرید لئے تھے۔ اور ان پر اپنے مکان بنوا رہی تھیں۔ انہوں نے ثریا سے اصرار کیا۔ کراچی میں مکان کرائے پر لے کر رہو گی تو دیوالہ نکل جائے گا تم بھی قرضہ لے کر اپنا مکان تعمیر کروالو۔ ثریا نے "سوسائٹی" میں چار سو گز زمین قسطوں پر خریدی۔ مکان کی تعمیر کے لئے قرضہ لیا۔ اور چھ مہینے میں بتیس ہزار کے صرفے سے اس کی خوبصورت کاٹج تیار ہو گئی۔ بوٹا بیگم نے اس کا باورچی خانہ اپنی پسند کا بنوایا۔ چونکہ دونوں ماں بیٹیاں سمندری راستے سے مشرقی پاکستان سے آئی تھیں۔ بوٹا بیگم ڈھاکے سے باورچی خانے کا رتی رتی سامان، پتیلیاں، کرچھے، ڈوئیاں۔ توا، چمٹا، سل بٹہ، ہاون دستہ، ایک بڑی سی بوری میں بھر کے ساتھ لیتی آئی تھیں۔ لیکن فرنیچر خریدنے کے لئے ثریا کے پاس پیسا نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی ساری تصویریں ڈھاکے سے لے آئی تھی۔ مگر ابھی وہ ان آرٹسٹوں میں نہیں تھی۔ جن کی تصاویر دھڑا دھڑ فروخت ہوتی ہیں۔ اُسنے یوں بھی کراچی میں پینٹنگز کے خریدار بہت زیادہ نہیں تھے۔ اسنے ناظم آباد والی سہیلی سے ادھار لے کر دو سکنڈ ہینڈ کرسیاں، دو میزیں اور دو نواڑ کی پلنگ خریدے۔ غسل خانے کی چوکی، ایک اسٹول، بوٹا بیگم کے لئے نماز کا چھوٹا سا تخت، اور ایک ہیٹر بھی ناظم آباد والی سہیلی نے اُسے مستعار دیدی۔

بوٹا بیگم مدتوں پہلے جب محمد گنج میں رہتی تھیں تو ڈولی میں بیٹھ کر نکلتی تھیں۔ قصرِ سلمان میں بھی انہوں نے اپنا پردہ قائم رکھا۔ کلکٹر صاحب سے ان کا کافی پردہ رہا۔ پہلے کے کرائے کے مکان میں البتہ وہ ثریا کے تین چار دوستوں کے سامنے آ گئیں۔ وہ سب انہیں بڑے پیار سے "اماں۔ اماں" کہتے اور کرید کرید کر بے حد دلچسپی سے اُن سے گاؤں اور گڑھی کے قصے سُنا کرتے تھے۔ ڈھاکے آ کر بوٹا بیگم نے کبھی کبھی ساری پہننا شروع کر دی۔ گو برقعہ ترک نہ کیا۔ مگر کراچی میدانِ حشر تھا۔ یہاں ان کا پردہ زردہ زیادہ عرصہ نہ چل سکتا تھا۔ کاٹج انہوں نے اپنی نگرانی میں بنوائی۔ اس لئے ٹھیکیدار اور راج مزدوروں کے سامنے آنا پڑا۔ اسکے بعد گھر جمانے کی ساری بھاگ دوڑ انہوں نے خود کی۔ انہوں نے برقعہ اتارا اور بسوں اور سائیکل رکشاؤں میں بیٹھ کر مختلف کاموں کے لئے سارے شہر کے چکر لگانے شروع کئے۔ پڑوس کی وہ بھوپال کی "یو۔ پی والی" بیبیوں سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ اب وہ بیگم حسین کہلائیں اور ساری پہنے، بڑی متانت کے ساتھ آنچل سے سر ڈھکے، براؤن پلاسٹک کا بیگ اور گلابی پلاسٹک کا جالی دار تھیلا ہاتھ میں سنبھالے، سائیکل رکشا پر بیٹھی بوری بازار جاتی نظر آتیں۔

ثریا دن بھر اپنی مصروفیتوں میں لگی رہتی اور سلمان کو بھلائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ رات کے سناٹے میں سلمان کی فکر اور یاد اُسے کھا جاتی۔ مگر کتابوں، رسالوں، سیاست، دنیا کی ہر چیز کے ساتھ ساتھ اپنی مصوری سے سلمان کی یاد سب سے زیادہ وابستہ تھی۔

ان دنوں اُسے پیسے کی بہت سخت ضرورت تھی۔ تنخواہ کا زیادہ حصہ زمین اور مکان کے دینے کی قسطوں میں کٹ جاتا تھا۔ بوٹا بیگم کا دمے کا پرانا مرض عود کر آیا تھا۔ اس کا علاج ہو رہا تھا۔ اُسکے پاس نئے کپڑے بھی نہیں تھے اور وہ ڈھاکے میں خریدی ہوئی ساریوں ہی سے کام چلا رہی تھی۔ وہ تصویر بناتے وقت بھی ننانوے کے پھیر میں پڑی رہتی۔

ایک روز وہ ڈھیلا ڈھالا کمرے میں ایزل کے سامنے کھڑی اپنی تازہ تصویر مکمل کر رہی تھی۔ کہ باہر ایک چمکیلی شیورلے آن کر رکی اور تنگ موریوں کے سلیکس میں ملبوس ایک بے حد اسمارٹ لڑکی اندر آئی۔ اس کے ساتھ دو ادھیڑ عمر خواتین تھیں۔

"میں مالیہ سیّد ہوں ــــ" لڑکی نے کہا "آپ کا پتہ مجھے آپ کے کالج سے معلوم ہوا۔

"میری دوستنیں کچھ پاکستانی پینٹنگز خریدنا چاہتی ہیں ۔۔۔"

نوواردوں نے چاروں طرف دیکھا اور بیٹھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو فرش پر گھٹنے ٹیک کر تصاویر دیکھنے لگیں۔ دونوں سکنڈ ہینڈ کرسیاں پچھلے برآمدے میں رکھی تھیں۔ ان پر بوڑھا بیگم نے کپڑے دھو کر پھیلا دیئے تھے۔ اسٹول باورچی خانے میں تھا۔ ثریا کو اس وقت شدت کی کوفت ہوئی ۔۔۔ تصویروں کے خریداروں کو بٹھانے کے لئے کمرے میں ایک صوفہ سیٹ اشد ضروری تھا۔

امریکن عورتوں نے تین تین سو روپے میں سلہٹ کے دو مناظر فوراً خرید لئے۔ ثریا نے عالیہ سید کا شکریہ ادا کیا۔ عالیہ سید نے اسے اپنا ٹیلی فون نمبر دیا اور اسے بتایا کہ اسے اتنی بڑی آرٹسٹ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اسنے ثریا کو اپنے گھر مدعو بھی کیا۔

اسی روز شہر جا کر ثریا نے ایک صوفہ سیٹ، ایک چھوٹا سا بک شیلف اور ایک ٹیبل لیمپ خریدا۔ اور یہ سامان بڑے کمرے میں سجا کر سوچنے لگی کہ اگر ایک خوش رنگ سا قالین اور پردے بھی ہوں تو کمرہ جگمگا اٹھے۔

لیکن یہ فرنیچر خریدنے کے لئے اسنے پچاس روپے گھر کے خرچ میں سے بھی ڈال دیئے تھے اور ہر مہینے قرضہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند روز بعد اسے معلوم ہوا کہ ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں آرٹسٹوں کو بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اسے عالیہ سید کا خیال آیا۔ جو بہت بارسوخ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کالج سے اسے فون کیا۔

دوسرے سرے پر فون کا ریسیور عالیہ کے بھائی جمشید علی سید نے اٹھایا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ مشہور فنکار ثریا حسین بات کر رہی ہیں تو اسنے کہا ۔۔۔ "کمال ہو گیا! مجھ سے عالیہ نے کل ہی آپ کا ذکر کیا تھا۔ میرے چند امریکن دوست بھی تصویریں خریدنا چاہتے ہیں۔ کسی روز آپ میرے ساتھ لنچ کھانا پسند کریں گی؟"

چنانچہ اتوار کے روز ثریا حسین موٹر رکشا میں بیٹھ کر کراچی جم خانہ گئی۔ جمشید ٹینس کورٹ کے رخ والے بڑے کمرے میں اس کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر میں ٹینس کھیل کر عالیہ بھی آ گئی۔

باتوں باتوں میں عالیہ نے بڑے بے تکلف اور دوستانہ لہجے میں اس سے پوچھا ـــــ
"ثریا ـــــ تم تو ریڈ ہونا ؟"
"ریڈ ـــــ ؟" ثریا چونک پڑی ۔ اور ذرا گھبرا کر اسنے کہا "نہیں تو ـــــ کیوں ؟"
"ارے کچھ نہیں ـــــ میں نے سنا تھا ـــــ" عالیہ نے بے پرواہی سے کہا ۔
جمشید زور سے ہنسا ـــــ "کالج کے زمانے میں رہی ہوں گی ـــــ" لیکن ثریا کی گھبراہٹ دیکھ کر اسنے سنجیدگی سے کہا ـــــ "مس حسین آپ کے لئے کسی بھی ایڈورٹائزنگ فرم میں جگہ نکل سکتی ہے ـــــ اس کی فکر نہ کیجئے ـــــ مگر اپنے خیالات ـــــ اگر وہ اس قسم کے ہیں ـــــ تو ذرا ان کو ـــــ میرا مطلب ہے ـــــ ان کا اظہار نہ کیجئے گا ۔ علاوہ ازیں، زیادہ تر امریکن ٹورسٹ ہی ہمارے مصوروں کی تصاویر خریدتے ہیں اور بہت اچھے دام دیتے ہیں ۔ اور میرا مطلب ہے ۔ آپ کی تصویریں امریکنوں کے ہاتھ خوب بک سکتی ہیں اگر ـــــ ان کو یہ خیال نہ ہو جائے کہ آپ لیفٹ ہیں ـــــ"
وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسی ۔ عالیہ کو کہیں اور جانا تھا ۔ وہ ان دونوں کو لنچ کھانا چھوڑ کر باہر چلی گئی ۔
اگلے مہینوں میں ثریا کی کئی تصویریں عالیہ اور جمشید کے ذریعہ بک گئیں ۔ اسنے نشست کے کمرے کے لئے کھدر کے خوبصورت پردے خریدے ـــــ جن پر موہن جوداڑو کے نقش و نگار چھپے تھے ۔ رنگین جوٹ کی بڑی آرٹسٹک سی چٹائی خریدی اور ٹیلی فون لگوانے کی درخواست دے دی ۔ اسکے آئندہ مہینے میں اس کی ایک بڑی تصویر خود جمشید نے اپنے دفتر کے لئے سات سو روپے میں خریدی ۔ اور ایک اور تصویر کے لئے ایک امریکن سیاح نے پورے ایک ہزار روپے دے دیے ۔ ـــــ ثریا نے اس مرتبہ ایک چھوٹا سا فریجیڈیر بھی خرید لیا ۔ کھانے کے کمرے کا فرنیچر اور اپنی سنگھار میز اسنے کچھ عرصے بعد سنٹرل جیل سے بہت واجبی قیمت پر بنوالی ۔ ٹیلی فون بھی لگ گیا اور اب اس کا کانچ منہ سے بولنے لگا ۔ بڑے سے بڑا آدمی اس سے ملنے آجائے ۔ اسے کوفت نہیں ہوتی تھی ۔
لیکن اس کا خرچ بڑھتا جارہا تھا ۔ ٹیلی فون کا بل ۔ بوڑھا بیگم کے ڈاکٹر کا بل ۔ دوکانوں کے

لی۔ کالج جانے کے لئے اسے روزانہ ایک نئی ساری چاہئے تھی۔ وہ ایک ہی ساری کلاس میں دو دن نہیں پہن سکتی تھی۔ اس کی طالبات ایک سے ایک فیشن ایبل تھیں۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہوتا جا رہا تھا ۔۔۔ روز شام کو کہیں نہ کہیں باہر جانا ہوتا تھا۔ اور یہاں کے فیشن ایبل ماحول کے مطابق معقول ساریاں درکار تھیں۔ ڈھاکے میں تو چھ سات سوتی ساریوں میں سارا سال گذر جاتا تھا ۔۔۔ اور یوں بھی وہ ایک "شخصیت" میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اور معمولی کپڑے پہن کر ادھر ادھر نہ گھوم سکتی تھی۔ اس کا معیار زندگی روز بروز اونچا اور مہنگا ہوتا چلا گیا لیکن خوش قسمتی سے اسے ایک ایڈورٹائزنگ فرم میں نو سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایجنسی جمشید کے کاروبار کی ساری پبلسٹی سنبھالتی تھی۔ اس معقول مشاہرے کی وجہ سے ثریا کی بیشتر مالی الجھنیں حل ہو گئیں۔

اس ایجنسی میں ابھی اسنے سال بھر ہی کام کیا ہوگا کہ ایک بے حد نفیس اسکالرشپ اسے پیش کیا گیا۔ اسنے ڈیما سلیم کو اپنی سہیلی کے وہاں ناظم آباد منتقل کیا۔ کالج چار سو روپے ماہوار کرائے پہ اٹھایا اور دو سال کے لئے پیرس چلی گئی۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں وہ کراچی واپس آئی اور لوٹتے میں جرمنی سے اپنے لئے ایک فوکس ویگن بھی خرید لیتی لائی ۔۔۔

•

چھوٹی بٹیا کے تقرر کو ابھی ایک مہینہ ہی گذرا تھا کہ بوس نے بیچ لگژری میں ایک بہت بڑی پارٹی دی۔ اور اپنی سوشل سکریٹری سے ڈکٹا فون پہ کہا کہ وہ سات بجے شام کو تیار رہے وہ خود آ کر اسے پک اپ کر لیں گے۔

چھوٹی بٹیا نے پہلی تنخواہ ملنے پر الفنسٹن اسٹریٹ سے ایک "انڈین ساری" اصل سے دوگنی قیمت پر خریدی تھی۔ اور دفتر میں مس ڈی سوزا نے اصرار کیا تھا کہ کم از کم شام کے وقت میک اپ کرنا بہت ہی لازمی ہے۔ ورنہ چہرہ پھیکا پھیکا اور بے جان لگتا ہے۔ چنانچہ چھوٹی بٹیا نے ایک ہلکے رنگ کا لپ اسٹک بھی خرید لیا تھا۔

اندھیرا پڑ گیا تھا اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی میک اپ کر رہی تھیں۔ وہ کھڑکی ہمیشہ بند

رکھتی تھیں کیونکہ اس میں سے گلی کا سامنا ہوتا تھا۔ اس وقت انہوں نے اس کا ایک پٹ کھول کر آئینہ کھڑکی کے گرد آلود جالی میں اٹکا دیا تھا اور پلنگ کے کنارے بیٹھی ناخنوں پہ کیوٹکس لگا رہی تھیں۔

چہرے پر فاونڈیشن کریم ملتے ملتے یک لخت ان کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ انہیں دفعتاً یہ احساس ہوا کہ آج وہ پہلی مرتبہ اپنی اس ڈیوٹی پر جا رہی تھیں جس کے لئے ان کو ملازم رکھا گیا تھا۔ انہیں بوس کے غیر ملکی دوستوں کو "انٹرٹین" کرنا تھا۔ وہ اس پارٹی کی "ہوسٹس" تھیں اور انہیں لامحالہ بوس کی "مسٹرلیس" بھی سمجھا جائے گا۔ اللہ میاں ـــ اللہ میاں ـــ ہم مر کیوں نہیں جاتے ـــ ہم ـــ" انہوں نے نفاست سے دیوار کا سہارا لیا ـــ "یا اللہ ہمیں موت کیوں نہیں آجاتی ـــ"

باہر ایک سرخ رنگ کی طویل کرائسلر آکر رکی۔ اور بڑا دبیز سا ہارن بجا۔ انہوں نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ لپ اسٹک لگایا اور بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں گئیں ـــ

"ماما ـــ ماما ہم پارٹی میں جا رہے ہیں۔ رات کو دس گیارہ بجے تک لوٹیں گے۔"

"اچھا ـــ"

برآمدے کے بالکل برابر کار کھڑی کرکے جمشید اسٹیرنگ وہیل پر بازو رکھے الٰہی بخش کوٹھی کے اداس ماحول کو دیکھ رہا تھا۔ جھٹ پٹے کی نیم تاریکی نے زیادہ المناک بنا دیا تھا۔ دنیا میں زیادہ تر انسان کس قدر بے رنگ زندگیاں گذارتے ہیں۔ اسنے سوچا۔ اتنے میں مس مرزا باہر نکلیں۔ اسنے دروازہ کھولا اور اسکے برابر آ بیٹھیں۔

کرائسلر گلیوں کی دھول اور کیچڑ اور گڑھوں پر سے نہایت وقار کے ساتھ گذرتی باہر کی سڑک پر آگئی۔ جمشید نے مڑ کر اپنی دلکش سکریٹری کو دیکھا اور مسکرا کر اخلاق سے دریافت کیا ـــ

"سو ـــ ہاؤ آر یو دس ایوننگ مس مرزا ـــ؟"

"فائن ـــ تھینک یو ـــ"

کار اب چوراھے کے بھیڑ بھڑکے کو چیرتی ہوئی نکل رہی تھی ـــ گھڑ گھڑ کرتی بسیں،

دھواں چھوڑتی ایک ایک کر کے برابر کے میدان میں جاکر کھڑی ہو رہی تھیں۔ لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دفتروں سے لوٹ رہے تھے۔ حلوائیوں اور چائے والوں کی دوکانیں تیز نیون لائٹس سے چمک رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے برآمدوں پر جافریاں چڑھی تھیں اور ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں لگی تھیں۔ ان سب ناموں کے پیچھے کتنی کہانیاں چھپی تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے حروف میں ہومیوپیتھک ڈاکٹروں "پانی بجلی اور بھاپ کے اصل جرمنی علاج" اور پرائیویٹ کالجوں کے اشتہار لکھے ہوئے تھے۔

جمشید نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی۔ وہ اپنے اسٹاف کے دکھ سکھ میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا اور ان سے بڑی دردمندی سے پیش آتا تھا۔

"آپ کو دفتر کا کام کیسا لگ رہا ہے مس مرزا؟"

"اٹس آل رائٹ" جواب ملا۔

اب کرائسلر سنٹرل جیل کی دیوار کے نیچے سے گذر رہی تھی۔ دفعتاً جمشید نے دیکھا کہ اس کی سکریٹری کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میچ کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے۔

"مس مرزا ــــ مس مرزا ــــ کیا بات ہے؟" اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــ" چھوٹی بیٹا نے گھبرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کیا ہوا ــــ بتلایئے تو ــــ"

"کچھ بھی تو نہیں ــــ"

وہ خاموش ہو گیا۔ بہت شریف لڑکی ہے۔ مگر بے حد نروس طبیعت کی مالک ہے۔ خیر ٹھیک ہو جائے گی۔

"اگر آپ پارٹی میں بھی اسی طرح چپ رہیں تو میری بزنس ہو چکی ــــ" کچھ دیر بعد جمشید نے ذرا خوشدلی کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

وہ دل پر جبر کر کے اخلاقاً ہنسی۔ جمشید نے سگریٹ جلایا۔

"آپ اسموک نہیں کرتیں؟"

"جی نہیں ۔۔۔"

اس لڑکی کے بے لبس سے وقار نے اسے اتنا مرعوب کر دیا کہ مزید ذاتی سوال کرنے کی اسے ہمت نہ پڑی۔ اسنے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔

پارٹی کے اختتام پر جمشید اپنی سکریٹری کے قریب آیا اور بڑی گرم جوشی اور طمانیت سے اس کا چھوٹا سا سفید ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"۔۔۔ مس مرزا۔ آپ تو فرنچ بولنا بھی جانتی ہیں۔ چھپی رستم نکلیں آپ تو۔ آپ نے اتنی خوبصورتی سے میزبانی کے فرائض انجام دیئے ۔۔۔ یہ لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ اور پرفیکٹ سکرٹریز ہوتی ہیں تو ہم اپنا سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں!"

"اب ہمیں گھر پہونچا دیجئے ۔۔۔"

"یقیناً ۔۔۔ لیکن مس مرزا ۔۔۔ آپ عموماً اس قدر خاموش رہتی ہیں اور آج شام اتنی ڈیپریسڈ معلوم ہو رہی تھیں کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے پارٹی اینجوائے کی۔ آج میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ہنستے ہوئے دیکھا۔ اور آپ نے شیری چکھنے میں اتنا تکلف کیوں کیا؟ پڑھی لکھی لڑکی ہو کر اتنی دقیانوسیت! خوش رہیئے۔ زندگی سے جی بھر کر محظوظ ہوجیے۔ ہم لوگ اس دنیا میں بار بار پیدا نہ ہوں گے ۔۔۔ ہنسیئے ۔۔۔ ہنسیئے ۔۔۔ ڈیم اٹ ۔۔۔ میں نے بہت آپ جناب کر لیا ۔۔۔ تم میری سکریٹری ہو۔ میں تمہیں صرف سلمیٰ کہوں گا۔ اپنا یہ اسکول مسٹریس کا ذہنی لبادہ اتار دو۔ اگر یہ اولڈ میڈ والی ذہنیت اختیار کی تو یاد رکھو واقعی ساری عمر اولڈ میڈ ہی رہو گی ۔۔۔ اور یہ بڑی سخت ٹریجڈی ہو گی۔ جوانی کی مسرتوں کا تم پر بہت زیادہ حق ہے ۔۔۔!"

جمشید کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی تھی۔

رات کو جمشید علی گھر واپس پہونچا تو شراب کے مدھم سرور کی لہروں پر تیرتا ہوا سوچ رہا

تھا کہ گو اس لڑکی کے خاندان کا کچھ پتہ نشان معلوم نہیں مگر ہے بڑی پیاری سی۔ اور انگریزی بالکل میموں والی بولتی ہے۔ ممکن ہے اس کی ماں انگریز ہی ہو۔ بہترین بیوی ثابت ہو گی ــــ خاموش طبیعت۔ محنتی۔ اور خوش اخلاق۔ مگر رہتی ہے کولونی میں۔ STATUS کا بڑا پرابلم ہے وہ بارات لے کر کولونی کس طرح جائے گا۔

لیکن کپڑے تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹتے وقت جب اس کا سرور تھوڑا سا زائل ہوا تو اسنے سوچا ــــ لاحول ولاقوۃ، یہ میں کیا بکواس سوچ رہا ہوں ــــ کیسی شادی اور کس کی شادی۔ میں اس لونڈیا کو GROOM کروں گا۔ بہترین WOMEN CONTACT ثابت ہو گی۔ ایک سے ایک بڑا گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہو کر سارے کاروباری راز اگل دے گا۔ لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے ــــ

اسنے پلنگ پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور سگریٹ جلایا ــــ

WHAT A LUCKY DOG I AM WHAT A LUCKY DOG–

اسنے دل میں کہا۔

برابر کے ایک کمرے میں سید اختر علی چند ملاقاتیوں سے کلیم کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

"آپ نے کتنے کا کلیم داخل کیا ہے وکیل صاحب؟"

"صرف تین لاکھ کا ــــ" سید اختر علی کی آواز آئی۔

"آپ کی زرعی جائداد بھی تو ہو گی؟"

"جی ہاں۔ مگر میرے بھائی صاحب ابھی بھارت ہی میں ہیں ــــ" سید اختر علی نے جواب دیا۔ "وہ ابھی تک وہیں پھنسے ہوئے ہیں۔ بہت لکھا کہ یہاں آ جائیے مگر نہیں مانتے۔ میں نے تو اپنی کان پور کی کوٹھی کا کلیم ہی داخل کر دیا ہے فی الحال۔ منظور ہونے پر بھی اس کا چالیس فی صدی ملے گا مگر صبر و شکر کر کے وہی قبول کر لیں گے ــــ کیا کیا جائے۔ یہاں تو ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ آبادکاری کے محکمے میں ذرا بھی انصاف نہیں ــــ یہ ملک تو بالکل اندھیر نگری بنا ہوا ہے ــــ"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے وکیل صاحب ۔"

جمشید کو پیاس محسوس ہوئی سامنے روشنی جلائی ۔ اٹھ کر الماری میں سے وسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور ایک گلاس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا ۔

اس کے باپ کی آواز اسکے کانوں میں آتی رہی ـــ اب وہ کبڑے ہے نخرے ـــ" اب یہی دیکھیے جمشید میاں نے دو ہزار گز زمین سوسائٹی میں لے کر ڈال دی تھی ۔ اس پر کوٹھی کی تعمیر شروع کروائی مگر سمینٹ اور لوہا سب بلیک میں چلا گیا ۔ اب تک ساڑھے تین لاکھ روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے مگر تعمیر ختم نہیں ہوئی ـــ"

جمشید نے گلاس ختم کیا ۔ اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا ۔ دفعتاً ایک بھیانک انکشاف اس کے ذہن کے دھندلکے میں کوندا ـــ اپنے خدا پرست، فقیر منش، توکل پسند باپ کو، اس شخص کو جو ایک زمانے میں سید مظہر علی اور گوسائیں کاکا اور مولوی محمد حسن کے محدود و معصوم دائرے کا ایک فرد تھا ۔ اس کھوکھلے بوڑھے کو جھوٹا، بد دیانت، ریاکار اور جعلساز اس نے خود بنا دیا تھا ـــ OH, WHAT A DOG, I AM WHAT A DOG, WHAT A DOG" اسنے زور سے تکیے پر مکا مارا اور کمبل میں منہ چھپا کر سو گیا ۔

منصور احمد ثریا سے پیرس میں ملا تھا ۔ وہ ایک ہونہار محنتی اور بے انتہا ذہین جرنلسٹ تھا ۔ اور کئی سال امریکہ میں پبلک ریلیشنز کی تکنیک سیکھنے کے بعد حال ہی میں کراچی واپس آیا تھا اور ان دنوں ایک روزنامے سے منسلک تھا اور شہر کے کامیاب اور بااثر صحافیوں میں اس کا شمار کیا جا رہا تھا ۔

اس وقت وہ پریس کلب میں بیٹھا ثریا کی ہونے والی نمائش کے متعلق ایک رائٹ اپ لکھ رہا تھا ۔ ثریا نے پریس کلب کو اپنی ایک بڑی پینٹنگ تحفے میں دی تھی اور منصور نے اسے فون کیا تھا کہ وہ خود پریس کلب آکر تصویر کو اپنی مرضی کے مطابق دیوار پر آویزاں کرے ۔ اور کھانا بھی

وہیں کھلائے۔ اتوار کی سہ پہر تھی تین چار صحافی ہال کے ایک کونے میں بڑی سنجیدگی سے شطرنج میں غلطاں و پیچاں تھے منصور نے مضمون شروع کرنے کے لئے کاغذ ٹائپ رائیٹر پر چڑھایا کہ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اسے اپنے اخبار کے لئے بھارت کے متعلق ایک اہم مضمون تیار کر کے جلد از جلد کاپی فائیل کرنی ہے۔ وہ فوراً لمبی میز کی طرف گیا جس پر رسالے اور اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ اسنے سرعت سے بھارت کے تازہ انگریزی اور اردو اخباروں کی ورق گردانی شروع کی۔ شمالی بھارت کے سیاسی کوائف کا جائزہ لینے کے لئے اسنے اتر پردیش کا ایک نسبتاً غیر معروف سا اردو اخبار اٹھا لیا۔ اس میں زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے عرسوں کی اطلاعات اور صوبے کے اسلامی اور عربی مدارس اور اوقاف کے انتظامات کے متعلق خبریں درج تھیں۔ اضلاع کی خبروں کے کالم میں ایک چھوٹی سی سرخی تھی ——
شاہ منور علی کا وصال۔

موضع محمد گنج ضلع سلطان پور (اودھ) کی درگاہ شریف کے سجادہ نشین مخدوم زادہ شاہ منور علی نور مرقدہ ہندوستان جنت نشان کی پاک سرزمین (پاک سرزمین؟ منصور احمد نے دل میں کہا، پاک سرزمین صرف پاکستان کی ہے ——) کے ان عارفین کاملین اور بزرگان گرامی میں سے تھے جو ——

منصور احمد نے اکتا کر آگے نظریں دوڑائیں۔ اسی کالم میں ایک اور غیر دلچسپ سی خبر تھی —— جناب نوروز حسین خاں آف بارہ پور (ضلع سلطان پور) نے جو ودھان سبھا میں سوتنتر پارٹی کے ممبر ہیں کل ——

منصور احمد نے اور آگے پڑھا جہاں وزرا پر نکتہ چینی، بلیک مارکیٹ، رشوت ستانی ذات بندی، صوبہ پرستی اور فرقہ پرستی کے انسداد کے مطالبے اور دیگر متعلقہ معاملات کے کوائف چھپے تھے۔ ایک سرخی پر اسکی نظر ٹھیر گئی جو اہم ہو سکتی تھی —— کامریڈ آنند موہن گھوش کا لوک سبھا میں سوال —— نئی دہلی —— لوک سبھا میں بحث کے دوران میں کمیونسٹ ممبر کامریڈ آنند موہن گھوش نے ——

"ہیلو ــــ کیا ہو رہا ہے ــ" ثریا نے پیچھے سے آن کر آواز دی۔
"ہیلو ــــ ثریا ــــ" منصور نے اخبار بند کرتے ہوئے مڑ کر کہا۔
"معاف کرنا مجھے دیر ہوگئی ــــ" ثریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ عابد انصاری بھی تھا جو منصور کے مخالف اخبار میں چیف رپورٹر تھا۔ ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ مگر خبروں کی اسکوپ کے معاملے میں دونوں ایک دوسرے کو چوٹ دینے کی فکر میں رہتے تھے۔
"میں عابد کو اپنے میورل دکھانے لے گئی تھی۔ اس میں ایک گھنٹہ لگ گیا ــــ" ثریا نے کہا۔
"ــــ جو تم ایر پورٹ پر بنا رہی ہو ؟" منصور احمد نے دریافت کیا۔
"نہیں۔ جمشید ہاؤس کی لاؤنج میں ــــ" ثریا نے کہا۔
"جمشید ہاؤس ؟ اچھا ــــ وہ جمشید سید کی نئی کوٹھی ــــ"
"اس کے لئے بہت سے آرٹسٹ دانت لگائے بیٹھے تھے کیونکہ جمشید علی پیسے بہت فراخدلی سے دیتا ہے ــــ" عابد انصاری نے کہا۔
"میں فوٹوگرافر لے چلوں ؟ اس کی تصویر بھی تمہارے متعلق مضمون کے ساتھ چھپ جائے" منصور احمد نے کہا۔
"ابھی رہنے دو ــــ ابھی اس میں ہاؤس کی سونڈ باقی ہے۔" ثریا نے جواب دیا۔
"ہاؤس وارمنگ کے روز دیکھ لینا ــ"
"اچھا۔ تو تم نے اس میں بھی مشرقی پاکستان کا موٹیف رکھا ہے" منصور احمد نے میز پر جھک کر کاغذ پر ایک جملے کا اضافہ کیا پھر اس نے کہا۔
ثریا تم کو ماننا پڑے گا کہ تمہاری نمائش کے لئے اس سے بڑھ کر اینڈ ولنس پبلسٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک مضمون میں اپنے نام سے لکھ رہا ہوں ــــ چار مضامین اگلے ہفتے تک مختلف ناموں سے پریس میں اور آجائیں گے اور تمہاری نمائش کا کتابچہ بے حد خوبصورت چھپا ہے۔"
"تھینکس ــ ہاؤ سوئیٹ یو آر ــ"
"تم دونوں جا کر کھانا منگواؤ۔ میں ایک ضروری نوٹ لکھ کر ابھی آتا ہوں ــــ"
"جلدی کرنا ــــ" ثریا نے کھانے کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

منصور احمد نے نہایت سرعت سے عبارت پر نوٹ مکمل کیا اور ٹائپ رائیٹر پر دوسرا کاغذ چڑھایا اور تیزی سے ٹائپ کرنا شروع کیا ۔۔۔

کراچی کے فنی حلقوں کے لئے مس ثریا حسین محتاج تعارف نہیں ہیں۔ مس حسین نے جو اُتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحب زادی ہیں، مسوری کا نونٹ میں تعلیم حاصل کی اور اسکے بعد شانتی نکیتن اور ۔۔۔"

۳

پی ای سی ایچ ایس کی ایک اونچی نیچی پتھریلی سڑک پر بے شمار موٹریں کھڑی تھیں اور معزز مہمان اتر اتر کر اندر جا رہے تھے۔ کراچی کے مشہور بزنس مین جمشید علی سید نے اپنی نئی کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" کی دعوت میں شہر کے تقریباً سبھی اہم لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کوٹھی کی لاؤنج کے طویل دریچے میں سے وسیع اور سرسبز لان کا منظر ایک ٹیکنی کلر سینما اسکوپ پردے کے مانند دکھلائی دے رہا تھا۔ درختوں میں جگمگاتی برقی روشنیاں۔ قندیلیں۔ کیاریوں کے خوبصورت پھول۔ گھاس پر بچھے ہوئے صوفے۔ اشیائے خورد و نوش سے لدی ہوئی میزوں کی قطاریں۔ سفید کپڑوں میں ملبوس بیرے۔ تپائیوں پر رکھے ہوئے قیمتی سگرٹوں کے ڈبے۔ سفارتخانوں کے افراد۔ نظر فریب ہندوستانی ساریوں میں ملبوس دلفریب پاکستانی بیگمات۔۔۔ سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن اور کاک ٹیل ڈریس۔ عطر کی لپٹیں۔ برف کی بالٹیوں میں ڈوبی ہوئی شراب کی بوتلیں۔ ادھر ادھر کھڑے ہوئے جرنلسٹوں کے گروہ۔ کیمرہ سنبھالے چاروں طرف ٹہلتے ہوئے فوٹو گرافر۔ وقتاً فوقتاً کوندتے ہوئے فلیش بلب۔ بڑے بڑے کاروباری۔ جغادری بل اونر۔ اعلیٰ سرکاری عہدیدار۔ کابینہ کے وزیر۔ سفیر اور فرسٹ سکریٹری اور پریس اتاشی اور کمرشل اتاشی ۔۔۔ چبوترے پر ڈانس بینڈ بج رہا تھا اور چند جوڑے رقص میں مشغول تھے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ کوٹھی کی دوسری منزل پر روک این رول کا شور مچ رہا تھا۔ اور فیری اپنے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اودھم مچا رہی تھی۔ نیچے لان پر عالیہ سید نہایت بیش قیمت سفید رنگ کی بنارسی ساری میں ملبوس۔ گلے میں سچے موتیوں کی ایک

رہی پہنے، میزبانی کے فرائض انجام دینے میں معروف تھی۔ سید اختر علی سوٹ پہنے ایک کونے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ جمشید کے دونوں چھوٹے بھائی امریکہ پاپٹ کم عمر لڑکیوں کے ایک گروہ میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

لاؤنج کے اندر چند مہمان دیوار کی سطح پر ٹنے ہوئے فریسکو پر رائے زنی میں منہمک تھے۔ ثریا حسن نے فرانسیسی شیفون کے بڑے بڑے سرخ پھولوں والی ساری پہن رکھی تھی۔ تصویر کے سرے پر کھڑی ملاحوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اسکے بال تازہ ترین پی ہائیو اسٹائل میں بنے تھے۔ اور اسنے شینیل فائیو کی خوشبو لگا رکھی تھی۔ اور اس کے بلاؤز کی تراشش ہی سے اس کی ساری پیٹھ عریاں تھی۔

"مس حسین میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب آپ جمینی رائے کے اثر سے آزاد ہو چکی ہیں ۔۔۔ آپ کے بنائے ہوئے نقوش اور رنگوں میں اب قومی کردار اور قومی طرز کی جھلک نظر آنے لگی ہے ۔۔۔" پاکستانی آرٹ کے ایک مشہور نقاد نے اس سے کہا۔

"پاکستانی آرٹ کا مستقبل اب صرف ہمارے فن کاروں کی نئی نسل کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پیرس پیریڈ کی تصاویر سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ اپنے تہذیبی ورثے کی طرف آرہی ہیں۔" دوسرے نقاد نے کہا۔

"مثال کے طور پر موسیو دیتی ہے آپ ہاتھی کی سونڈ ملاحظہ کیجئے ۔۔۔" فریسکو کے سامنے ایک اور انٹلکچوئیل نے ایک موٹے فرانسیسی کو مخاطب کیا ۔۔۔ "ہاتھی ۔۔۔" اس نے حلق صاف کر کے مقررانہ انداز میں بات جاری رکھی ۔۔۔ "مشرقی پاکستان کی کلچر کا ایک سمبل ہے وہاں کی ندیاں۔ بوٹ مین، ہاتھی، اور مچھلیاں ۔۔۔"

"مچھلیاں، کشتیاں اور جوٹ ۔۔۔" دوسرے انٹلکچوئیل نے اضافہ کیا۔

موٹے فرانسیسی نے جو ذرا شکل سے ذرا احمق سا معلوم ہوتا تھا۔ عینک ناک کی پھننگ پر اچھی طرح جمائی اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کو دیکھا ۔۔۔ "ایسے ہاتھی تو انڈیا میں بھی ہوتے ہیں" اسنے حیرت سے کہا۔

"مس حسین ——" پہلے انٹلکچوئیل نے کہا —— "موسیو دیتر ہے کو اپنے شاہکار کی سمبلزم سمجھائیے۔ پاکستان کی تہذیبی روایت کی جڑوں کی تلاش اور مسلمانوں کے اجتماعی فنی لاشعور کے مظاہر کی معنی آفرینی اور ——"

بیرہ شراب کی بوتلیں اور جام ایک ٹرے میں رکھے ادھر آیا۔ وہ سب جام ہاتھوں میں لے کر فریسکو کے سامنے کھڑے آرٹ پر تبادلۂ خیالات میں مصروف رہے۔

دیوار کی سبز روغنی سطح پر آم کے درخت بے ترتیبی سے آڑے ترچھے کھڑے تھے۔ عقب میں ایک گہری نیلی ندی بہہ رہی تھی۔ سامنے سے ایک ہاتھی گذر رہا تھا جس پر زرد رنگ کی جھول اور جو کور سا ہودہ تھا۔ اس میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ پوری تصویر بنگالی فوک آرٹ کی طرز میں بنائی گئی تھی۔

"ثریا ——" دوسری طرف سے کسی نے آواز دی "تمہیں جمشید ڈھونڈتا پھر رہا ہے"

وہ لاؤنج میں جمع مہمانوں سے معذرت چاہ کر باہر لان میں گئی۔

مقابل کی روش پر سے اسنے ایک سنہرے بالوں والی پستہ قد لڑکی کو آتے دیکھا۔ اس لڑکی نے جھلمل کرتے ستاروں والی آتشیں گلابی ساری پہن رکھی تھی۔ اور بالوں کا بہت اونچا پھیلے ہوئے تاج یا پنکھے کا سا جوڑا بنائے تھی جس کی اونچائی کی وجہ سے اس کے قد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ پپوٹوں کے ہلکے نیلے روغن اور ہونٹوں کے گہرے گلابی رنگ کے ساتھ اس کا میک اپ بے حد نفیس اور مکمل تھا۔ وہ لڑکی قریب آگئی۔

وہ دونوں آمنے سامنے اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئیں۔ کئی سکنڈ گذر گئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔

"چھوٹی بٹیا ——" ثریا نے چند لمحوں بعد کہا۔

سلمیٰ گم سم آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھنے لگی۔

"چھوٹی بٹیا ——"

وہ خاموش رہی۔

"چھوٹی بٹیا —— آپ —— میں ——"

اسنے کوئی جواب نہ دیا۔

"او ہلو ثریا ـــ!" کسی مہمان نے قریب آکر گرمجوشی سے کہا ـــ "لونگ ٹائم نو سی[1] ـــ تمہیں فون کرتے کرتے عاجز آگیا۔ ویسے تم رہتی کہاں ہو ـــ؟"

"ہاؤسنگ سوسائٹی ـــ" ثریا نے اس آواز میں کہا جو اسنے خود نہیں سنی ـــ پھر اسنے جواب دہرایا۔

"ہاؤسنگ سوسائٹی ـــ"

"اچھا۔ میں کل شام کو عالیہ کے ساتھ آؤں گا ـــ" وہ مجمع میں غائب ہو گیا۔

پیچھے سے جمشید نے آکر ثریا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اس کے ایک ہاتھ میں کاکٹیل کا گلاس تھا۔

"جان من ـــ" اسنے ذرا لہک کر کہا ـــ "ڈھونڈ تھکا ہوں بن کے بن، چھان چھرا گلی گلی ـــ! کہاں تھیں؟ ـــ ارے تم دونوں ایسی چپ کیوں کھڑی ہو! کیا تمہارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں؟ ثریا ـــ دس از سلمیٰ مرزا ـــ مائی موسٹ ایفی شنٹ سوشل پرسنل اینڈ کانفیڈنشل سکریٹری۔ چلو جان من ناچیں ـــ" اسنے گلاس تپائی پر رکھا اور ثریا کو کھینچتا ہوا چبوترے پر لے گیا ـــ وہاں دونوں رقصاں جوڑوں کے بھنور میں غائب ہو گئے۔

ڈانس بینڈ کی دھن تیز ہوگئی۔ سلمیٰ قریب کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بہت گہرے اندھیرے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ صوفے پر ٹک کر وہ ثریا کو جمشید کے ساتھ ناچتا دیکھتی رہی۔

ثریا باجی۔ اسنے دل میں کہا۔ بھیا آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید کاٹنے چلے گئے۔ جب وہ قید تنہائی کی لمبی مدت کے بعد باہر نکلیں گے ان کے بال سفید ہوں گے۔ اور وہ بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔ لیکن میرے بھیا کبھی بوڑھے نہ ہوں گے۔ کبھی ناامید نہ ہوں گے۔ کبھی ہار نہ مانیں گے۔ جب کہ آپ نے ثریا باجی ـــ اتنی آسانی سے ہار

---

[1] LONG TIME NO SEE

مان لی۔ آپ جنہوں نے بھیا کو رشنی دی تھی۔ دل دیا تھا۔ ہمت دی تھی ـــ اسنے آنکھیں میچ لیں تا کہ اس پارٹی کے منظر کی کسی چیز کو نہ دیکھ سکے۔

"ہلو ـــ" کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونکی۔ سامنے کپاس کے ملک التجار پنیسٹھ سالہ مسٹر زادیری کھڑے اپنے نقلی دانت نکوس رہے تھے۔ ان دنوں سلمیٰ کی ڈیوٹی تھی کہ ان کو انٹرٹین کرے ـــ "ارے تم ادھر پاگل کا مافک کائے کو بیٹھیا؟ ـــ ڈانس نہیں بنائے گا ـــ؟" مسٹر زادیری نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں اس وقت ڈانس نہیں کروں گی۔" سلمیٰ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "اس وقت مجھے معاف کیجئے۔"

"ارے ارے ـــ ہم کو بولو ـــ کیا بات ہے۔ طبیعت کھراب ہے تمہارا ـــ؟" مسٹر زادیری نے اس بے تکلف لہجے میں دریافت کیا جس طرح لوگ اپنی بیویوں سے بات کرتے ہیں۔ سلمیٰ لرز اٹھی۔

"اچھا چلو۔ ادھر ٹیبل پہ تمہارا اکھا فرینڈ لوگ ویٹ کرتا ـــ" وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھی، ثریا باجی ـــ میں آپ سے کس بات کا شکوہ کر سکتی ہوں۔ میں خود ہار مان چکی ہوں۔

وہ مسٹر زادیری کے ہمراہ میزوں کی طرف چلی گئی۔ جہاں "بوفے" شروع ہو چکا تھا۔

رقص کے بعد جب ثریا چبوترے سے اتر کر لان میں آئی تو اسنے سلمیٰ کو ایک درخت کے نیچے مسٹر زادیری کے ساتھ صوفے پر بیٹھا دیکھا۔ وہ جس انداز سے سلمیٰ کو گھور رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ثریا کو درگا کنڈ کے نواب سکندر قلی خاں عرف نواب کبودیے کی آنکھیں نظر آئیں۔

دفعتاً ایک بھیانک دھماکہ ہوا اور سامنے کے اس رنگین سینما اسکوپ نظارے کے پرخچے اڑ گئے۔ سیاہ دھواں اور سرخ شرارے ساری فضا میں رقصاں تھے۔ بہت دور ایک مہیب جوالامکھی نے آگ اگلنا شروع کی۔ گرم گرم، دہکتا ہوا لاوا بہتا ہوا سارے میں پھیل گیا۔ آتش فشاں کی گڑگڑاہٹ، زلزلے کے دھماکوں، آرکیسٹرا کے سروں، راک این رول کے شور، قہقہوں اور

گلاسوں کی کھنکھناہٹ میں سے گزرتی ایک مدھم، اداس، خوبصورت آواز ثریا کے کانوں میں گونجی ۔۔۔ ماضی کی محلسرائیں جل کے راکھ ہوئیں مگر ابھی اس ملبے کی بنیادوں پر دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے۔ کل کے جاگیر دار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا ۔۔۔ کل کے جاگیر دار کی جگہ آج کا سرمایہ دار ۔۔۔

ثریا نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ بلجین کٹ گلاس کے فانوسوں سے جگمگاتا، اطالوی معمار کا بنایا ہوا، الٹرا ماڈرن جمشید ہاؤس نہیں تھا۔ یہ ضلع سلطان پور کے تعلقے درگا کنڈ کی نیم تاریک گڑھی تھی جس میں وہ خود بستی بیگم قید تھی۔ پھر درگا کنڈ کی گڑھی جمشید ہاؤس میں تبدیل ہو گئی۔ اس میں چھوٹی بٹیا قید تھیں۔ اسنے آنکھیں کھول کر پہچاننے کی کوشش کی، سامنے ہری گھاس پر جاپانی قندیلوں کے نیچے کون لوگ ٹہل رہے تھے۔ مسز زاہدی، مسز گھاسلیٹ والا۔ مسز برٹن۔ اسنے آنکھیں بند کیں، نواب چھبورے۔ میاں نوروز۔ منن خاں۔ اسنے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ نواب چھبورے۔ میاں نوروز۔ منن خاں ایک بار پھر مسز زاہدی مسز گھاسلیٹ والا اور مسز برٹن میں تبدیل ہو گئے۔ اسنے نظریں اوپر اٹھائیں۔ سامنے جمشید کھڑا تھا۔

"جانِ من ۔۔۔" اسنے سرور کے عالم میں کہا۔ "اس جامِ جمشید کا جام تو پی لو جس کا نام جمشید ہاؤس ہے ۔۔۔ یہ میرا جامِ جہاں نما ہے ۔۔۔" اسنے ہاتھ سے چاروں طرف اشارہ کر کے کہا ۔۔۔ "یہ میرا ساغرِ جم ہے ۔۔۔" اسنے گلاس اٹھایا اور دوسرا گلاس ثریا کو دیا۔

"چیرز ۔۔۔!"

"چیرز ۔۔۔"

پھر وہ ثریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر اسے ڈرائنگ روم کی سمت لے گیا۔ جس کے ایک گوشے میں بار کے اسٹولوں پر تین چار غیر ملکی اور دیسی بزنس مین چڑھے بیٹھے تھے۔ اور مسٹر پیڑک سیاہ پتلون، سفید کوٹ پہنے، سیاہ ٹائی لگائے بارمین کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جمشید ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اور ثریا کو نزدیک کے اسٹول پر بٹھال لیا۔

گلاسوں میں تیز شراب انڈیلتے ہوئے جمشید نے ان لوگوں سے کاروباری باتیں شروع کیں۔

"جمشید بھائی۔ تم ہمارے کو یہ بولو کر لندن آفس سے کیبل آ گیا یا نہیں ـــــ" سیٹھ عیسے بھائی موسے بھائی گھا سلیٹ والا نے جو ابھی ابھی بار پر آئے تھے۔ ذرا غرّا کر اسے مخاطب کیا۔

"ابھی نہیں آیا سیٹھ صاحب ـــ" جمشید نے بے پرواہی سے جواب دیا اور غیر ملکی تاجر کی طرف مڑا ـــ" ہاں تو جارج میں تم کو کیا بتا رہا تھا ـــ؟ ہاں۔ میں نے لندن سے درخواستیں منگوائی تھیں۔ ایک مسٹر ایس۔ ڈی۔ جانسن کا میں نے مانچسٹر آفس میں تقرر کر لیا ہے۔ مسٹر جانسن نے اپنی درخواست میں لکھا ہے کہ وہ انڈین سول سروس میں عرصے تک کلکٹر اور کمشنر وغیرہ رہ چکے ہیں۔ اور برصغیر سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ یقیناً وہ مانچسٹر برانچ کا کام اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ میں اپنی غیر ملکی شاخوں میں ہمیشہ وہاں کے ایسے آدمی ملازم رکھتا ہوں جو برصغیر کے معاملات سے اجنبی نہ ہوں۔"

"اپن کے تیاس کا جواب دو جمشید بھائی ـــ" سیٹھ عیسے بھائی موسے بھائی نے دوسرا گلاس چڑھا کر یک لخت بار کی چمکیلی سطح پر زور سے مکّہ مارا ـــ" اپن کا ڈیل اسٹیل کیا ہے کہ نہیں۔"

اب مسٹر زادیری بھی اندر آ کر باتوں میں شریک ہو گئے۔ ثریا اس کاروباری گفتگو سے اُکتا کر اسٹول پر سے اتری۔ دوسرے کونے میں ایک صوفے پر جا بیٹھی۔

دفعتاً بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ سیٹھ عیسے بھائی موسے بھائی نے گلاس فرش پر پٹخ کر جمشید کا گلا پکڑ لیا ـــ سالا ـــ تم نے ہم کو پانچ لاکھ کا دھوکا دیا ـــ ہم تمہارے اوپر کیس چلائیں گا ـــ"

"شٹ اپ عیسے بھائی یو اولڈ فول ـــ" جمشید نے گلا چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"یو شٹ اپ ـــ یو ڈرٹی بلیک مارکیٹیر ـــ" سیٹھ گھا سلیٹ والا گرجے۔

"اوہ ـــ فور گاڈز سیک ؎ ـــ" جارج نے انگلی اٹھا کر اُکتائی ہوئی آواز میں کہا۔

" سالا۔ تم خان برادرز سے ایگریمنٹ کرتا، اور ہم سے چار سو بیس کرتا ہے۔ ہم سے پانچ

؎ OH, FOR GOD'S SAKE

لاکھ کا فراڈ کرتا ــــ ہمارا اکھا بزنس میں لفڑا کرتا ہے ــــ ہمارے روکڑے میں گول مال کرتا ہے ــــ ہمارے ساتھ اتنا بڑا گھٹالا ڈالیں گا تو ہم تم پر سوٹ فائیل کریں گا ــــ ہمارا پانچ لاکھ کا نقصان کیا ــــ سالا، موالی ــــ چور ــــ بے ایمان ــــ" سیٹھ عیسیٰ بھائی نے نشے میں وحشت ہو کر جمشید کی ناک پر زور کا گھونسہ رسید کیا۔ اور ہاتھا پائی شروع کر دی۔ بار میں بیٹھے ہوئے باقی احباب بھی اس مار پیٹ میں خوشی خوشی شامل ہو گئے۔

چیخ و پکار سن کر سلمیٰ اندر آئی۔ مسٹر ہیبرٹ نے جلدی سے ڈرائنگ روم کے سارے دروازے اندر سے بند کر دیئے۔

ثریا نے ڈرائی مارٹینی کا جام تپائی پر رکھا اور آنکھیں نیم وا کر کے سلمیٰ پر نظر ڈالی ــــ "ہیلو ڈارلنگ سلمیٰ ڈیر ــــ" اس نے کہا۔

مسٹر ہیبرٹ نے سلمیٰ کے لئے شیری سے جام بھرا۔ وہ ثریا کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

ہاتھا پائی کرتے ہوئے معزز مہمانوں نے تین چار سرخوشی کے نعرے بلند کئے ــــ لیکن سیٹھ عیسیٰ بھائی موسے بھائی پر جنون سوار تھا۔ انہوں نے جمشید کو پیٹ بھر کے گھونسے مارے۔ جمشید قالین پر گر پڑا۔ کئی گلاس چھناکے سے ٹوٹے۔ جمشید کے چہرے اور ہتھیلیوں میں کرچیں چبھ گئیں۔ اور خون نکل آیا۔ ثریا اور سلمیٰ اطمینان سے کونے میں بیٹھی تماشہ دیکھتی رہیں۔

باہر چبوترے پر تقریباً سارے مہمان کسی تازہ ترین تیز رفتار جنوبی امریکن رقص میں مصروف تھے اور ڈانس بینڈ کے ڈرم زور زور سے بج رہے تھے۔ چند لمحوں بعد دھن تبدیل ہوئی اور ڈانس بینڈ نے افریقہ کے تاریک جنگلوں کی ایک تیز و تند، وحشی تال ڈرم پر بجانا شروع کی اور رقصاں جوڑے تالیاں بجا بجا کر فرش پر زور زور سے پیر پٹختے افریقی تال پر تیز تیز چکر کاٹنے اور اچھلنے کودنے لگے۔

اندر ڈرائنگ روم میں سیٹھ عیسیٰ بھائی بنکارا کئے ــــ "جھوٹا ــــ بے ایمان ــــ سالا ــــ چور ــــ" مسٹر ہیبرٹ نے اُن کا نشہ اُتارنے کے لئے پانی کا پورا جگ ان کے سر پر انڈیل دیا۔ سیٹھ عیسیٰ بھائی موسے بھائی فرش پر لمبے لمبے لیٹ کر ایک سانس میں دہراتے لگے ــــ "اکھا پانچ لاکھ روپیہ ــــ پانچ لاکھ روپیہ ــــ پانچ لاکھ روپیہ ــــ" مسٹر ہیبرٹ نے

بقیہ حضرات کے لئے تازہ گلاس بھرے۔ دفعتاً سیٹھ عیسے بھائی اٹھے اور چالاک بلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر جمشید کو پھر دبوچ لیا ــ "چور ــ" وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دھاڑے۔

"ثریا باجی ــ ثریا باجی مسٹر گھاسلیٹ والے نے چور پکڑا ہے ــ" سلمیٰ نے سرخوشی کے عالم میں کہا اور نازک سا قہقہہ لگایا۔

جمشید سیٹھ عیسے بھائی کی گرفت سے چھوٹ کر پھر فرش پر گر گیا۔ کچھ دیر کے لئے مکمل سناٹا چھا گیا۔ مسٹر زاہدی سیٹھ گھاسلیٹ والا کو کمرے سے باہر لے گئے۔ جمشید کہنیوں کے بل قالین پر سے اٹھا۔ رومال سے چہرے اور ہاتھوں کا خون صاف کیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل کتے کی طرح چلتا ہوا دونوں لڑکیوں کی طرف آیا۔ وہ بری طرح سسکیاں بھر کے رو رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سلمیٰ پر جھک کر بولا ــ "ہم چور نہیں ہیں ــ ثریا ــ اس کو بتادو ہم چور نہیں ہیں۔ اسکو بتادو جمشید دا چور نہیں ہے۔"

"یو آر میرلی ویری ڈرنک[1] مسٹر جمشید ــ" سلمیٰ نے بیزاری سے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

یکایک وہ گانے لگا ــ "آگیا لاگی۔ سنا رہن چل گیو رے۔"

ثریا نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور صوفے سے اٹھی اور سلمیٰ کی مدد سے لے جا کر اسے بڑے صوفے پر لٹا دیا۔ باقیماندہ مہمان بھی بار سے اٹھ کر جا چکے تھے مسٹر پیٹرک نے جھاڑن سے بار کی تر بتر سطح کو پونچھا اور باہر چلا گیا۔

جمشید نے صوفے پر پڑے پڑے ایک اور بہت پرانا تھیٹر کا گیت شروع کر دیا۔

"میں آفت کا پرکالہ ہوں۔
ناچ نچادوں دم بھر میں ــ آگ لگادوں دم بھر میں
حسن کا تاکا اسکو مارا۔ پو بارہ ہیں پو بارہ۔ پو بارہ ہیں پو بارہ۔ پو بارہ ہیں پو بارہ۔

---

[1] YOU ARE MERELY VERY DRUNK

— ہرے ہپ ہپ۔ ہرے ہپ ہپ ہپ ہپ ہپ —"

"شٹ اپ جمشید —" ثریا نے اسے سختی سے ڈانٹا اور جا کر دریچے کے نیچے رکھے ہوئے دیوان پر بیٹھ گئی۔

"یس سر — آل رائٹ سر —" جمشید نے اٹھ کر سیلوٹ کیا اور پھر دراز ہو گیا۔

مسٹر پیٹرک ڈاک کا پلندہ لے کر اندر آیا۔ "سر کیبل آیا ہے۔ شام کی ڈاک میں چٹاگانگ کے دو ضروری لیٹر ہیں۔ ذرا دیکھ لیجئے"

"گیٹ آوٹ"

"سر — خان برادرز کا اگریمنٹ — مسٹر جانسن کا کیبل — موسٹ ارجنٹ" مسٹر پیٹرک نے کہا۔

جمشید نے صوفے پر کھڑے ہو کر الاپنا شروع کر دیا۔

"یہ سکو سبز عجائب دکھائی شیریں نے — ادھر تو ہاتھوں میں مہندی لگائی شیریں نے

پھر اس طرف دل کو لگن میں آگ لگی

آگ لاگی سندر بن جل گیو رے"

سلمی ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔ اور گھٹنوں پر سر رکھے فرش کو تک رہی تھی۔ جمشید صوفے پر سے کود کے الاپتا ہوا اس کی طرف گیا۔

"گلال زلفوں میں ان کی پڑی تھا ہولی میں

تو لالہ بولا کہ مشک ختن میں آگ لگی"

اس نے سلمی کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سلمی نے غصے سے سر پیچھے ہٹا لیا۔ وہ اچک کر میز پر آ گئی۔ اور اس کے سامنے دوزانو بیٹھ کر لگاتار دہاڑتا چلا گیا۔

"یہ وصف تجھ ہی میں دیکھا نگار غصے میں

ہوا ہے چہرہ تیرا زرد یار غصے میں

تو بلبلوں نے بھی جانا چمن میں آگ لگی — ارے ہاں آگیا لاگی —"

"ڈو شٹ اپ پلیز —" سلمی نے تلملا کر کہا۔

جمشید نے ہوا میں ہاتھ لہرایا ــــ " دیگر ــــ

میں بھولی باتوں کا اسکے کروں بیاں کیا کیا
شتنز کو دیکھ کے کہتا ہے نوجواں میرا
عجب تماشہ ہے چرخ کہن میں آگ لگی

اجی ہاں آگ لگی ــــ"

"ثریا باجی ــــ" سلمیٰ نے میز پر سے اترتے ہوئے آواز دی۔ ثریا جو دیوان پر نیم دراز اونگھ رہی تھی اسنے ایک آنکھ کھولی۔

"پری بی ــــ مجھے سمجھاؤ کہ جانِ من تمہاری ثریا باجی کس طرح ہیں ــــ کیوں کہ ہیں ــــ کدھر تے ہیں ۔ ایٹ سیٹ ر۔ ایٹ سیٹ را ــــ" جمشید نے انگلی اٹھا کر سلمیٰ سے استفسار کیا۔

"سر ــــ" مسٹر ہیرک نے دوبارہ زبان کھولی ــــ "ڈاک دیکھ لیجئے"

"آل رائیٹ ــــ آل رٹ ــــ یو بلیک مین ۔ کالٹیبن آدمی ۔ ہمارے غلام کے چلام کے تلام ، نوکر کے چوکر ، مرتی کے ادسار ، مسٹر ایس ۔ ڈی ۔ جانسن صاحب بہادر آئی سی ایس رٹیائرڈ کا کیبل مارو ــــ اور دیکھو ــــ اگر تم نے ہمارا ٹائم زیاستی خراب کیا تو ہم تمہارا اتنا ٹھکائی کرے گا ۔ اتنا ٹھکائی کرے گا کہ تم افسوس کرے گا کہ تم پیدا ہوا تھا ــــ" یہ کہہ کر اسنے کاروباری خطوط کے لفافے کھولے ۔ مسٹر ہیرک نے جلدی سے فاؤنٹن پن حاضر کیا ۔ اس نے خطوں پر سرسری نظر دوڑائی ۔ آنکھ بند کر کے ایک فارم پر دستخط کئے ۔ اور کاغذات تالین پر پھینک دیئے مسٹر ہیرک نے لپک کر انہیں اٹھایا اور ایک اور لفافہ پیش کیا جس پر ہندوستان کے ٹکٹ اور مہر تھی ۔ اسکے بعد مسٹر ہیرک باہر چلا گیا ۔ جمشید نے اسی طرح بہکتے ہوئے لفافہ کھولا اور خط پر نظر ڈالی ۔ پھر اسکی تیوری پر بل پڑے اور اسنے آنکھیں پوری طرح کھول کر پڑھنا شروع کیا ۔

باسمہٖ سبحانہ

متصل درگاہ شریف ۔ موضع محمد گنج ۔ تحصیل بہروئی
ضلع سلطان پور ۔ یو ۔ پی ۔ مورخہ ۱۴ ؍ جون ۱۹۶۱ء
برخوردار سعادت آثار نور چشمی جمشید میاں سلمہٗ تعالیٰ

واضح ہو کہ بتاریخ ۱۱ جون بروز جمعہ بوقت دس بجے شب نورِ چشمی منظور النساء سلمہا بعارضہ
تپ محرقہ راہی ملک عدم ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ کو خانقاہ شریف کے
قبرستان میں بھائی صاحب جنت آرام گاہ نور مرقدہ کے متبرک پہلو میں دفن کیا گیا۔
مرحومہ نے مرتے وقت تمہیں معاف کیا۔ تمہارا خدا بھی تمہیں معاف فرماوے۔

فقط

دعاگو

تمہارا چچا سید مظہر علی عفی عنہ

شبیر نے خط مٹھی میں زور سے بھینچا اور کاغذ کو توڑنا مروڑنا شروع کر دیا۔ دوبارہ
پڑھا اور ساکت و صامت ہو کر بیٹھ گیا۔

ثریا اور سلمیٰ بہت دور کونے میں کشنوں کے سہارے دلہن پر آڑی ترچھی لیٹی ہاتھوں پہ سر
رکھے سو چکی تھیں۔ باہر رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی تھی۔
کمرے میں قبرستان کی خاموشی سرسرانے لگی۔ سنسان خانقاہ کے سارے کواڑ ہوا
کے زور سے کھل گئے۔ اور کھڑکھڑانے لگے ـــ ارے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو اتنی لمبی
مہلت عطا کرتا ہے ـــ صبر کی جائداد ـــ صبر کی جائداد ـــ بڑے ابا نے
بیٹھ کر بارہ کی گنتی سمیٹی اور اپنے خالی حجرے میں سے جھانکا ـــ کھڑاؤں پہنے
کھٹ کھٹ کرتے۔ سیڑھیاں اتر کر دوبارہ اپنی قبر میں جا گھسے۔ ہوا روئی کے
بیں زور زور سے سنڈلانے لگی۔ بہت سرد ہوا تھی اور لو کے چلتے ہوئے
ں بدیل ہو گئی ـــ شائیں شائیں شائیں شائیں زو ڈو ڈوں ـــ گھوں گھوں
ہوں بھڑ کے کی بارش شروع ہو گئی اور کچی قبر پانی میں بھیگنے لگی ـــ بادل چھٹ
نکل آیا ـــ سرخ آسمان پر سورج بھی ڈوب رہا تھا۔ اور چاند بھی نکل
گن کی قبر ہے جیسے رات کو چنبیلی ایسی مہکتی ہے ـــ بکریاں ہنکاتی ہوئی چرواہن
نے زور سے سسکی بھری۔

"ولا شاہ اب تک نہیں اترا؟" ثریا نے آنکھ کھول کر استہزا سے دریافت کیا

اور پھر سو گئی۔

عابد انصاری تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا پھولی ہوئی سانس کے ساتھ لاؤنج میں آیا۔

"۔۔۔ منصور ۔۔۔ منصور ۔۔۔" اسنے آواز دی۔

منصور ایک ہاتھ میں شراب کا گلاس لئے دوسرے میں ریسیور اٹھائے ٹیلی فون پر جھکا ہوا تھا۔ عابد نے اسکے قریب جاکر چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا "۔۔۔ منصور ۔۔۔ قیامت گذر گئی ۔۔۔"

منصور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ریسیور کو ہاتھ سے چھپا کر آہستگی سے جواب دیا۔

"۔۔۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے ۔۔۔" اسنے ریسیور ایک منٹ کے لئے تھامے رکھا پھر فون پر رکھ دیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔

لاؤنج خالی پڑی تھی۔ عابد ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔

"بیکار ہے ۔۔۔" منصور نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"پولس کا اصرار ہے اسنے خودکشی کی، اور جیل کے حکام کا بیان ہے کہ پولس نے اسے تھرڈ ڈگری ۔۔۔" عابد نے چونکتے ہوکر چاروں طرف دیکھا اور فوراً چپ ہو گیا۔ ڈرائنگ روم کے دریچے کا پٹ آہستہ سے کھلا۔

لاؤنج میں باتوں کی آواز سے ڈرائنگ روم کے اندر دیوان پر پڑی ہوئی ثریا کی آنکھ کھل گئی ۔۔۔ اسنے دریچے کا پٹ کھول کر باہر جھانکا "۔۔۔ ہلو ۔۔۔ منصور ۔۔۔ عابد ۔۔۔ یو سو اینڈ سو ۔۔۔ تم لوگ کیا مسکوٹ کر رہے ہو ۔۔۔" اتنا کہہ کر اسنے پٹ بند کئے اور کشنوں پر گر کر دوبارہ سو گئی۔

لاؤنج میں وہ دونوں فریسکو کے نیچے فرش پر پندرہ۱۵ بیس۲۰ منٹ تک بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔

بہت دیر بعد منصور نے آہستہ آہستہ کہا ۔۔۔

"جان بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھئے"

عابد نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔ "میں پریس جاتا ہوں ۔۔۔"

"اس خبر کی اشاعت پر چوبیس گھنٹے کی پابندی ہے۔ بیٹھ جاؤ" منصور نے جواب دیا۔ اور ہاتھ پکڑ کر اسے فرش پر بٹھا دیا۔ اور قریب کی میز پر رکھی ہوئی تند شراب کی بوتل گلاس میں انڈیلی۔ اور ایک دفعہ میں گلاس ختم کر دیا۔ عابد نے دوسرا گلاس بھر کے پینا شروع کیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

"میں جاتا ہوں ۔۔۔" اسنے دوبارہ کہا ۔۔۔ "یہ میرا بہت بڑا اسکوپ ہے"

منصور نے سر جھکا کر شراب کے بلبلوں کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولا ۔۔۔ "یہ ۔۔۔ میرا اسکوپ ۔۔۔ جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے!"

"یہ رات ۔۔۔ یہ رات ۔ اس درد کا شجر ہے ۔۔۔" عابد نے بھوں بھوں کر کے روتے ہوئے گرہ لگائی اور فریسکو سے ٹیک لگا کر ایک ہچکی لی۔

دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ عابد نے دوسرا گلاس چڑھایا ۔۔۔ "ہم جو تاریک راہوں میں" اسنے ایک اور ہچکی لی ۔۔۔ "واہ فیض احمد فیض گریٹ مین دی لالٹین ۔۔۔ زندہ باد ۔۔۔ مارے گئے ۔۔۔"

"زندہ باد چیرز ۔۔۔ تمہارا جام صحت ۔۔۔ وعلیکم السلام" منصور نے کھڑے ہو کر کہا اور پھر بیٹھ گیا۔ ایک بار خاموشی چھا گئی ۔ اندر سریلے کلاک نے کُکو کُکو کُکو کرنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹہ اور گذر گیا۔

"کس نے ۔۔۔" منصور نے سوال کرنا چاہا۔ مگر چاروں طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"کس نے ۔۔۔ ؟" عابد نے ہچکی لے کر پوچھا۔

"یہ کس نے ۔۔۔ یہ ۔۔۔" منصور نے تھوڑی دیر بعد دہرایا۔

"یہ کس نے ۔۔۔ لاش پھینک دی ۔۔۔ جوانیوں کی ۔۔۔ راہ میں ؟" عابد نے کہا۔

"ابھی گذر رہے تھے ہم جو ارزم گاہ میں ۔۔۔ یہ ۔۔۔" منصور نے کہا۔

چند یوروبین لڑکیاں اپنے سرسراتے ہوئے ایوننگ گاؤن ٹخنوں تک اٹھائے کھلکھلا کر ہنستی ہوئی سامنے سے گذر کر عالیہ کے ڈریسنگ روم کی سمت چلی گئیں۔

"یہ جور و ظلم کی کلائیاں مروڑ کر نکل پڑا —" عابد نے کہا۔

"اندھیری رات تھی — برج — مگر یہ چل پڑا —" منصور نے کہا۔

"مگر یسوع کی لاش تھی کہ بیڑیاں پڑی ہیں اب بھی پاؤں میں —" منصور نے کہا۔

"جیل کے حکام کا بیان ہے کہ اس کی ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی گئیں — برج —" عابد نے کہا۔

بیرہ چھلکتے ہوئے سرخ پیمانوں سے جھلملاتی روپہلی کشتی اٹھائے ان کے قریب آیا۔ دونوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیرے نے ان کے خالی گلاس کشتی میں رکھے اور نئے گلاس انکے ہاتھ میں تھمائے اور آگے چلا گیا۔

"اے خداوند تعالیٰ تو عاشق کو صبر کی اتنی ہی لمبی جاندا دعطا کرتا ہے —" ڈرائنگ روم میں سے جمشید کی آواز آئی جو صوفے پر کھڑا ہوا میں ہاتھ لہرا رہا تھا۔

یہ شامِ غم کا عکس تھا۔ یہ ایک اشتباہ تھا — یہ روندنے کی چیز کیوں بنے امانتِ زمیں،" منصور نے کہا اور جام خالی کر دیا —" بتاؤ مسٹر عابد انصاری — کیوں بنے امانتِ زمیں — ؟ نہیں نہیں — بڑھے چلو۔ کچل بھی دو —" اسنے انگلی اٹھا کر کہا —" کچل بھی دو — برج۔ خزاں کا غنچہ ہے یہ لاش۔ یہ موت کا مجسمہ ڈرا رہا ہے دیر سے۔ لہو میں تر بتر ہے سر سے پاؤں تک — جمے ہوئے لہو میں ہے مرے ہی خون کی مہک —"

"مہک، اسنے اتنے زور سے گرج کر کہا کہ عابد اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس سے زیادہ گرج کر بولا۔

"یہ میرا اسکوپ ہے۔ میں کہے دیتا ہوں۔ یہ میرے کریر کا سب سے بڑا اسکوپ ہے۔" وہ لاؤنج سے نیچے کیاریوں میں پھلانگا۔ اور گھاس کے قطعہ پر سے لڑکھڑاتا، دوڑتا، کرسیوں سے ٹکراتا، جہاں اب اکا دکا مہمان ادھر ادھر نشے میں لڑھک رہے تھے، وہ تیزی سے پھاٹک تک پہونچا اور ثریا کی نیلی فوکس ویگن میں بیٹھ کر زناٹے سے اپنے اخبار کے دفتر

کی سمت روانہ ہو گیا۔

منصور نے اسے جاتے دیکھا اور سر ہلا کر کہا ۔۔۔ "عابد میاں۔ میں تمہارے آنے سے پہلے ہی اپنے اخبار کو فون کر چکا ہوں ۔۔۔" اسکے بعد اسنے کیاری میں چھلانگ لگائی اور سر جھکائے کیکڑے کی طرح ترچھا ترچھا چلتا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ثریا نے جاگ کر آنکھیں ملیں۔ اور سلمیٰ کا بازو ہلایا ۔" اٹھو سلمیٰ ۔۔۔ کیا رات بھر یہیں سونے کا ارادہ ہے ؟"

"ہمیں سونے دیجئے ثریا باجی ۔۔۔ ہم بہت تھک گئے ہیں" سلمیٰ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔

جمشید صوفے پر سے کود کر لڑکھڑاتا ہوا لڑکیوں کی طرف آیا۔ اور سلمیٰ کے چہرے پر اپنا چہرہ رکھ کر پوچھا ۔۔۔" پری بی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ جان من تمہاری ثریا باجی کس طرح ہیں۔ کیونکر ہیں ۔۔۔ کدھرے ہیں ۔۔۔ ایں ؟"

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور جمشید کو پوری قوت سے پیچھے ڈھکیلتے ہوئے اس نے کلیجنت شدید کراہت کے ساتھ کہا ۔۔۔" کیپ اوے یو ڈرٹی ڈوگ[1] ۔۔۔"

"کیا کہا پری بی ۔۔۔ ؟ میں ڈرٹی ڈوگ ہوں ؟ اور تم ۔۔۔ ؟ تم کیا ہو ۔۔۔ ؟ یو ڈرٹی بلڈی بچ[2] ۔۔۔"

ثریا آگ بگولہ ہو کر اٹھی ۔ اس نے جمشید کے منہ پر اپنی پوری طاقت سے ایک طمانچہ رسید کیا۔

"جمشید علی سید، تم کتنے ہی نشے میں کیوں نہ ہو ۔۔۔ مگر تم نے میرے سامنے چھوٹی

---

[1] KEEP AWAY, YOU DIRTY DOG

[2] YOU DIRTY BLOODY BITCH

بیٹیا کی توہین کی تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گی۔ تمہارا خون کر دوں گی —"

"آہاہاہا۔ اوہو ہو ہو۔ یک نہ شد دو شد۔ چھوٹی بیٹیا —! یہ آپ کی چھوٹی بیٹیا ہیں۔ آپ ان کی اماں جان ہیں۔ والدہ محترمہ۔ چہ خوش حیرانی بود — چھیر چھینیں بودی۔ آج کی رات بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں ہم پر — چودہ طبق روشن شد — " پھر اسنے زور کی تان لگائی — آج کی رات — آج کی رات — ساز درد نہ چھیڑ — " اور دیوان کے قریب قالین پر دھم سے بیٹھ گیا۔

سلمیٰ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ ثریا سے لپٹ گئی — جیسے اس کی پناہ لینی ہو۔

ثریا دفعتاً ہوش میں آگئی اور اس نے آہستہ سے جمشید کو مخاطب کیا "جمشید سلمیٰ تمہارے دفتر میں چار مہینے سے کام کر رہی ہے۔ اور تم کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے اور کس کی بیٹی ہے؟"

"مجھے موصوفہ کا شجرہ نسب اور صحیح شیبٹ معلوم کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں — ان کے ذاتی فائیل سے میرا وزیر با تدبیر مسٹر پیٹرک ڈیل کرتا ہے — مجھے صرف اس سے غرض ہے کہ یہ میری نوکر ہیں اور میرے کلائنٹس کی محبوبہ دلنواز — مس چھپن چھری — ارے — " اسنے پھر الاپنا شروع کیا — " ارے ایسے تو جگ میں جوان کوئی ہوئیہو نا — ارے دس گناہ آگے — دس گناہ پیچھے — ایسے تو —"

ثریا غیظ سے بے قابو ہو کر تین چار تھپڑ اسے اور لگائے۔ اس نے بازو چہرے کے سامنے کر کے ثریا کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔ سلمیٰ نے لرزتے ہوئے ثریا کو اپنی طرف کھینچا — " ثریا باجی — خدا کے لئے — ثریا باجی —"

ثریا چیتے کی طرح جلتی ہوئی پھر جمشید کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی " ہاں جمشید علی سید آج کی رات، یقیناً انکشافات کی رات ہے —"

وہ ثریا کے تیور دیکھ کر بے طرح خوف زدہ ہو گیا — " ڈارلنگ ہمیں مارو نہیں — ہمیں ڈانٹو نہیں — " اسنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

پنجرے میں مقید شیرنی کی مانند چاروں طرف گھوم گھوم کر ثریا نے کہنا شروع کیا۔

"جمشید علی سید — آج پہلی مرتبہ میری ملاقات کھانے کے میز پر تمہارے والد صاحب سے ہوئی — اور میں نے ان کو فوراً پہچان لیا — محمد گنج میں وہ ابا سے ملنے ہمارے گھر اکثر آیا کرتے تھے —"

جمشید کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا — "جمشید ڈارلنگ — میں کسی تعلقہ دار کی صاحبزادی نہیں ہوں۔ میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ہے۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی ہے — میں سید زوار حسین مرحوم، سوز خواں و کاشتکار، موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کی لڑکی ہوں۔ تم کان پور کے کسی "مشہور ایڈوکیٹ" کے بیٹے نہیں ہو تم سید مظہر علی، کاشتکار موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول، دہرہ دون میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے — تم اور میں — ہم دونوں اپنے پبلک ریلیشنز ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں — زندہ باد منصور احمد خاں — میرا حلق خشک ہو گیا ہے —" وہ فرش پر بیٹھ گئی۔

جمشید خاموشی سے اٹھا اور بار پر سے دو گلاس بنا لیا۔

"آؤ — ہم دونوں اپنے عزیز "پریس ایجنٹ" منصور احمد خاں کا جام صحت پئیں —" ثریا نے بڑی سنجیدگی سے اپنا گلاس جمشید کے گلاس سے ٹکرایا۔ جمشید نے وحشت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔

بوٹا بیگم آتو جی کی لڑکی — بسنتی بیگم —

وہ کہتی رہی — "تمہارے چچا ابا سید مظہر علی نے سر پہ کفن باندھ کر اپنی آقا نواب شمس آرا بیگم — کے خلاف گواہی دی تھی اور مجھے میاں نوروز کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ وہ میرے محافظ فرشتے تھے۔ وہ تمہارے بھی محافظ فرشتے تھے۔ مگر تم نے ان کو کبھی نہ پہچانا۔ اور ان کی قدر نہ کی۔

"... بیٹیا کے بابا مرزا قمر الدین احمد نے مجھے آسرا دیا تھا۔ وہ بھی نیکی کر کے دریا میں ڈالنے کے قائل تھے۔ وہ میرے دوسرے محافظ فرشتے تھے۔ میرا تیسرا محافظ فرشتہ"

وہ کہتے کہتے یکلخت رُک گئی۔ چند لمحوں بعد اسنے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بات دوبارہ شروع کی ـــــ میرا سب سے بڑا محافظ فرشتہ منصور احمد خاں ہے۔ اور میری آخری جائے پناہ سوئیزرلینڈ کے وہ بنک ہیں۔ جن میں تمہاری دولت جمع ہے۔ آؤ ـــــ تمہارے سولٹیس کا ونٹ کا جام پئیں ـــــ" اسنے گلاس دوبارہ ٹکرایا۔ اسنے دو سال پیرس میں رہ کے کبھی اتنی شراب نہ پی تھی۔ جتنی وہ شام سے لے کر اب تک پی چکی تھی۔

جمشید نے دہشت زدہ ہو کر سلمیٰ کو دیکھا جو بچوں کی طرح ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اپنی آنکھیں مل رہی تھی۔ اور ثریا کی ساری کا آنچل پکڑے اسکی آڑ میں دبکی اور سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔

کہر آلود آم کے باغ میں گرم، روشن خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی بچی نے چھتری سنبھال کر چھوٹی سی آواز میں "تھینک یو" کہا ـــــ

کمرے میں لرزہ خیز سکوت طاری تھا۔ دونوں آشفتہ حال، بے سہارا لڑکیاں محمد گنج کے مندر کی سیتا کی مورتیوں کے مانند اسکے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے سامنے دوزانو جھک گیا اور اسنے آہستہ آہستہ کہا۔

"میری منظوریا نے مرنے سے پہلے مجھے معاف کر دیا۔ ثریا ـ سلمیٰ ـ تم دونوں بھی مجھے معاف کر دو۔"

"کے سیرا ـــــ کے سیرا ـــــ" دوسری منزل سے نغمے کی آواز بلند ہوئی ـــــ اور رات کے گہرے سناٹے میں گونجی۔ اوپر ابھی پارٹی جاری تھی۔ اور فیری کے کسی بوائے فرینڈ نے ریڈیو گرام پر ڈورس ڈے کا ریکارڈ لگا دیا تھا۔

ـلـہ "جو کچھ ہونا ہے وہ ہوگا۔ ہم مستقبل کو نہیں دیکھ سکتے ـــــ"

جمشید دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور زینے میں جا کر بے حد زور سے دھاڑا ۔۔۔ "اری او زعفتیا ۔۔۔ باجا بند کر ۔۔۔" وہ اس زور سے چیخا کر سارے جمشید ہاؤس میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ نیری نے گھبرا کر اوپر سے جھانکا اور ڈیڈی کی آواز اور اس لہجے سے بے حد متعجب ہوئی۔ ڈیڈی نے آج تک اسے اس گنوارو نام سے نہیں پکارا تھا۔

وہ پھر آکر فرش پر بیٹھ گیا۔

شیلف کلاک نے رات کا دو بجایا۔

ثریا نے آنکھیں میچ لیں۔ اور چپکے چپکے کہا ۔۔ "سلمان ۔۔۔ سلمان ۔۔۔ تم بھی مجھے معاف کر دو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو جس حالت میں بھی ہو ۔ مجھے معاف کر دو ۔۔۔ مجھے معاف کر دو ۔۔۔ مجھے اس طرح نہ مرنے دو ۔۔۔ سلمان ۔۔۔"

کمرے میں ایک بار پھر قبرستان کی خاموشی سنسنانے لگی۔

جمشید ہاتھوں میں سر پکڑے اسی طرح بیٹھا رہا جیسے وہ گورکن ہو اور بہت سی میتیں دفن کر کے اب سستا رہا ہو ۔۔۔ "اگیا لاگی سندر بن جل گیو رے' ۔۔۔" اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں دہرایا۔ اور گلاس کی باقیماندہ شراب ختم کرنے کے بعد اپنی آنکھوں پر ہتھیلی پھیری اور پھر بڑی دلدوز نیچی آواز میں آہستہ آہستہ الاپنا شروع کیا۔

جلی ہے لاش مری آتش جدائی میں
مدد کو پہنچ صنم اب کفن میں آگ لگی

۔۔۔ پھر اس نے کہا ۔۔ "ستی بیگم۔ تمہیں ہمارے گاؤں کا جیالی بھانڈ یاد ہے جو یہ خمسہ گایا کرتا تھا ۔۔۔؟"

ثریا اسکے نزدیک آکر دوزانو بیٹھ گئی اور آواز ملانے لگی ۔۔ "مدد کو پہنچ صنم اب کفن میں آگ لگی۔" کچھ دیر بعد ثریا نے یک بیک چیخ کر دہرایا۔

پھر وہ دونوں یک لخت چپ ہو گئے۔ سلمیٰ خاموشی سے سر جھکائے قالین کو تکتی رہی۔

ثریا نے ایک سانس میں متواتر دہرانا شروع کیا ۔۔۔ "پل نہ لاگیں موری انکھیاں پیو بِن پل نہ لاگیں موری انکھیاں۔ پیو بِن پل نہ لاگیں پل نہ لاگیں پل نہ ۔۔۔" سلمیٰ نے گھبرا کر اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھا ــ" ثریا باجی ــ ثریا باجی ــ لیٹ جایئے ــ پانی پی لیجئے ــ"

"نہیں بالکل ٹھیک ہوں چھوٹی بیٹیا ــ" اسنے جواب دیا۔ اور ساری کے آنچل سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ پونچھا۔ مگر آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے اُمڈا کیا۔ پھر وہ دھیرے سے بولی: "جمشید ــ مجھے بھی حیپا آتی بھانڈ کا ایک گانا یاد ہے۔ سناؤں ــ؟" پھر اسنے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی آواز میں کہا ــ" دن کو آ سکتے نہ تھے ــ آنے کو کیا رُت نہ تھی ــ تمہاری پاؤں میں نہ تھی ــ آپ کے برسات نہ تھی ــ کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی ــ سچ تو کہئے کہ منظور ملاقات نہ تھی ــ منظور ملاقات نہ تھی ــ" پھر دفعتاً وہ بالکل خاموش ہو گئی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

وہ تینوں شکستہ جاموں، بکھری ہوئی بوتلوں، فرش پر بہتی ہوئی شراب اور ٹوٹی ہوئی بیاہیوں کے انبار پر اس طرح سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے دنیا کا خاتمہ ہو چکا ہے اور وہ جلے ہوئے کرہ زمین کے آخری جاندار ہیں۔

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سیٹھ جیسے بھائی موسے بھائی گھاسلیٹ والا اندر داخل ہوئے اور انہوں نے آگے بڑھ کر ایک اسٹامپ پیپر جمشید کی ناک کے سامنے لہرایا۔

"چٹا گانگ سے ٹرنک کال آگیا ہے زمشید بھائی۔ ادھر سائین کر دو۔ ہم کو گھر جانے کا ہے ــ"

جمشید نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ آنکھیں ملیں اور اسے رفتہ رفتہ یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسنے آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنے آپ پر نظر ڈالی ــ اور اسے یاد آگیا کہ وہ خود کون ہے ــ وہ مشہور بزنس میگنیٹ جمشید علی سید تھا۔ آج شام اس کی شاندار کوٹھی کی "ہاؤس وارمنگ" ہوئی تھی۔ یہ کوٹھی اسنے ساڑھے چار لاکھ میں بنوائی تھی۔ اسکے سارے کمرے ایر کنڈیشنڈ تھے۔ جو ایک دوسرے سے ہاؤس ٹیلی فون کے ذریعے منسلک تھے۔ شہر کے خوش پوش ترین جوانوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔ اور اعلیٰ طبقے کی

ہندوستانی بیاہی لڑکیاں "بیگم جمشید" کہلانے کی متمنی تھیں۔ آج صبح اسنے دس لاکھ کا ایک معاملہ طے کیا تھا۔ اور اس کے لئے مسٹر جانسن کے کیبل کا اسے جواب دینا تھا۔ اسکے بعد جاپان کا ٹرنک کال کرنا تھی ـــــ اور اسکے بعد نئے معاہدے کے سلسلے میں ایک جرمن فرم سے گفت و شنید کے لئے کل تیسرے پہر کو یوروپ روانہ ہونا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ سگریٹ جلایا ـــــ اور مسٹر گھاسلیٹ والا کے ساتھ اپنے آفس روم کی طرف چلا گیا۔

اب صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مسٹر ہیرٹک ڈرائنگ روم میں آئے اور انہوں نے سلمیٰ کو مخاطب کیا ـــــ "مس مرزا ـــــ بوس وانٹس یو ـــــ"

سلمیٰ قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی آفس روم میں گئی۔

"مس مرزا ـــــ"

"یس سر ـــــ"

"آپ کو اتوار کے دن بھی زحمت دینی پڑ رہی ہے۔ کل نو بجے صبح مسٹر ونکاکس اور ان کا گروپ بی او اے سی سے آ رہا ہے۔ ساڑھے نو بجے وہ دونوں جاپانی پہنچ جائیں گے۔ صبح کو ایرپورٹ ہی جائیے۔ ان لوگوں کے لئے میٹروپول میں کمرے بک کروا دیجئے اور دوپہر کو لنچ کھلا دیجئے۔"

بوس نے نظریں نیچی کئے ہوئے اس سے کہا ـــــ "میں خود نہ آسکوں گا کیونکہ کل روانگی کرنے سے پہلے مجھے بہت سے کام نپٹانے ہیں۔ کل دس بجے تک میٹروپول پہونچ جاؤں گا۔"

"یس سر"۔ سلمیٰ نے سیدھی کھڑی ہو کر نارمل اور باہمت آواز میں جواب دیا۔ "گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ ـــــ مسٹر ہیرٹک ـــــ قادر بخش کو بولو مس صاحب کو گھر پہونچا دے ـــــ"

سلمیٰ کمرے سے باہر چلی گئی۔
مسٹر پیٹرک پھر ڈرائنگ روم میں گئے۔
"مس حسین ___ مسٹر سید نے بلایا ہے ___"
ثریا قالین پر سے اٹھی۔ بیگ میں سے آئینہ نکال کر چہرہ صاف کیا اور مضبوط قدم رکھتی
آفس میں گئی۔
"ثریا ___" جمشید سید نے نظریں اٹھائے بغیر کہا ___ "شام کو تمہارا ٹکٹ بھی آگیا ہے۔
گھر جاکر پیکنگ کر لو ___ کل ڈھائی بجے ایرپورٹ آجانا ___ ابھی پیرس سے کیبل آیا ہے۔
تمہاری نمائش کا انہوں نے ۱۸ر جولائی سے انتظام کیا ہے ___ اتنا عرصہ ہم لوگ جینوا میں رہ سکیں
گے ___ اچھا کل ملاقات ہوگی ___ گڈ نائٹ ثریا ___"
"گڈ نائیٹ ___" وہ بھی باہر چلی گئی۔ مگر چند منٹ بعد اس نے واپس آکر کہا ___ "میری
کار غائب ہے ___ شاید منصور یا عابد لے گئے ___"
"مسٹر پیٹرک ___ فتح گل کو بولو عالیہ بی بی کی کار میں مس صاحب کو گھر پہونچا دے ___"
"یس سر ___"

اگلے روز غیر ملکی مہمانوں سے نپٹ چکنے کے بعد سلمیٰ نے میٹروپول کی دو کانوں سے بہت
سا سامان خریدا۔ قیمتی چاکلیٹ، ٹافی، بسکٹوں کے ڈبے۔ خشک میوہ۔ شیرے میں ڈوبے
ہوئے پھلوں کے ٹین۔ تھری کاسلز سگریٹ کا پورا کارٹن۔ ایکو اویلوا اور شیمپو کی شیشیاں۔
بڑھیا لنسم کا شیونگ سوپ۔ ٹوتھ پیسٹ۔ بک اسٹال سے بہت سی پیپر بیک کتابیں
اور تازہ رسالے اٹھائے۔ اور گھر آگئی۔ ماما کو ایک ایک چیز دکھائی اور رات کے کھانے کے
بعد سارے سامان کا بڑا سا پارسل بنایا۔ پارسل کو سرہانے رکھا اور اس پر ہاتھ رکھ کر
سو گئی۔
ایک صاحب کے ذریعے وہ ہر پندرھویں روز ایک پارسل سلمان کو بھجوایا کرتی تھی۔

وہ صاحب گھر سے لے جایا کرتے تھے۔ مگر پچھلی مرتبہ انہوں نے کہا تھا کہ اس دفعہ وہ خود نہ آ سکیں گے اور سلمیٰ نے ان سے کہا تھا کہ پیر کی صبح کو وہ سامان خود ان کے پاس پہونچا دیگی۔"
صبح کو وہ پارسل دفتر لیتی گئی۔ اور اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان صاحب کا فون نمبر دیکھنے کے لئے ٹیلی فون ڈائرکٹری کھولی ــــ اتنے میں مسٹر ہبرٹ اندر آئے اور انہوں نے ایک لفافہ سلمیٰ کو دیا ــــ "بوس کا خط ــــ" انہوں نے کہا اور باہر چلے گئے۔ مس ڈی سوزا آئیں۔ چند کاغذات کرسی پر رکھے اور چلی گئیں ــــ اسنے کھڑکی میں جاکر لفافہ کھولا ــــ

"چھوٹی بٹیا ــــ پرسوں رات انتہائی نشے اور نیم دیوانگی کے عالم میں میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی اس کے لئے صدق دل سے معافی کا خواستگار ہوں اور جانتا ہوں کہ معاف کئے جانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ میری رذالت کے باوجود اس کے بعد آپ نے اسی تمکنت اور بردباری سے میرے "حکم" کی تعمیل کی اور آج حسب معمول میرے لئے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ پرسوں رات جب میں نے دفتر کی میز پر بیٹھ کر آپ سے ایرپورٹ اور میٹرو پول جانے کے لئے کہا تھا اس وقت میں آپ کے متعلق ایک اہم فیصلہ کرچکا تھا۔

وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملازمت کے لئے جو آپ کے وقار اور شرافت کے سراسر منافی ہے۔ اور آپ کی شخصیت کی توہین ہے، میں آپ کو مزید زحمت نہیں دے سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا لکھوں اور کن الفاظ میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے۔ اور جو کچھ میں کہنے والا ہوں اپنے میں جرأت نہیں پاتا ہوں، اور ان مناسب الفاظ کا متلاشی ہوں جن کے ذریعے آپ کے معصوم اور دکھی دل کو ٹھیس لگائے بغیر اپنا مافی الضمیر ادا کرسکوں۔

چھوٹی بٹیا، پرسوں رات میں نے بہت سے پوشیدہ ڈھانچے اپنی الماری میں سے نکالے، ان کو جھاڑا پونچھا اور انہیں الماری میں دوبارہ مقفل کر دیا۔ میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبا دیا۔ اور آج میں وہی جمشید مسیدہوں جس سے آپ پچھلے چار مہینے سے

واقف ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک انتہائی ذلیل۔ بے رحم۔ خود غرض
کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جسکے لئے کسی قسم
کی پرانی اقدار، شرافت، اصول پرستی وغیرہ وغیرہ کے تصورات لایعنی ہو چکے ہیں
لیکن پرسوں رات جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مرزا صاحب کی صاحبزادی ہیں
تو میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اس اطلاع سے دوسرا ذہنی جھٹکا جو مجھے
لگا اس کا تعلق سراسر میری کاروباری حس اور میرے کمینے پن اور کامن سنس
سے ہے ـــ وہ ذہنی جھٹکا یہ تھا کہ آپ نہ صرف مرزا صاحب کی صاحبزادی
ہیں بلکہ اپنے بھائی کی بہن بھی ہیں۔

چھوٹی بٹیا آپ کو اب معلوم ہو گیا ہے کہ میں ایک سیلف میڈ انسان ہوں
اور میری زندگی کا سب سے بڑا مطمح نظر میرا ذاتی مفاد ہے۔ آپ یہ بھی جانتی ہیں
کہ میرا کاروبار خصوصیت سے کس غیر ملکی قوم کے ساتھ ہے۔ جب انہیں یہ معلوم ہو
کہ میری کانفیڈنشل سکرٹری کس شخص کی سگی بہن ہے تو آپ خود اندازہ کر لیجئے
اس کا اثر میرے کاروبار کے لئے کس قدر تباہ کن ہوگا۔

چھوٹی بٹیا ـــ میں در پردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت کروں
گا۔ اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوا دوں گا۔ آپ کی اور
آپ کی والدہ صاحبہ بگڑ دکی خدمت میرا فرض اولین ہے ـــ بٹیا ـــ اب
میں آپ کے "بزرگ" کی حیثیت سے چند پند و نصائح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ
کو معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا بڑی ذلیل جگہ ہے۔ میں بھی دنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ
کے بھائی نے دنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے
مجھے یقین ہے، اور امید ہے کہ بہت جلد اسے معلوم ہو جائے گا یا شاید معلوم
ہو چکا ہو کہ اسکے تجربے، اسکی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہے۔ آپ
نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعے دنیا سے ایک حد
تک سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح ثریا نے میرے ذریعے دنیا سے سمجھوتہ کر لیا۔ جس طرح

ثریا نے میرے ذریعے دنیا سے سمجھوتہ کر کے سورج کے نیچے اپنی جگہ بنا لی۔ مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے قبل اسے شدید ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا ہوگا مگر اسے معلوم ہو چکا ہے، اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلےٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فن کار، دانشور، محبِ وطن، انسانیت پسند اور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔ میں خود اکثر ان کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔

میں یہ سب باتیں آپ کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے مزید المناک اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں۔ ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اٹھانے پڑیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی سے خوف زدہ ہونا چھوڑ دیں ـــــ اور زندگی کے مکر و فریب اور ریاکاری اور کمینے پن کا انہی ہتھیاروں سے مقابلہ کریں۔ دنیا میں زیادہ تر انسان جنگل کے درندے ہیں ـــــ اور ہمیں جنگل کے قانون کا ساتھ دینا ہے۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ آپ اپنی موجودہ ملازمت سے کس قدر دہشت زدہ تھیں ـــــ میں چاہتا ہوں کہ آپ زندگی کی دہشت پر جلد از جلد قابو پا لیں۔

میں یہ خط ایر پورٹ سے لکھ رہا ہوں۔ میں اور ثریا مہینے بھر کے لئے یورپ جا رہے ہیں۔ اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ واپسی پر ہم آپ کو خوش و خرم اور بخیریت پائیں۔

آخر میں میرا ایک اور بزرگانہ مشورہ یہ ہے کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہئے۔ اور اس نقطۂ نظر سے آپ کی موجودہ جائے رہائش کا آپ کے مستقبل پر اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔ میں جنیوا سے لوٹتے ہی کوشش کروں گا کہ آپ کو میرے قرب و جوار میں ایک معقول کرائے کا فلیٹ مل جائے۔ تاکہ آپ بھی ہاؤسنگ سوسائٹی

میں منتقل ہو سکیں۔

والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں میرا آداب کہئے گا۔ میری پرخلوص دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ یقین کیجئے میں ہمیشہ آپ کا مخلص اور بے لوث دوست رہوں گا۔"

خدا حافظ

آپ کا تابعدار

کمتریں جمشید

سلمیٰ کے ہاتھ سے خط گر گیا۔ نیچے کرسی پر صبح کا اخبار رکھا تھا۔ جس کے پہلے صفحے جلی سرخی میں منصور احمد خاں کا اسکوپ چھپا تھا۔

حسن و عشق اور فِدّو میاں

ہاجرہ مسرور

کردار

بیگم شہناز رضا :۔ ایک تیس سالہ ٹیڈی ٹائپ خاتون

رضا صاحب :۔ صاحب بیگم کے خوش شکل اور خوش وضع آدمی

ضیائی صاحب :۔ موٹے لمبے بال بالکل سفید۔ چمڑے کی جیکٹ اور تنگ پتلون میں ملبوس

جیری :۔ آٹھ دس سالہ بیگم شہناز اور رضا کا بیٹا۔ کاؤ بوائے لباس میں ملبوس۔

فدا :۔ بوڑھا ملازم۔ حرکات و سکنات میں مسخرا پن

دو مزدور :۔ جیسے ہونا چاہئیں۔

وقت :۔ سہ پہر۔

(ایک کشادہ کمرہ، جس میں صوفہ سیٹ، دیوان، تپائیاں، ہیٹ اسٹینڈ اور ایک بک سیلف ہے جو کتابوں سے بالکل خالی ہے اس پر صرف بیگم رضا کی ایک خوبصورت تصویر رکھی ہوئی ہے۔ دیواریں آرائش سے خالی ہیں۔ زمین پر قالین ہے اور دروازوں پر پردے۔ ایک دروازہ جو خاصا چوڑا ہے عقبی دیوار میں کھلتا ہے دوسرا بائیں ہاتھ کی دیوار میں کھڑکی دائیں ہاتھ کی دیوار میں ہے۔

پردہ اٹھنے پر بیگم دیوان میں بیٹھی "نٹنگ کرتی" نظر آتی ہے جیری صوفے پر بیٹھا کومک پڑھ رہا ہے۔ فدا عقبی دروازے سے چائے کی ٹرالی ڈھکیلتا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کندھے پر پڑا ہوا نیپکن عادتاً اٹھا کر دوسرے کندھے پر ڈالتا ہے اور بڑے تکلف سے کھنکارتا ہے۔)

فدا:۔ حضور بیٹا بیگم چائے حاضر ہے۔

بیگم:۔ ہوں — اچھا۔ (نٹنگ کرتی رہتی ہے)

فدا:۔ (رازداری سے) حضور ذرا جلدی پی لیجئے۔

بیگم:۔ (جھنجھلا کر) اوہ! سر پر سوار ہو جاتے ہو ہر وقت۔ پی لیں گے۔ کون سی گاڑی چھٹی جا رہی ہے۔

فدا:۔ (گردن سہلا کر) گاڑی؟ (نیپکن دوسرے کندھے پر رکھ کر سرگوشی میں) گاڑی تو نہیں حضور، ہاں ٹرک چھوٹ جائے گا ملک صاحب کا۔

بیگم:۔ (کچھ گھبرا کر) اوہ — اچھا تو ٹرک آج ہی بھیجا ملک نے۔ (کچھ غصے سے) بے صبرے کہیں کے۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے حضور۔

بیگم:۔ کہا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد آئیں۔ چیزیں کہیں بھاگ تو نہیں جاتیں۔ ایسے ہولا گئے جیسے کبھی کاہے کو کچھ دیکھا ہو۔ کمبخت تو دولتے کہیں کے۔ ذرا مروت نہیں۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے حضور۔ ملک صاحب پہلے لوہار کی دوکان پر لوہا کوٹتے تھے۔ پاکستان بنا تو انھوں نے کہیں سے لوہے کا کوٹہ پیٹ لیا۔ اب تو فیکٹری والے ہو گئے (رک کر بے تکلفی سے) اجی آپ کی تو دوستی ہے ان لوگوں سے۔ آپ کو کیا بتانا۔ رتی رتی حال معلوم ہوگا ان کا۔

بیگم:۔ (اپنائیت سے) کیسی باتیں کرتے ہو فدو بابا۔ لعنت بھیجو دوستی پر۔ کبھی وہ میاں بیوی ہمارے ہاں آ گئے کبھی ہم اُن کے ہاں چلے گئے۔ مہینے میں ایک آدھ بار اکٹھا پکنک کو چلے گئے یا ہفتے میں دو ایک دفعہ سینما دیکھ لیا تو دوستی ہو گئی؟ ——— ہنھ! پاگل پن کی باتیں کرتے ہو ———

فدا:۔ (نیکپن کی نشست بدل کر) یہی تو میں کہہ رہا ہوں حضور بیٹا بیگم ——— کبھی انہوں نے آپ کے ہاں کھانا کھا لیا۔ کبھی آپ نے ان کے ہاں۔ کبھی انہوں نے آپ کے ہاں کچھ بھیج دیا، کبھی آپ نے انہیں کوئی چیز بھیجدی تو اس سے کوئی دوستی ہو گئی ——— اب دیکھئے حضور آپ نے ایک دن ان کے ہاں گاجر کا حلوا بنوا کر بھیجا تھا۔

بیگم:۔ (جل کر) تو اس سے کیا ہوتا ہے یہی تو میں کہہ رہی ہوں ——— (کچھ سوچ کر) مگر مجھے تو یاد نہیں کہ کبھی میں نے گاجر کا حلوہ بھیجا تھا ان کو؟

فدا:۔ اجی انہی دونوں حضور جب آپ نرسیوں میں تھیٹر تھیٹر کھیلنے کو بے چین تھیں۔

بیگم:۔ (چونک کر) ہاں آں ——— اچھا۔ (ہنس کر) جب میں وہ ڈرامہ "گڑیا کا گھر" تیار کر رہی تھی۔ خیر تم یہ ڈرامے کا کیا ذکر لے بیٹھے۔

فدا:۔ (نیکپن کی نشست بدل کر) حضور ہمارے زمانے میں بڑے شاندار تھیٹر ہوتے تھے۔ ماشاءاللہ دیا لیلیٰ بنتا تو بس جناب تڑپا دیتا۔

بیگم:۔ (غصے سے) اوہ ——— پاگل کہاں کی بات کہاں ملاتے ہو۔ میرے ڈراموں میں لیلے مجنوں کا کیا ذکر ——— وہ تو بالکل بے ہودہ بازاری پن ہوتا تھا ——— ارے فدو میاں یہ دیا تھیٹر نہیں ہوتا۔

فدا:۔ (مایوسی سے) تو حضور ہم نہیں کیا۔ لیلیٰ ہو کر گڑیا ہو ——— ہم نے تو اب سب باتوں سے توبہ

کرلی۔ اللہ کے گھر جانا ہے ——

بیگم :۔ (جھنجھلا کر) ارے تو یہ ڈرامہ کوئی گناہ ہوتا ہے۔ حد ہے بھئی سارے دیوانے آج کل ڈرامہ کھیلنا تو بڑی عزت کی چیز ہے —— لوگوں میں، سرکار دربار میں ہر جگہ عزت ہوتی ہے میری —— ورنہ تمہارے رضا صاحب مجھے کوئی ایسی ویسی بات کرنے دیتے جو عزت کی نہ ہوتی —— معلوم ہوتا ہے کہ تم بابا کی باتیں سنتے ہو —— بابا تو نئے زمانے کی ہر بات کو بُرا سمجھتے ہیں ——

فدا :۔ (مایوسی سے سر جھکا کر) جی یہ بات تو ہے —— (نیپکن کی نشست بدل کر) میں تو ذکر کر رہا تھا بیگم ملک کا۔ آپ نے گاجر کا حلوہ بھیجا تھا ان کو۔

بیگم :۔ بھیجا تھا۔ تو پھر کیا ہوا۔

فدا :۔ ہوا کیا۔ حلوہ لے کر بولیں (زنانہ آواز میں) ارے ہمارے ملک صاحب نے بیگم رضا کے پیچھے ہزاروں روپیہ اٹھایا اور انہوں نے حلوہ بھیجا ہے ذرا کت سے اتنا سا ——

بیگم :۔ (غصے سے کھڑے ہو کر) کیا ——؟ یہ کہا تھا انہوں نے؟ (ہونٹ کاٹتی دروازے کی طرف جاتی ہے)

فدا :۔ (بھاگ کر دروازہ روکتے ہوئے) ارے ارے حضور غصے میں کچھ کر نہ بیٹھئے گا۔ جہیز [illegible] وقت پر سامان کی مشکل ہو جائے گی حضور۔

(بہری سر اٹھا کر دونوں کو بے حد متفکرانہ نظروں سے دیکھتا ہے اور لمبی ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ کونک پر جھک جاتا ہے)

بیگم ۔ (جھلا کر) میں کیا کر رہی ہوں بے وقوف —— (کمرے کے وسط میں آجاتی ہے) فدو بابا تم نے یہ گاجر کے حلوے والی بات مجھے پہلے بتائی ہوتی تو میں اپنا سامان ان بیگم صاحبہ کے ذریعہ ہرگز نہ دیتی۔

فدا :۔ (سوچ کر) بتایا تو تھا شاید۔

بیگم :۔ (طنزیہ انداز میں) خاک بتایا تھا۔ باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھے —— اچھا خیر اب تم بابا کے گھر جا کر کہہ دینا یہ باتیں۔ بہت منہ چڑھے ہو تم ان کے —— خواہ مخواہ بابا بات

سمجھیں گے نہیں اور شور مچائیں گے۔

فدا۔ یہ بات تو ہے (نیپکن کی نشست بدلتا ہے)

بیگم :۔ خیر میں سمجھوں گی بیگم ملک سے کبھی نہ کبھی تو موقع لگے گا۔ کمبخت لوہارن! ڈرامے پر اسکے میاں نے کچھ خرچ کر دیا تو سمجھتی ہے کہ میری ذات پر احسان کر دیا۔ جاہل عورت آرٹ کی قدر کیا جانے۔ اس کا میاں بے چارہ ذرا سمجھ دار ہے اور آرٹ کی سرپرستی کرنا جانتا ہے اس لئے میں نے اسکو اپنے "ڈرامہ سرکل" کا پریذیڈنٹ بنا دیا۔ یہ احسان کچھ کم تھا کہ رضا صاحب نے کہہ سنکر اسے نئی موٹر کا پرمٹ بھی دلا دیا ــــ کمبخت احسان فراموش کہیں کی۔

فدا۔ جی یہ بات تو ہے (گردن کھجا کر) حضور بیٹا بیگم ایک بات پوچھوں۔

بیگم :۔ (دیوان پر بیٹھتے ہوئے) کیا؟

فدا۔ یہ "پلے زی ڈنٹ" کیا ہوتا ہے؟

بیگم :۔ (اون اور سلائیاں اٹھا کر) اچھا اب کان نہ کھاؤ میرے۔ جا کر وہ سامان اکٹھا کر لو جو پاپا کے گھر چھوڑ جانا ہے۔

فدا۔ بہت اچھا حضور آپ کو فرصت نہیں (چیری کے قریب جا کر) چیری میاں! آپ کو کیا پتہ ہوگا کہ "پلے زی ڈنٹ" کیا ہوتا ہے ــ بے چارے اتنے سے تو ہیں ابھی۔

چیری :۔ (بجد حکمانہ انداز سے) فدو بابا کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے سامنے غلط انگریزی نہ بولا کرو۔

فدا :۔ (گردن کھجا کر) اچھا تو "پلے زی ڈنٹ" انگریزی ہوتا ہے لیکن یہ ہوتا کیسا ہے چیری میاں۔

چیری :۔ (بے حد بے تعلقی سے) ہمارے اسکول میں "پریزی ڈنٹ" وہ ہوتا ہے جو کرسی پر چپکا بیٹھا رہتا ہے اور سب خوب بولتے ہیں۔

فدا :۔ (سر ہلا کر) ہوں تو آپ ابھی "پلے زی ڈنٹ" بنے بیٹھے تھے۔

بیگم :۔ (ہنستے ہوئے) ارے فدو بابا کتنی دیر سے کہہ رہی ہوں کہ جاؤ کام کرو۔ لیکن میری بات

سننے کی تمھیں فرصت بھی ہو۔

(فدا غصے سے کندھے پر نیپکن کی نشست بدلتا ہے اور دروازے کی طرف

جاتا ہے۔ ایک لمحے بعد پھر کمرے میں جھانکتا ہے)

فدا:۔ (رازدارانہ طریقے سے) حضور وہ موٹر کی بات بکی ہو گئی کہ نہیں۔

بیگم:۔ ارے جاؤ بس تم اپنا کام دیکھو۔ ہمارے کام ہم پر چھوڑ دو۔ آگئے بے چارے اب اتنی

بڑی موٹر کی فکر سر پر لادینگے۔

(فدا سخت بُرا منہ بنا کر چلا جاتا ہے۔ بیگم ٹرالی کھینچ کر اپنے قریب کرتی

ہیں اور چائے پیالیوں میں ڈالتی ہیں)

بیگم:۔ (جیسے جیری سے مخاطب ہوں) دیکھو تو ذرا یہ کمبخت پرانے نوکر بھی جان کے لاگو ہوتے ہیں

ہر وقت ان کے سامنے جواب دہی ہوتی رہتی ہے۔

جیری:۔ (لمبی سانس لے کر بغیر نظر اٹھائے) پور (POOR) ممی۔

(بیگم چونک کر جیری کو دیکھتی ہے اور پھر چائے کی پیالی میں شکر گھولنے لگتی

ہے اسی وقت رضا صاحب ٹائی کی گرہ درست کرتے عقبی دروازے

پر نمودار ہوتے ہیں)

رضا صاحب:۔ ہیلو ڈارلنگ۔

بیگم:۔ (ایک دم خوش ہو کر دیوان سے اٹھتے ہوئے) ارے آپ تیار بھی ہو گئے ”ہاؤ اسمارٹ“

رضا:۔ (مسکرا کر) اور تم تو ہر وقت ہی تیار رہتی ہو ـــــ اس رنگ میں تم بہت کھلتی ہو۔ اور

یہ بالوں کا انداز ـــــ

بیگم:۔ (شرما کر، ہنسے۔ میں نے آپ کی تعریف کر دی اس لئے بدلے میں میری تعریف ہو رہی

ہے۔

جیری:۔ (کتاب پڑھتے ہوئے) اور ڈیڈی میرے بارے میں کیا خیال ہے؟

رضا:۔ (زور سے ہنس کر) ممی کے سو نمبروں میں سے پچاس تمہارے۔

جیری:۔ تھینک یو ڈیڈی (پھر پڑھنے لگتا ہے)

بیگم :۔ آیئے ایک پیالی چائے تو پی لیجئے۔

رضا :۔ ارے ڈارلنگ قریشی صاحب کے ہاں چائے پینے ہی تو جا رہے ہیں۔

بیگم :۔ (پیارا سا منہ بنا کر) قائل ہو گئے کبھی مت پیجئے ہماری بے چاری چائے۔ (رک کر) اچھا دیکھئے قریشی صاحب سے معذرت کر لیجئے گا میرے نہ پہنچنے کی۔

رضا :۔ اچھا۔ ٹاٹا چیری۔ ٹاٹا ڈارلنگ (رضا جانے کو چند قدم اٹھاتا ہے)

بیگم :۔ ارے۔ ارے سنو تو ڈارلنگ (رضا رک جاتا ہے)

بیگم :۔ قریشی صاحب سے ڈرامہ سرکل کی بات ضرور کیجئے گا۔ آخر ان کا ڈپٹی سکریٹری ہونا کس دن کام آئے گا۔ وہ کوشش کریں تو ہمارے ڈرامہ سرکل کو سرکاری مدد ضرور مل جائے گی ـــ (دیوان پر بیٹھ کر) کیا بتاؤں رضا ڈارلنگ مجھے ڈرامہ سرکل چھوڑتے ہوئے کتنا دکھ ہو رہا ہے۔

رضا :۔ (لاپروائی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر) خواہ مخواہ۔ ارے دو سال بعد تو ہم امریکہ سے واپس آجائیں گے۔ پھر وہی ڈرامہ سرکل ہوگا اور تم ہوگی۔

بیگم :۔ کون جانے اس وقت تک ڈرامہ سرکل ختم ہی نہ ہو گیا ہو۔ سارا گروپ میں نے بنایا تھا۔ پھر تم جانتے ہو ڈارلنگ مس رحمان کو میں اس گروپ میں لانے کو لے آئی مگر پچھتاتی ہوں۔ اب وہ ڈرامہ سرکل کا بھٹہ بٹھائیں گی ـــ میں ہوتی تو سب سنبھال لیتی۔

رضا :۔ تو پھر تم بھی چلی چلتیں قریشی صاحب کی پارٹی میں۔ ان سے سرکاری مدد کی بات بھی کر لیتیں اور یہ بھی لکھوا لیتیں کہ مس رحمان پر بھروسہ نہ کیا جائے۔

بیگم :۔ (ناز سے) ہائے اللہ آپ کو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ اب میں کوئی مس رحمان سے جلتی ہوں جو ایسی باتیں کر رہے ہیں (منہ بسورتی ہے)

رضا :۔ تو پھر چل رہی ہو ـــ مجھے دیر ہو رہی ہے ـــ ٹیکسی بھی پکڑنا ہے۔

بیگم :۔ کیسے نکلوں گھر سے؟ میری قسمت میں تو قید لکھی ہے آج کل۔ اب اس لوہارن نے ٹرک بھجوا دیا ہے ابھی سے۔

رضا :۔ (حیرت سے) لوہارن؟ کون! (ایک دم قہقہہ لگا کر) اچھا سمجھ گیا۔ یہ بیگم ملک کو نیا

خطاب ملا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ ناراض ہو گئی ہو ——— ٹرک آگیا ہے تو فدو بابا سامان لدوا دے گا۔ تم چلی چلو میرے ساتھ۔

بیگم :۔ اور ابھی ضیائی صاحب بھی تو آئیں گے۔ (رضا کے قریب جاکر) کیا خیال ہے پھر ہاں کر دوں اُن سے بارہ ہزار میں مانگ رہے تھے۔ میں نے تیرہ ہزار کہے تھے۔

رضا :۔ ارے میں تو سمجھا تھا کہ فیصلہ ہو چکا۔ تم ابھی تک پیسے بڑھوانے کی فکر میں ہو۔ (رک کر) دیکھو ڈارلنگ میرے خیال میں قیمت پر ضد نہ کرنا۔ بارہ ہزار کہتے ہیں بارہ ہزار پر ہی مان جاؤ۔ ضیائی صاحب کا حق بھی ہم پر کچھ زیادہ ہی ہے۔ بے چارے ضیائی صاحب نے ہمیشہ اپنے اخبار میں تمہاری پیش کئے ہوئے ڈراموں کی بے تحاشہ تعریف کی ہے۔ میرے خیال میں موثر ڈھنگ سے تعریف کرنے کے لئے برابر کے سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے

بیگم :۔ (اترا کر) ہٹئے ——— واہ یوں کہئے نہ آپ تو جیسے میرا ڈرامہ سرکل تو بوگس ہے بس ضیائی صاحب کو تعریف کرنے کا سلیقہ ہے مجھے تو کچھ آتا جاتا نہیں۔

پپیری :۔ (رکا رکا، پر جھجکتے جھجکتے) ڈیڈی آپ کو خبر نہیں۔ جب ممی ڈرامہ یاد کرتی ہیں تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ یوں کیجئے یوں نہ کیجئے ——— پوچھ لیجئے ان سے ——

رضا :۔ (زور سے ہنس کر) لو۔ تمہیں "بابا" اپ، گریٹ ایک اور دعویدار یہیں موجود ہے۔

(بیگم مسکراہٹ دبانے کی کوشش کرتی ہے)

پپیری :۔ اچھا ڈیڈی آپ میری بات نہیں مانتے۔

رضا :۔ اپنی ممی سے منوا دیجئے ——— اچھا بھئی اب چلے ——— (جاتا ہے)

بیگم :۔ (دروازے تک جاتے ہوئے) جلدی آیئے گا اور دیکھئے سرکاری امداد کی بات کرنا نہ بھولئے گا قریشی صاحب سے۔

(بیگم واپس آکر ٹرالی میں سے چائے کی پیالی اٹھا لیتی ہے اور ایک گھونٹ پیتی ہے چیری کو یک گھٹنوں پر رکھ کر اس پر اپنی کہنیاں جماتا ہے اور پھر اپنی ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھ کر بڑی سنجیدگی سے بیگم کی طرف دیکھتا ہے)

بیگم :۔ (چیری کی طرف دیکھ کر) کیا دیکھ رہے ہو چیری۔ پڑھتے کیوں نہیں۔
چیری :۔ ممی میں سوچ رہا ہوں کہ ضیائی انکل آپ کی تعریف کیوں کرتے ہیں۔
بیگم :۔ (گھبرا کر) تعریف نہیں اسے "تنقید" کہتے ہیں بیٹے۔
چیری :۔ تنقید کیا ہوتی ہے ممی ؟
بیگم :۔ (بے دھیانی سے) تنقید ؟ تنقید ہوتی ہے بھئی۔
چیری :۔ لیکن کیا ہوتی ہے ممی۔
بیگم :۔ (جھلا کر) انگریزی اسکول میں ستیا ناس ہو گیا تمہارا۔ تنقید کو انگریزی میں "کری ٹی سیزم" کہتے ہیں بھئی۔
چیری :۔ "کری ٹی سیزم" کیا ہوتا ہے ؟
بیگم :۔ (جھلا کر) اب میں کہاں تک تمہیں ہر بڑے لفظ کے مطلب بتاؤں۔ جب بڑے ہو جاؤ گے تو اس کا مطلب معلوم ہو جائے گا۔
چیری :۔ ممی بڑے آدمی بڑے لفظ کیوں بولتے ہیں۔
بیگم :۔ اچھا اب چپ بھی رہو۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع بھی دیا کرو۔
چیری :۔ اچھا ممی نہیں بتائیں ـــ ہم جانتے ہیں کہ ضیائی انکل آپ پر کیا کرتے ہیں ؟
(پر اسرار انداز سے مسکراتا ہے)
بیگم :۔ (غصے سے) کیا جانتے ہو، کیا کرتے ہیں ضیائی انکل۔
چیری :۔ وہ "کری ٹی سیزم" کرتے ہیں۔" نانا ابا کو بتاؤں گا کہ ضیائی انکل کیا کرتے ہیں۔ ممی پر۔
بیگم :۔ لو اب اور بے وقوفی کی باتیں شروع کر دیں۔ تمہارے نانا ابا کو ڈرامے پسند نہیں خبردار جو اُن سے کوئی بات کی۔
چیری :۔ نانا ابا کو ڈرامہ کیوں پسند نہیں ؟
بیگم :۔ اچھا اب دماغ نہ کھاؤ میرا تمہارے سوالوں سے تو میں تنگ آ گئی ہوں۔ آج کل کے بچے ہیں یا ارسطو افلاطون ؟ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(پیالی اٹھا کر جیری کی طرف بڑھاتی ہے۔ جیری بڑی گمبھیر چال سے
ماں کے قریب آتا ہے اور پیالی تھام لیتا ہے)

جیری:۔ ممی ارسطو افلاطون کیا ہوتا ہے؟

بیگم:۔ تمہارا سر۔ کسی وقت کچھ سوچنے کی مہلت بھی دیا کرو۔

(دودھ دان اٹھا کر جیری کی پیالی میں اور دودھ ڈال دیتی ہے)

جیری:۔ (پیالی بیگم کی طرف بڑھا کر) پلیز ممی۔

بیگم:۔ (پیالی پکڑ کر) کیوں کیا بات ہے؟

جیری:۔ یہ دودھ والی چائے آپ پیجئے میں "اسٹرونگ ٹی" پسند کرتا ہوں۔

بیگم:۔ (سخت غصے سے) اوہ۔ ہر وقت دادا ابا بنتے جاتے ہو۔ دفع ہو نہیں ملے گی چائے۔

(جیری پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا رہتا ہے۔ بیگم اپنی پیالی
میں اور چائے بنا کر پینے لگتی ہے۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد باہر سے
موٹر کے رکنے کی آواز آتی ہے۔ بیگم ایک دم پیالی ٹرالی میں رکھ کر
کھڑی ہو جاتی ہے لیکن پھر بیٹھ جاتی ہے اور قدموں کی چاپ سن کر چہرہ
پر سکون بنا کر سوئٹر اور سلائیاں اٹھا کر بڑی محویت سے بننے لگتی ہے)

جیری:۔ (وہیں کھڑے کھڑے) ممی آپ کا (FACE) فیس اس طرح ٹھیک نہیں لگ رہا ہے۔

(بیگم چونک کر جیری کو سخت نظروں سے دیکھتی ہے اور دیوان پر انداز
نشست بدل کر اپنے چہرہ کا زاویہ بدل دیتی ہے۔ ضیائی بائیں ہاتھ کی
دیوار میں کھلنے والے دروازے پر نمودار ہوتا ہے اور بیگم کی طرف
غور سے دیکھتا ہے۔

ضیائی:۔ (دروازے پر رک کر) اُفوہ! بڑی محویت سے بنائی ہو رہی ہے۔ آپ کا یہ روپ
بھی خوب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ڈرامہ سرکل کی بیگم شہناز رعنا، سوئی سلائی
میں بھی یوں محو ہو سکتی ہیں۔

بیگم:۔ (سینے پر دوپٹہ ٹھیک کر کے) ارے۔ آپ آگئے ضیائی صاحب۔ بیٹھئے آکر یہاں

وہیں سے قصیدہ کہتے رہیں گے۔ تشریف لائیے نا ـــ (ٹلتی رہتی ہے)

ضیائی :۔ (مسکرا کر) درباروں میں کھڑے ہو کر ہی قصیدہ پڑھا جاتا تھا۔ (جیری کی طرف دیکھ کر) ہیلو جیری یوں کھڑے ہو کر ممی سے سوئیٹر بنواتے ہو بھئی۔

(جیری کے پاس آ کر اسکے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ جیری کوئی جواب نہیں دیتا۔ منہ پھلائے کھڑا رہتا ہے)

بیگم :۔ (جھینپ کر) ارے یہ جیری کے لئے نہیں بُن رہی ہوں۔ یہ تو رضا صاحب کے لئے ہے۔ امریکہ میں تو ان دنوں کڑا کے کی سردی ہو گی۔ میں نے سوچا یہ ڈبل ننٹنگ اون کا ایک سوئیٹر بھی جلدی سے بنا لوں۔ (مسکرا کر) رضا صاحب پر یہ رنگ خوب کھلے گا نا؟

ضیائی :۔ (لمبی سانس لے کر) بہت کھلے گا (ایک اور سانس لے کر) کبھی کسی نے ہمارا سوئیٹر نہ بنا (جیب سے موٹا سا سگار نکالتا ہے اور بڑے افسوس سے اسے ماچس پر ٹھونکتا ہے)

بیگم :۔ واقعی؟ کیسی بری بات ہے (چہرے پر سوگ طاری کر کے) ماشاء اللہ چار چار جوان بیٹیاں آپ کی اور ایک عدد بیوی الگ۔ کسی کو اتنا ہوش نہیں کہ ایک سوئیٹر ہی بن دیں۔

ضیائی۔ (جلدی سے گھبرا کر پلٹتے ہوئے) رہنے دیجئے۔ یہ ذکر نہ کیجئے۔ میں نے کونسی محبت دی ان سب کو۔ (صوفے پر جیسے ٹوٹ کر گر جاتا ہے)

بیگم :۔ ہائیں ـــ (آنکھیں پھاڑ کر) آپ ان سے۔ یعنی اپنی بیوی اور بیٹیوں سے محبت نہیں کرتے؟ (شرما کر) رضا صاحب تو ـــ

ضیائی :۔ (لمبی سانس لے کر) آپ سے محبت کرتے ہیں کیونکہ آپ محبت کرنے کی چیز ہیں۔

بیگم :۔ تو کم سے کم آپ کی بیٹیوں کو تو اتنا خیال چاہیئے کہ ایک سوئیٹر بن دیں۔ میں تو ہر سال چھ سات سوئیٹر بنتی ہوں رضا صاحب کے لئے ـــ

ضیائی :۔ چھوڑیئے اس قصے کو ـــ میں تو "تھری پیس سوٹ" پہن کر ہی خوش ہو لیتا ہوں اسی لئے ـــ (سگار سلگاتا ہے)

بیگم :- (رنجیدہ ہو کر) چہ چہ۔ میں یہاں ہوتی تو اس موسم میں ایک سوئیٹر آپ کے لئے ضرور بن دیتی۔

ضیائی :- (ٹھنڈی سانس بھر کر پُر اسرار آواز میں) تو آپ سچ مچ یہاں نہیں تھی ہوں گی!

بیگم :- (گھبرا کر کھڑے ہو کر ٹرالی پیچھے ڈھکیلتے ہوئے) اسے یہ بھی کوئی جھوٹ ہے کہ رضا صاحب کو گورنمنٹ دو سال کے لئے امریکہ بھیج رہی ہے۔ کتنی دفعہ آپ کو بتایا کہ ٹکٹ لئے جا چکے ہیں دس تاریخ کے۔ اور کل دس ہے جناب (جیری سے مخاطب ہو کر) تم کیا کھمبے کی طرح تنے کھڑے ہو؟

جیری :- (منہ پھلائے پھلائے ضیائی کی طرف آ کر کوک ان کے نیچے سے گھسیٹتے ہوئے) پلیز انکل کشن رکھ لیجئے۔

ضیائی :- (جھینپ کر) اوہ ___ جیری معاف کرنا بھئی۔

جیری :- (بزرگانہ انداز سے) کوئی بات نہیں انکل ___ مگر انکل ضیائی آپ ممی کی بات کا یقین کیوں نہیں کرتے کہ کل ہم فلائی (FLY) کر رہے ہیں۔ پور (POOR) ممی کوئی ہر وقت ڈرامہ تھوڑی کرتی ہیں۔ آپ یقین کیجئے نا۔ (کاک کھول کر صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھنے لگتا ہے)

بیگم :- (سختی سے) جیری، باہر جا کر کھیلو۔ بڑوں کی باتوں میں نہیں بولا کرتے۔ کتنی بار سمجھایا ہے تمہیں۔

(جیری کاک لئے منہ پھلائے بائیں ہاتھ کے دروازے سے غائب ہو جاتا ہے۔ بیگم جیری والی چائے کی پیالی دیکھتی ہے اور اسے اٹھا کر دروازے کی طرف جاتی ہے)

بیگم :- جیری۔ اے جیری اپنی چائے لے جاؤ۔

(ایک لمحے انتظار کے بعد جب جیری کو کمرے میں آتا نہیں دیکھتی تو پیالی ٹرالی میں رکھ کر سوئیٹر اور سلائیاں اٹھا کر کھڑے کھڑے بننا شروع کر دیتی ہے)

ضیائی :۔ (سگار کا ایک کش لے کر) چائے تو ہم نے کبھی نہیں پی آج شام۔ سوچا تھا کہ آپ کے ہاں
کی چائے پئیں گے مگر آپ نے تو پوچھا بھی نہیں۔

بیگم :۔ (اون اور سلائیاں دیوان پر ڈال کر) اسے۔ میں تو آپ کی موجودگی میں سبھی کچھ بھول جاتی ہوں
(ٹرالی پر جھک کر پیالی میں چائے ڈالنے لگتی ہے)

ضیائی :۔ (صوفے سے اٹھ کر بیگم کے قریب آتے ہوئے) سچ! آپ میری موجودگی کو اتنی اہمیت
دیتی ہیں۔

بیگم :۔ (غیر جذباتی لہجے میں) مرعوب جو ہو جاتی ہوں۔

(ضیائی اپنا ہاتھ جھکی ہوئی بیگم کے کندھے پر رکھنا چاہتا ہے لیکن جھجکتا
ہے اور پھر ہاتھ کو کوٹ کے کالر سے پونچھ کر دھیرے دھیرے کندھے
کی طرف بڑھاتا ہے۔ اسی وقت جیری اندر آ کر ضیائی کے برابر کھڑا ہو
جاتا ہے اور ناقدانہ انداز سے ضیائی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ
اپنی گردن آگے بڑھاتا ہے۔ ضیائی جیری کو قریب دیکھ کر ایک دم اپنا
ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا ہے اور ماچس کی ڈبیا نکال کر گھبراہٹ
میں جیری کی طرف بڑھا دیتا ہے)

جیری :۔ (ماچس لے کر) تھینک یو انکل ___ میں نے ابھی سگار پینا شروع نہیں کیا۔

بیگم :۔ (جیسے کچھ خبر نہیں) تم پھر آ گئے جیری۔ تمہیں میں نے سزا دی تھی۔

جیری :۔ سوری ممی۔ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ یہ "اسٹرونگ ٹی" مجھے پسند ہے ڈیڈی کی طرح ___
میں وہ چائے ملا دودھ ہرگز نہیں پیوں گا (پیالی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

بیگم :۔ (پیالی الگ ہٹا کر) یہ ضیائی صاحب کے لئے ہے ___ ہٹو، پینا ہے تو اپنی پیالی لے
جاؤ ___ (جیری انکار میں سر ہلاتا ہے) تو پھر کمرے سے جاؤ تمہاری یہی سزا ہے۔

(جیری بائیں ہاتھ کے دروازے سے چلا جاتا ہے بیگم چائے کی پیالی
ضیائی کی طرف بڑھاتی ہے۔ ضیائی پیالی سے ایک چٹخارے والا گھونٹ
بھر کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا بک شیلف تک آتا ہے جس پر

بیگم کی تصویر رکھی ہوئی ہے ___ بیگم ٹنگ اٹھا کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور
ضیائی کی طرف دیکھتی ہے جو اسکی فریم کی ہوئی تصویر ہاتھ میں اٹھائے ، اسے غور
سے دیکھ رہا ہے)

بیگم:۔ کیا دیکھ رہے ہیں آپ ___ چائے پیجئے بالکل ٹھنڈی ہو جائے گی۔

ضیائی:۔ (تصویر کو والہانہ انداز سے دیکھتے ہوئے) ان نازک ہاتھوں سے بنی ہوئی چائے اتنی جلدی
ختم کرتے ہوئے دکھ ہوگا۔ یہ چائے تو آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ پی جانی چاہئے
جیسے کوئی امرت رس پیئے۔ جیسے کوئی نازک لبوں کا ___

بیگم:۔ (گھبرا کر کھڑی ہوتی ہے) آئیں ___ آج آپ ___ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔
(آنکھیں بڑی ادا سے پھاڑ کر اور منہ کھول کر تصویر حیرت بن جاتی ہے)

ضیائی:۔ (پیالی بک شیلف پر رکھ کر جلدی سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے) بس بس یونہی
رہیئے۔ چہرہ اسی طرح رہنے دیجئے ___ (بڑی گیلی سی آواز میں) بالکل تصویر سے بہتر لگ
رہی ہیں آپ۔

بیگم:۔ (منہ اسی طرح اٹھائے اٹھائے) ہائے اللہ؟

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) اس "ہائے اللہ" سے تصویر اور مکمل ہو جاتی ہے۔ تصویر حیرت!!

بیگم:۔ (ذرا ہوش میں آکر) آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ضیائی صاحب؟ (دیوان پر سے اٹھ کر
ضیائی کے قریب آتی ہے اور تصویر اسکے ہاتھ سے لے کر) آخر آج میرا اور میری تصویر کا دنگل
کیوں کرائے دیتے ہیں آپ!

ضیائی:۔ (منہ پھیر کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) موازنہ آپ کا اور تصویر کا نہیں ___ میں تو آپکی
بے خبری اور تصویر کی بے خبری کا مقابلہ کر رہا تھا۔ دونوں کو ہمارا حال نہیں معلوم (دو قدم
اور دور جا کر) کسی کو ہمارا حال نہیں معلوم۔

بیگم:۔ (اپنی تصویر غور سے دیکھتے ہوئے) آج آپ مذاق کے موڈ میں ہیں ضیائی صاحب۔

ضیائی:۔ (اسی طرح پیٹھ پھیرے ہوئے) جی ہاں آپکے لئے مذاق ہے۔

بیگم:۔ (سنجیدہ ہو کر) آج تک آپ نے ایسی عجیب باتیں نہیں کی تھیں مجھ سے۔

ضیائی:۔ (اسی طرح تیز آواز میں) اور آپ آج تک کبھی ہمیں چھوڑکر اتنی دور بھی نہیں جا رہی تھیں۔

بیگم:۔ (ہونٹ سکیڑکر آنکھیں نچاتے ہوئے) اوہ ۔۔۔ میں سمجھی! آپ کو ہمارے جانے کا رنج ہو رہا ہے (ہنستی ہے)!

ضیائی:۔ (منہ دوسری طرف کرتے ہوئے) جی ہاں۔

بیگم:۔ (سنجیدہ ہوکر اپنی قمیض کولھوں پر ٹھیک کرتے ہوئے) در اصل میں اور ضیا بھی آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ رنج تو ہمیں بھی ہے۔

ضیائی:۔ (بات کاٹ کر) کاش آپ میری عزت نہ کرتیں۔ عزت تو سراسر غیریت کی خلیج بن جاتی ہے۔

بیگم:۔ (جیسے پریشان ہی ہو) واہ آپ اپنے کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں۔ اتنے قابل انسان کی عزت نہ کی جائے تو کیا بے عزتی کی جائے۔ اور پھر آپ تو میرے پاپا کے اتنے پرانے دوست ہیں۔

ضیائی:۔ (ایک دم مڑکر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے) صرف آپ کے پاپا کا دوست۔ بس۔

بیگم:۔ اے لیجئے پاپا کے دوست ہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے دشمن! واہ بھئی وا جو بات کہتی ہوں آج آپ کو بری لگ جاتی ہے۔ اپنا وطن چھوڑتے میرا جی ویسے ہی اداس ہے اس پر سے آپ ۔۔۔

ضیائی:۔ (صوفے کے قریب بہ مشکل آکر اسے تھامتے ہوئے) اس شہر میں رہتے ہوئے بھی آپ میرے لئے تو ہمیشہ کوسوں دور رہیں۔

بیگم:۔ (معصومیت سے) اے لیجئے ڈراموں میں تو آپ ملتے ہی رہتے تھے۔ آپ تو آج ہر بات کی تردید کرنے پر اترے ہوئے ہیں (روہانسی ہوکر) میں اپنا سمجھ کر بات کرتی ہوں اور آپ غیروں کی طرح ہر بات پکڑ لیتے ہیں۔

(بیگم منہ پھیر کر کھڑکی کے پردے کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

ضیائی:۔ (رنجیدہ خطمی ہوکر چائے کی پیالی میز پر رکھتا ہے اور ہاتھ ملتے ہوئے) آہ! آپ مجھے اپنا

سمجھتی ہیں؟ اپنا؟

بیگم :۔ جائیے اب ہم کوئی بات ہی نہ کرینگے ۔۔۔ پاپا سے کہیں گے کہ آپ ۔۔۔

ضیائی :۔ (بیگم کے پیچھے کھڑے ہو کر) اب اعتراف کرتے چپ ہو جانا چاہتی ہیں۔

(بیگم جھٹکے سے مڑ کر ضیائی کی طرف حیرت سے دیکھتی ہے اور پھر گھبرا کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے)

بیگم :۔ (سوچتے ہوئے) اعتراف! اعتراف؟

ضیائی :۔ (کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے) ہاں تم اعتراف کر چکی ہو۔ چھپاؤ نہیں ۔۔۔ آج میں بھی اعتراف کر لوں کہ میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہا ہوں۔

بیگم :۔ (دیوان سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے) محبت!

(دوبارہ دیوان پر بیٹھ کر تصویر حیرت بن جاتی ہے)

ضیائی :۔ (کمرے میں والہانہ انداز سے ٹہلتے ہوئے) مجھے یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ میں پہلی بار تمہارے پاپا کے ساتھ تمہارے گھر گیا تھا۔ اور میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ جھبرے جھبرے سنہرے بالوں والی چھوٹی سی لڑکی کو، جو ایک دم ڈرائنگ روم میں آگئی تھی کیونکہ اسے بک شیلف میں السن کے "دی ماسٹر بلڈرز" کی تلاش تھی۔ اُن بڑی بڑی بھوری آنکھوں نے کیسی بے اعتنائی سے ایک اجنبی کو دیکھا تھا۔ (سینے پر ہاتھ رکھ کر) اور پھر وہ کتاب لے کر اندر بھاگ گئی تھی ۔۔۔ جونیر کیمبرج کی طالبہ السن پڑھنے کو لے گئی تھی ۔۔۔ اور میں اس لڑکی کی ذہانت پر حیران رہ گیا تھا ۔۔۔ (لمبی سانس لے کر) مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

بیگم :۔ (بڑے عزم سے کھڑے ہو کر) مجھے بھی سب باتیں یاد ہیں (ایک دم موڈ بدل کر رومینٹک انداز سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) اس دن ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں اور سردی بڑے زور کی تھی اور آپ ایک دم رضا صاحب کو ہمارے ہاں لے آئے تھے ۔۔۔ ایسے پیارے لگ رہے تھے رضا صاحب کہ مجھے اب تک یاد ہے ۔۔۔ آپ نے اُن کے سامنے میری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں کچھ بول ہی نہ سکی۔

مجھے یاد ہے اس دن کڑاکے کی دھوپ تھی جب آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ پگلی لڑکی رضا تجھ سے پیار کرتا ہے۔

اور مجھے یاد ہے اس دن خوب ٹوٹ کر بارش ہو رہی تھی جب آپ نے پاپا سے رضا صاحب کو دامادی میں قبول کرنے کی سفارش کی تھی۔

(ہنس کر) دیکھئے میرا حافظہ بھی ایسا خراب نہیں۔

ضیائی:۔ (اسی وا ہیات انداز سے ٹہلتے ہوئے) تمہاری آنکھوں کی اجنبیت میرے لئے ناقابل شکست پہاڑ کی چوٹی بن گئی۔ میں نے دیکھا کہ تم رضا سے محبت کرنے لگی ہو تو مجھے اپنی شخصیت رضا کی شخصیت میں جذب ہوتی محسوس ہوئی۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ رضا کے سامنے تمہیں موم ہوتے دیکھ کر میری انا کو کیسی تسکین ہوتی۔ تم رضا کی طرف دیکھتیں تو مجھے لگتا کہ یہ نظریں میرے دل میں اتر گئیں ہیں ــــ تم ڈراموں سے دلچسپی لیتیں میں بھی اسٹیج کا دیوانہ ہو گیا اور اس طرح میں نے تصور ہی تصور میں تمہیں جیت لیا (جیب سے عینک نکال کر لگاتے ہوئے) تم میری محبت کو نہیں دیکھ سکتیں ــــ شبہنو۔

بیگم:۔ (مسکراہٹ دبا کر) کیا اس کے لئے عینک ضروری ہے؟

ضیائی:۔ (تڑپ کر) تم میرا مذاق اڑا رہی ہو ــــ لیکن محبت کو سمجھنا بڑے ذہنوں کا کام ہے۔ اس ننھی سی شوخ شبہناز کا نہیں۔

بیگم:۔ (بے حد سنجیدگی سے) واہ سمجھتی کیوں نہیں ــــ نمبر ایک۔ آپ رضا کو میرے ہاں اس لئے لائے تھے کہ میری نظریں آپ کے دل میں اتر جائیں ــــ نمبر دو آپ مجھے رضا سے محبت کرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

ضیائی:۔ ہاں یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ تم کسی کے سامنے تو جھک گئی ہو اور اس طرح میں تصور ہی تصور میں رضا کی جگہ لے لیتا۔

بیگم:۔ (خوف زدہ ہو کر) اوہ سمجھ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ رضا بن جاتے؟ (ایک ہاتھ کی انگشت شہادت دوسرے ہاتھ کی انگشت شہادت پر مار کر) اور میں؟ ــــ میں آپ کی بیوی کا روپ دھار لیتی ہوں گی؟ ــــ (انگلی کو دوسری انگلی پر پلیٹ کر)

اس طرح تو اس دوران میں آپ کے ہاں جو مزید تین بیٹیاں پیدا ہوئیں وہ گویا مجھ سے ہوئیں (ایک دم زور سے ہنستی ہے)

ضیائی :۔ انسانی مجبوری پر ہنستی ہو (اپنے ہاتھوں میں سر تھام لیتے ہیں)

بیگم :۔ (ایک دم سنجیدہ ہو کر) بعض اوقات ہنسی آنسوؤں کی ترجمان ہوتی ہے ضیائی صاحب۔ یہ آپ کی انسانی مجبوری تھی کہ آپ مجھ سے وہ بات کہہ دیں جو اب نہیں کہنا چاہیے تھی (کھڑے ہو کر ٹرالی پر ہاتھ رکھتے ہوئے جیسے ڈرامہ بول رہی ہو) اگر آپ رضا کو مجھ سے نہ ملاتے تو شاید میں آپ سے متاثر ہو جاتی۔ (رومینٹک انداز سے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) اس زمانے میں مجھے ابسن کی ہلڈا بہت اچھی لگتی تھی۔ ہلڈا جو نوعمر تھی لیکن "ماسٹر بلڈر" کو اپنے اشارے پر چلا کر خوش ہونا چاہتی تھی جس نے موت کی کھائی کے اس پار "ماسٹر بلڈر" سے اپنی موعودہ سلطنت مانگی تھی۔

ضیائی :۔ (صوفے پر بیٹھ کر سر دونوں ہاتھوں میں لے کر) میں کتنا بدنصیب اور بزدل تھا میں نے سوچا کہاں تم ایک ننھا سا بے تاب ستارہ اور کہاں میں غروب ہوتا ہوا آفتاب ــــ میرا تمہارا کیا میل ؟

بیگم :۔ (طنز سے) آگے چل کر آپ کا خیال زیادہ صحیح ثابت ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ابسن کی ہلڈا بھی ڈرامے میں اتنی نوعمر تھی کہ اپنے سلسلے میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی تھی (اطمینان سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

ضیائی :۔ مگر اب تو تم اعتراف کر چکی ہو ــــ اب تم ننھی سی شہنو نہیں رہیں ــــ بولو (وارفتگی سے کھڑے ہو کر) میں تمہارے لئے شہرت کی ایک جنت تعمیر کر دوں گا۔ میں تمہیں آسمان شہرت کا لازوال ستارہ بنا دوں گا۔

(بیگم کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہے۔ بیگم تڑا کر اٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ چہرے پر ناگواری ہے۔ ضیائی اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوتا ہے اسی لمحے فدا اپنے مخصوص انداز سے کندھے پر نیپکن رکھتا اور اٹھاتا اندر

عقبی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ اور پیالی اٹھا کر ضیائی کی پشت پر کھڑا ہو جاتا ہے)

ضیائی:۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کر سکتا ہوں شہنو۔ میں موت کی کھائی میں چھلانگ لگا سکتا ہوں۔

فدا:۔ (دھیمی آواز میں) حضور اس وقت تو چائے پی لیجئے۔ بڑا احسان ہوگا۔ برتن بند کرنا ہیں۔

(بیگم اور ضیائی چونک کر فدا کی طرف مڑتے ہیں۔ بیگم شرمندہ سی ہو کر دیوان کی طرف لپکتی ہے اور سوئیٹر بُننے بیٹھ جاتی ہے لیکن ضیائی بے حد شفقت سے فدا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔)

ضیائی:۔ میں پی چکا فدا۔ میں سرشار ہوں۔

فدا:۔ (مودب طریقے سے) بے شک حضور۔ مگر یہ پیالی بھری ہوئی ہے اس لئے سمجھا کہ حضور ٹھنڈی کر کے پینے ہوں گے۔

بیگم:۔ (جھنجلا کر) بحث نہ کرو فدو بابا۔ ٹرالی لے جاؤ۔ ضیائی صاحب چائے نہیں پئیں گے۔

فدا:۔ یہ بات تو ہے حضور۔ (ٹرالی دھکیلتا باہر چلا جاتا ہے)

(بیگم کچھ پریشان سی ہو کر تیزی سے بُنتی کرتی ہے۔ ضیائی دُور کھڑا اپنے کوٹ کا کالر پکڑے اُسے میٹھی نظروں سے دیکھتا ہے اور بار بار اپنی عینک ناک پر درست کرتا ہے۔")

ضیائی:۔ تم یوں بیٹھی کتنی حسین لگ رہی ہو شہناز۔

جیری:۔ (بائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آ کر بڑے اعتماد سے) بالکل نہیں ضیائی انکل۔ (گردن ادھر اُدھر گھما کر بیگم کو دیکھتے ہوئے) دیکھئے اس اینگل سے ممی کی ناک کتنی لمبی لگتی ہے ڈیڈی اس اینگل سے ممی کا فوٹو کبھی نہیں لیتے۔

(دونوں گڑبڑا جاتے ہیں اور جیری چاروں طرف دیکھنے لگتا ہے۔)

میری چائے کہاں ہے ممی؟

بیگم :۔ (غصے سے مگر چہرہ سنبھالے ہوئے) میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں چائے نہیں ملے گی۔ پھر کیوں آئے ہو۔

جیری :۔ سوری ممی۔ میں رات کو کھانا بھی نہیں کھاؤں گا اب۔

(منہ پھلائے چلا جاتا ہے)

ضیائی :۔ (بائیں ہاتھ کے دروازے کی طرف دیکھ کر) میں فیصلہ کر چکا ہوں شبنو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ ہے شبنو ـــــ

فدا :۔ (عقبی دروازے سے ایک دم اندر آ کر خوشی سے) فیصلہ ہونے میں کیا رکھا ہے حضور۔ بیٹا بیگم تو آپ کے حق میں ہیں ہی اور یہ فیصلے بیگمیں کرتی ہیں۔ صاحب لوگ تو بیچارے ـــ (ضیائی ٹھٹک کر فدا کو دیکھتا ہے)

بیگم :۔ (سلائیاں روک کر انتہائی حیرانی سے) فِدّو بابا!

فدا :۔ (رازدارانہ طریقے پر) حضور اپنے ضیائی صاحب سے بڑھ کر کون حق دار ہو سکتا ہے۔

(ضیائی خوش ہو کر تائید میں سر ہلاتے ہیں)

بیگم :۔ فِدّو!! (مٹھیاں باندھ کر فدا کی طرف لپکتی ہے فدا ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے)

فدا :۔ (ضیائی سے مخاطب ہو کر) لیجئے، دیکھئے ہاتھ اٹھانے لگیں۔ خدا کی قسم گودیوں میں کھلایا ہے اتنی سی تھیں ـــــ (اور پیچھے ہٹ کر) کیا مجھے خبر نہیں کہ آپ کے حق میں فیصلہ کئے بیٹھی تھیں۔ اب منہ پر ہاں کہنے کا وقت آیا تو ـــــ

ضیائی :۔ (بپھری ہوئی بیگم کے سامنے فدا کی ڈھال بنتے ہوئے) تو گویا تم ہماری باتیں سن رہے تھے فدو میاں ـــ ہوں ؟

فدا :۔ اجی جناب چھپ کر سننے والے پر لعنت۔ اندر آ رہا تھا تو کان میں پڑ گئی۔ ویسے بیٹا بیگم مجھ سے چھپائی کیا ہیں۔ پوچھ لیجئے ان سے ـــ

بیگم :۔ (چیخ کر) فدو کے بچے کمبخت ـــــ (مارنے کے لئے فدا کی طرف بڑھتی ہے لیکن فدا ضیائی کو پینترے بدل بدل کر ڈھال بنائے رکھتا ہے)

ضیائی :۔ شبنو بچہ نہ بنو ـــ بگڑ کیوں رہی ہو اس بے چارے پر ـــ کوئی تو ہمراز ہو۔ پھر یہ

تو تمہارا پرانا نمک خوار ہے۔

بیگم:۔ (پاؤں پٹخ کر) ضیائی صاحب ــ ہوش کی دوا کیجئے۔

فدا۔ اجی بٹیا کیوں گھبراتی ہیں، مرد آدمی فیصلہ کرکے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ابھی آپ نہیں سے بھئے کہ میں فیصلہ کرچکا ــ اب تم بتاؤ ــ

(بیگم ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر رہ جاتی ہے)

ضیائی۔ (اطمینان کی سانس لے کر) پھر تمہاری بھی وہی رائے ہے جو میری ہے؟ (فدّو کے شانے پر ہاتھ رکھ کر) کیوں فدّو میاں زندگی میں خوشی بڑی چیز ہے نا۔ خواہ اس کے لئے کچھ بھی قربان کرنا پڑے۔

بیگم:۔ (بند مٹھیاں اپنے زانو پر مار کر) ضیائی صاحب (سر پکڑ کر دیوان پر بیٹھ جاتی ہے)

فدا:۔ (پریشان ہوکر) لیجئے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں ــ (نیکن دوسرے کندھے پر رکھ کر) حا خواہ میں بنے میاں کو بھی اپنے پیچھے لگا لیا بٹیا بیگم نے ــ دیکھ لیجئے اس وقت بھی کھڑے ہیں باہر۔ اجی صورت دیکھیں اپنی۔ حیثیت دیکھیں اپنی۔ کہاں ضیائی صا کہاں بنے میاں ــ

(بیگم بے بسی سے سر اٹھا کر دونوں کو دیکھتی ہے اور پھر سر پکڑ لیتی ہے)

ضیائی:۔ (دانت پیس کر) بنے میاں ــ تو بنے میاں بھی ــ ہوں۔ ڈراموں کے سین تیار کرنے لگے کہ امیدوار بھی ہو گئے۔

(ضیائی سینہ تان کر بائیں ہاتھ والے دروازے کی طرف بڑے جوش سے بڑھتا ہے۔ فدا "نہ نہ" کرتا دوڑ کر دروازہ روک لیتا ہے اور بیگم سینے پر ہاتھ رکھ کر گھبرائی کھڑی ہو جاتی ہے)

فدا۔ اجی حضور بنے میاں سے آپ کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بٹیا بیگم کی طرف سے کے حق میں فیصلہ ہے۔

بیگم:۔ (دوبارہ دانت کٹکٹا کر) فدّو۔ کمبخت۔ گدھے (پھر دیوان پر بے بسی سے ہاتھ ملتی ہے)

فسادا۔ (اسی اطمینان سے) اور کیا جیتنے والے کو ہارنے والے سے کیا غرض۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بٹیا بیگم کا فیصلہ کیا ہے۔ صاحب بھی جانتے ہیں ــــ (باہر کی طرف حقارت سے اشارے کرکے) منہ پڑے آئے بنتے میاں۔ میں جاکر خود انہیں جواب دیئے دیتا ہوں موٹر کا سودا ہو گیا۔

(نہایت فاتحانہ شان سے سینہ تان کر دروازے کی طرف جاتا ہے۔ بیگم اطمینان کی لمبی سانس کھینچ کر کھڑے ہو کر لیتی ہے اور پھر جیسے دیوان پر گر پڑتی ہے۔ ضیائی بھی ٹھنڈا ہو کر صوفے پر ڈھے جاتا ہے۔ اور کانپتے ہاتھوں سے جیب سے سگار نکال کر ہر طرف دیکھتا ہے۔)

بیگم:۔ (ماتھے پر ہاتھ پھیر کر) یہ آپ کیا کر رہے تھے ضیائی صاحب۔ شکر ہے کہ بدو بابا کچھ نہ سمجھا۔ حد ہو گئی بھئی آپ نوکر کے سامنے میری اتنی بے عزتی کر رہے تھے۔

ضیائی:۔ (ہاتھ کا بے جلا سگار جیب میں ٹھونس کر) بے عزتی! میں تمہارے لئے بے عزتی کا باعث ہوں گا شہنو؟ ــــ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ــــ سوسائٹی میں خاصا باعزت شمار ہوتا ہوں۔

بیگم:۔ (گھبرا کر مگر مضبوطی سے) اوہ میرا مطلب ہے (دیوان سے اٹھ کر صوفے کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میرا مطلب ہے کہ آپ ہمیشہ وقت پر وہ بات سمجھتے ہیں جو نہ سمجھنا چاہئے ــــ (دھیمی آواز میں مگر یقین سے) دیکھئے ضیائی صاحب ہیں اب جھڑے جھڑے بالوں والی جونیئر کیمبرج کی اسٹوڈنٹ نہیں ــــ میں مسز رضا ہوں۔ ــــ اور رضا سے محبت کرتی ہوں۔

ضیائی:۔ (بے اختیار کھڑے ہو کر) اس کا مطلب ہے کہ تم جھوٹ بول رہی تھیں۔

بیگم:۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔

ضیائی:۔ (بیگم کی کرسی پر جھکتے ہوئے) شہنو

بیگم:۔ (کرسی پر سے کترا کر اٹھتے ہوئے) ضیائی صاحب دیکھئے ابھی میں نے کتنی صحیح بات کہی کہ آپ ہمیشہ وقت پر وہ بات سمجھتے ہیں جو نہیں سمجھنا چاہئے (ڈرامائی انداز سے

ہمیشہ رضا سے محبت کرتی رہی ہوں اور اب بھی کروں گی ــــ میں آپ کی عزت کرتی تھی اب اور زیادہ عزت کروں گی ــ شاید آج کے بعد آپ کے نام پر مجھے ایک کسک سی بھی محسوس ہو ـ میں امریکہ کی نئی دنیا میں بھی اپنے "ماسٹر بلڈر" کو یاد کرتی رہوں گی (دھیمی آواز میں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) ہمیشہ یاد کروں گی ـ لیکن اس طرح نہیں جیسے آپ جانتے ہیں ـ میں عورت ہوں ضیائی صاحب عورت ــــ کہتے ہیں مرد تمام عمر گھر کی دیواریں توڑنے کے لئے بے تاب رہتا ہے لیکن عورت تمام عمر دیواروں کو لیس پوت کر مضبوط کرتی رہتی ہے (مسکرا کر) اگر آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو مجھے رضا کے ساتھ خوش دیکھ کر آپ کو خوش ہونا چاہیئے ـ

ضیائی :ـ (بیگم کی طرف بڑھتے ہوئے) میں خوش ہوں گا میری بلڈا ــــ میں تو تمہاری خاطر موت کی کھائی میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں ـ

بیگم :ـ (ایک دم پیچھے ہٹ کر) اوہ ــــ آپ کتنے عظیم ہیں (اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ایک زوردار سسکی لیتی ہے) آپ ــــ میری یادوں کا سرمایہ ہیں ـ آپ ــ ــ ــ

ضیائی :ـ (جیب سے رومال کھینچ کر) ارے ـ ارے شبنو تم رو رہی ہو؟ میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا ــــ (رومال سے آنسو پونچھنا چاہتا ہے)

بیگم :ـ (رومال جھپٹ کر اور پیچھے ہٹتے ہوئے) میں جا رہی ہوں ـ

ضیائی :ـ (رقت سے) تم کہیں ہو ـ دنیا کے کسی کنارے پر ـ تم مجھ سے قریب ہو گی ـ

بیگم :ـ (رومال سے آنکھیں رگڑتے ہوئے) میرے ڈرامہ سرکل کی خبر رکھئے گا ـ مس رحمان کو زیادہ ہاپڑ اپ نہ ہونے دیجئے گا ـ

ضیائی :ـ تمہارا ڈرامہ سرکل مجھے جان سے زیادہ عزیز رہے گا شبنو ــــ اور رہی مس رحمان اس سے تو مجھے یوں ہی نفرت ہے ـ تم رو نہیں ـ

بیگم :ـ (دو چار سسکیاں لے کر) میری موٹر کو ٹھیک سے رکھئے گا ـ

ضیائی :ـ (بڑے جوش سے مگر گھبرائی ہوئی آواز میں) کل سے تمہاری موٹر میرے پاس ہے ـ دیکھ لو جا کر، کوئی خرابی ہوئی اس میں؟

بیگم :۔ (رومال سے ناک پونچھ کر اور ٹھنڈی سانس لے کر) خرابی نہیں ہوئی تو آئندہ ہو جائے گی۔

ضیائی :۔ (دم بخود کر) کیسے کیا انجن میں کچھ گڑبڑ ہے ؟

بیگم :۔ (رقت سے) اگر آپ نے اگلی سیٹ پر اپنی چارمنگ بیگم صاحب کو بٹھایا تو خرابی نہیں ہوگی۔

ضیائی :۔ اوہ (مسکرا کر ذرا قریب آتا ہے)

بیگم :۔ (اسی غمگین انداز سے) اس موٹر کی اگلی سیٹ پر میں رضا کے پہلو میں بیٹھا کرتی تھی تو کیسا اچھا لگتا تھا۔ اور اب وہ بیٹھیں گی آپ کی بیگم ــــ

ضیائی :۔ (شدید عزم سے) نہیں بیٹھے گی کبھی نہیں۔ تمہاری جگہ وہ کبھی نہیں لے سکتی۔ اب میں ڈرائیو کروں گا اور تم امریکہ میں رہ کر بھی میرے ساتھ بیٹھی ہوگی۔ تصور تو کسی کی ملکیت نہیں شہنو۔ (لمبی سانس لے کر چھت کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے)

بیگم :۔ (رومال دوبارہ آنکھوں کی طرف لے جا کر) وہ جو موٹر کے شیشے پر جاپانی لباس والی گڑیا لٹکی ہے وہ اتار کر پھینک دی جائے گی۔

ضیائی :۔ کون کہہ رہا ہے ؟

بیگم :۔ (سسکتے ہوئے) کوئی کہے یا نہ کہے۔ مجھے معلوم ہے کیونکہ آپ کی یاسمین بیٹی کو نکٹے چپٹے جاپانی بُرے لگتے ہیں۔ ایک دن کہہ رہی تھیں کہ یہ گڑیا کیوں لٹکائی ہے موٹر میں ــــ ہائے ایسی پیاری تو ہے وہ گڑیا۔ رضا میرے لئے جاپان سے لائے تھے۔

(لمبی سانس لے کر اطمینان سے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور رومال سے کھیلنے لگتی ہے)

ضیائی :۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) اس موٹر کے سلسلے میں تمہاری جذباتی وابستگیوں کو ٹھیس نہ لگنے دوں گا شہنو ــــ یہ فخر میرے لئے کچھ کم نہیں ہوگا کہ میں تمہاری جذباتی وابستگیوں کا محافظ ہوں ــــ اس موٹر میں بیٹھ کر میں تمہارے قریب ہوں گا ــــ میں جب چاہوں گا تصور میں تمہیں سینے سے لگاؤں گا۔ پھر تم مجھ سے یوں نہ بھاگو گی۔

بیگم :۔ (ذرا اجنبیت سے) ایسی باتیں نہ کیجئے میں بُرا مان جاؤں گی۔

(فدا کے اندر آنے سے قبل ہی باہر سے مکالمہ شروع ہوتا ہے)

فدا :- اجی میں نے صاف جواب دے دیا (اندر آ کر) کہنے لگے بارہ ہزار دوں گا۔ بیگم صاحبہ سے کہہ دو۔ میں نے کہا ہوا کھاؤ بیٹے میاں۔ بارہ ہزار پر تو پہلے ہی سودا ہو گیا ضیائی صاحب سے (نیپکن کی نشست بدلتے ہوئے) اتنا سا منہ نکل آیا میاں آرٹش، (آرٹسٹ) کا۔ منہ بڑے آئے موٹر لیں گے کل تک جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے منہ دھو آئیں ہمارے صاحب کی موٹر لیں گے۔ اجی موٹر لے سکتے ہیں تو ہمارے ضیائی صاحب۔ پوتڑوں کے رئیس تھے کسی زمانے میں۔ جی ہاں —— (ضیائی کی طرف جھک کر) حضور موٹر پہ کپڑا مار دوں ؟

ضیائی :- (کچھے ہوئے بیٹھے ہیں) آں ؟ ہاں۔

(فدا جاتا ہے)

یہ ۵۸ء کا ماڈل ہے نا شبنو۔

بیگم :- (سوئیٹر اور سلائیاں اٹھا کر) لیجئے۔ آپ اور کیا یاد رکھیں گے بھلا ؟ کل سے موٹر لئے گھوم رہے ہیں اور یہ بھی بھول گئے کہ ۵۸ء کا ماڈل ہے —— یاد نہیں کتنے انتظار کے بعد تو لائسنس ملا تھا —— ہائے مجھے اس موٹر سے کتنی محبت تھی۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے پالش کرتی۔ کبھی میں نے اس میں موٹے لوگوں کو لفٹ نہ دی کہ اسپرنگ نہ ڈھیلے ہو جائیں اور رضا صاحب اتنے محتاط کہ اسے خراب سڑک تک پہ نہ لے جاتے خواہ کتنا ہی چکر کاٹ کر گھر آنا پڑتا۔

ضیائی :- (گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے) ویسے اس کا ایک ایکسیڈنٹ بھی تو ہو چکا ہے۔

بیگم :- (سلائیاں روک کر) ایکسیڈنٹ۔ کب ؟ اوہ اچھا یاد آیا۔ وہ۔ وہ تو معمولی سی ٹکر تھی۔ مڈگارڈ ذرا سا پچک گیا تھا۔ فوراً ٹھیک کروا لیا تھا۔

ضیائی :- ہاں واقعی پتہ بھی نہیں لگتا کہ ایکسیڈنٹ والی گاڑی ہے۔

بیگم :- بالکل نئی گاڑی لگتی ہے۔ بلکہ سال ڈیڑھ سال چلی ہوئی گاڑی کو آج کل پرانا ہی کون

کہتا ہے۔ رضا کے ایک دوست تیرہ ہزار دینے کو تیار تھے۔

ضیائی:۔ (صوفے پر آرام سے ٹیک کر) تو انہی کو دے دی ہوتی شبنو۔

بیگم:۔ (پیار سے) کیسے دے دیتی ضیائی صاحب۔ میں نے رضا سے کہا کہ پہلے ضیائی صاحب نے موٹر مانگی ہے اس لئے انہی کو دیدی جائے گی ـــــ اور پھر دیکھئے کوئی دوسرا اس موٹر کے سلسلے میں میری جذباتی وابستگیوں کا خیال کیسے رکھتا؟

ضیائی:۔ (لمبی سانس لے کر) ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر ایک بات کہتے ہوئے میں جھجک رہا تھا شبنو۔

بیگم:۔ ارے واہ مجھ سے بھی غیریت برت رہے ہیں آپ۔

ضیائی:۔ (بچوں کی طرح انگلیاں مروڑتے ہوئے) میرے پاس صرف گیارہ ہزار روپے ہیں۔

بیگم:۔ (سوئٹر ایک طرف رکھ کر) صرف گیارہ ہزار ـــــ پھر تو آپ کو ایک ہزار روپیہ قرض لینا پڑے گا۔ یہ تو بری بات ہے؟

ضیائی:۔ بری بات تو یہ ہے شبنو کہ میں قرض لینے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اگر تمہاری موٹر گیارہ ہزار کی ہوتی تب بھی۔

بیگم:۔ (دوبارہ سلائیاں اٹھا کر) میں نے تو رضا سے منوا لیا تھا کہ کار آپ کو بارہ ہزار میں ہی دیدیں۔ آپ نے پہلے خود ہی کہا تھا کہ بارہ ہزار میں دیدو (تیزی سے بنتی ہے)

ضیائی:۔ ہاں کہا تو تھا پھر آج بینک بیلنس دیکھا تو خیال آیا (سنبھل کر) میں تمہاری کار کے سلسلے میں ذرا جذباتی ہوں نا شبنو ـــــ مجھے تو اس کا بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔

بیگم:۔ (ذرا تیز ہو کر) ارے پھر ایکسیڈنٹ کا ذکر لے بیٹھے آپ۔ میں کوئی آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں، معمولی سی رگڑ لگی تھی۔ میں کوئی آپ کو لوٹنا چاہتی ہوں۔

ضیائی:۔ (جیب میں ہاتھ ڈال کر سگار نکالتے ہوئے) اب کیا لوٹو گی، لوٹ تو پہلے ہی لیا تھا۔ (سینے پر سگار سمیت ہاتھ رکھ کر) اب یہاں کیا رہ گیا ہے شبنو۔

بیگم:۔ (ضیائی کی طرف دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستی ہے)

ضیائی :۔ (برا مان کر) ہنس رہی ہو (صوفے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے جیسے ابھی چلا جائے گا۔ اسی لمحے عقبی
دروازے پر فدا نمودار ہوتا ہے)
بیگم :۔ (ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) ہائے اللہ کیسے پرانے تھیٹر یکل انداز
سے باتیں کرتے ہیں آپ ـــ پھر کہتے ہیں ہنستی ہو۔
(پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے اور ضیائی بے بسی میں دھم سے صوفے پر
بیٹھتا ہے)
فدا :۔ (دروازے کے پاس ہی سے دونوں ہاتھ اٹھائے اندر دوڑتا ہے) آہستہ ـــ حضور
آہستہ۔ صوفے کا کوئی اسپرنگ ٹوٹ جائے گا۔
بیگم :۔ (غصے سے) فدو بابا!
ضیائی :۔ (بوکھلا کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)
فدا :۔ نہیں حضور مطلب یہ ہے کہ بیٹھیے ضرور مگر ذرا خیال سے ـــ کوئی اسپرنگ ٹوٹ
گیا تو بٹیا بیگم کی سہیلی بیگم ملک صوفے کی قیمت میں سے دس بیس روپے راتوں
رات واپس منگوالیں گی۔
بیگم :۔ (غصے سے کھڑے ہو کر) تم پھر باتیں بنانے آگئے فدو بابا۔ کوئی کام نہیں تم کو۔ اتنا کام
پڑا ہے۔
فدا :۔ یہی بات تو میں کہہ رہا ہوں۔ کام ہی کرنے تو آیا ہوں۔ تنی دیر سے ٹرک والوں کو بہلا
رہا ہوں کہ ابھی سامان لدوانے میں باقی کا ـــ مگر اب وہ جا رہے ہیں کہتے ہیں،
کب تک انتظار کریں۔
بیگم :۔ (بوکھلا کر) ارے تو کس نے کہا تھا انتظار کروانے کو ـــ اٹھواؤ سامان۔
(فدا دروازے کے قریب جا کر اشارہ کرتا ہے۔ دو مزدور اندر
آتے ہیں۔ اور آتے ہی ضیائی کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں
فدا ایک "سیٹی" اٹھا کر بڑے ادب سے ضیائی کے سامنے پیش کرتا
ہے اور ضیائی صوفے سے اٹھ کر سیٹی پر ٹک جاتا ہے۔ فدا سنیٹر

ٹیبل پر نیپکن کا ہاتھ مار کر اسے اٹھاتا ہے۔ دونوں مزدور صوفہ پکڑا
کر فلاکے پیچھے چل دیتے ہیں ۔ یہ سب چند لمحوں میں تیزی سے ہوتا
ہے۔
(ٹھنڈی سانس لے کر ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہر چیز کوڑیوں کے مول گئی ۔ پانچسو کا تو
یہ صوفہ ہی بنوایا تھا۔

ضیائی :۔ (بے جلا سگار انگلیوں میں گھماتے ہوئے لمبی سانس لیکر) ہاں ۔ یہ تو ہوتا ہی ہے
(دوسری جیب میں ماچس تلاش کرنے کو ہاتھ ڈال کر نکال لیتا ہے)

بیگم :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہوتا ہے۔

ضیائی :۔ سیکنڈ ہینڈ جو ہو جاتا ہے سب سامان ــــ اس لئے قیمت گر جاتی ہے۔

بیگم :۔ ہنھ ــــ اسے سیکنڈ ہینڈ سامان کون کہے گا۔ دوکان پر دو برس چیز پڑی رہے
تو قیمت نہیں گھٹتی۔

ضیائی :۔ در اصل لوگوں کی ذہنیت ہی خراب ہوتی ہے ۔

بیگم :۔ اور کیا بس لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ہمیں چیزیں فروخت کرنا ہیں کیونکہ ہم باہر جا رہے
ہیں اور ہمیں یہاں کچھ روپیہ بھی ادا کرنا ہے اس لئے ہر ایک سو کی چیز کے پچیس دینا
چاہتا ہے۔ اب دیکھئے نار رضا صاحب کے دوست کسی دلال کے ذریعے کار خرید نے
تو ایک دو سال چلی ہوئی کار کے چودہ ہزار روپے جیب سے جھاڑ دیئے مگر انہوں نے
ہماری کار کے تیرہ ہزار روپے لگائے۔ اور یہ میاں بارہ ہزار پر ضد کر رہے ہیں ۔ ۵۱
تو کہو آپ بیچ میں آ گئے ضیائی صاحب اور کار ہم نے آپ کو دیدی۔

ضیائی :۔ (کھنکھار کر) شہناز بیگم ! میری بات مانو گی۔

بیگم :۔ جی !

ضیائی :۔ میرا خیال ہے کہ موٹر تیرہ ہزار والے صاحب کو دے دو۔ میں اپنی وجہ سے تمہارا
نقصان نہیں کرنا چاہتا۔

بیگم :۔ ارے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو ویسے ہی ذکر کیا (مسکرا کر) آپ کو کیا ہو

ہزار ہیں کار دے کر بھی مجھے نقصان کا احساس نہیں ہوگا ـــــ (سنجیدہ ہوکر) ویسے تیرہ ہزار والے صاحب کو تو رضا نے اسی دن جواب دے دیا تھا۔ جب آپ نے بارہ ہزار قیمت لگا کر موٹر خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ضیائی:۔ (سر ہلا کر) ہاں مجھے تمہاری موٹر سے دلچسپی تو ہے مگر تمہارا نقصان مجھے گوارا نہیں۔ پھر ہے میاں کے بارے میں کیا خیال ہے وہ تو بارہ ہزار دے رہے ہیں؟

بیگم:۔ (دیوان پر دھم سے بیٹھ کر) ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ابھی فدو بابا نے آپ کے سامنے ہی میاں کو جواب نہیں دے دیا۔

ضیائی:۔ (بے جلا سگار دانتوں میں دبا کر) ارے۔ ہاں۔ واقعی یہ بات تو ہے۔

بیگم:۔ میں رضا صاحب سے کہوں تو وہ گیارہ ہزار پر آپ کی خاطر مان جائیں گے ـــــ

ضیائی:۔ (چونک کر) میری خاطر؟ (آگے جھکتے ہوئے) ایک بات کہوں شہناز بیگم؟ میں نے زندگی میں کسی کا احسان نہیں لیا۔ کڑے وقت میں بھی احسان لینے کو جی نہیں چاہا۔

بیگم:۔ (آنکھیں پھاڑ کر) احسان؟ یہ احسان کہاں سے بیچ میں ٹپک پڑا ضیائی صاحب؟ آپ نے خود ہی بارہ ہزار میں ہماری موٹر خریدنا چاہی۔ ہم مان گئے۔ جو گاہک تھے انہیں جواب دے دیا۔ آپ نے اب ایک ہزار گھٹا دیا۔ میں نے کہا کہ رضا سے منوا لوں گی تو آپ احسان نہ لینے کی دھمکی دے رہے ہیں۔

(مندرجہ بالا مکالمے کے دوران میں فدا دونوں مزدوروں کے ساتھ دوبارہ اندر آتا ہے۔ دونوں مزدور صوفے کے دونوں پیس اٹھا کر باہر جاتے ہیں اور فدا کونے کی میز اٹھائے ان کے پیچھے نکل جاتا ہے۔ اس دوران میں خاموشی کے لمحوں میں بیگم مضطربانہ طریقے سے سوئٹر بنتی ہے اور ضیائی بے جلے سگار کے کش لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کوشش میں ناکام ہو کر سگار کو اوپر کی جیب میں رکھ لیتا ہے اور اٹھ کر شہناز کے قریب جاتا ہے)

ضیائی:۔ شہناز بیگم تم بُرا مان گئیں۔ میں نے احسان کا ذکر یوں ہی احتیاطاً کہا تھا۔ مجھے

معلوم ہے کہ تم چاہتی ہو تمہاری موٹر میرے پاس رہے ۔۔۔ دراصل میں خود شرمندہ ہوں میرے پاس روپے امید سے کم نکلے۔ تم کہو تو میں بنے میاں سے خود کہہ دوں کہ وہ تمہاری موٹر خرید لیں۔

بیگم :۔ (بگڑ کر) رہنے دیجئے مجھے آپ کے احسان کی ضرورت نہیں۔ بڑے آئے بنے میاں لونگچڑے میری کار میں بیٹھیں گے ۔ (روہانسہ بنا کر تیزی سے ہنستی ہے)

ضیائی :۔ (لمبی سی سانس لے کر) ہاں یہ بات تو ہے۔

بیگم :۔ (اور بگڑ کر) کیا بات ہے؟

ضیائی :۔ یہی کہ بنے میاں لونگچڑے تمہاری موٹر میں بیٹھیں گے۔

بیگم :۔ (اُسی لہجے میں) آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میرے جذبات کی ہتک کر رہے ہیں۔

ضیائی :۔ (سیٹی پہ بے حد اطمینان سے بیٹھ کر) تم غصے میں بھی کتنی پیاری لگتی ہو؟

(اسی وقت فدا دونوں مزدوروں کے ساتھ اندر آتا ہے ایک مزدور ایک سیٹی اٹھاتا ہے۔ دوسرا ضیائی کی پشت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فدا سینٹر ٹیبل کے ساتھ دونوں چھوٹے میس اٹھا کر موقع کی نزاکت کا احساس کرتا ہے اور ضیائی کے سامنے جھک کر دونوں ہاتھوں سے مع کھی نیابیوں کے اسے دیوان پہ تشریف رکھنے کا اشارہ کرتا ہے ضیائی اٹھتا ہے تو مزدور جلدی سے ضیائی والی سیٹی اٹھا کر باہر جاتا ہے۔ فدا اور مزدور اسکے پیچھے تیزی سے جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل چند لمحوں میں تیزی سے ہوتا ہے۔
ضیائی بیگم کی طرف دیکھتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ دیوان کے قریب پہنچ جاتا ہے)

(کھنکھار کر) شہناز بیگم فدا نے اِدھر بیٹھنے کا حکم دیا ہے۔ بیٹھ جاؤں ۔۔۔ یہ شرف یاد رکھوں گا۔

(بیگم ایک دم مسکرا دیتی ہے اور دیوان پہ ذرا الگ ہٹ کر

بیٹھ جاتی ہے)

ضیائی:۔ (دیوان پر بیٹھتے ہوئے) غصے کے بعد مسکراتی ہو تو کتنی حسین لگتی ہو۔

(بیگم مسکراہٹ ضبط کرتے اور باوقار بننے کی کوشش کرتی ہے)

(ٹھنڈی سانس لے کر) اگر میرے پاس بارہ ہزار روپیہ ہوتے تو میں تمہارے یہ ہر آن بدلتے ہوئے روپ دیکھنے سے محروم رہ جاتا۔

بیگم:۔ (پیچھے کھسکتے ہوئے کچھ شرما کر) اوہ ابھی خواہ مخواہ ٹریجڈی طاری کر رہے ہیں اپنے اوپر۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ رضا گیارہ ہزار میں موٹر آپ کو دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

ضیائی:۔ (اور لمبی سانس لے کر) تم جیسی بیوی اپنے شوہر سے کیا کچھ نہیں منوا سکتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ گیارہ ہزار بینک میں میرے نام جمع تو ہیں لیکن وہ سب میرے نہیں۔

بیگم:۔ (سوئٹر اور سلائیاں ایک طرف رکھ کر اور دور ہٹتے ہوئے) جی — جی کیا کہا آپ نے؟

ضیائی:۔ مسئلہ تو یہی ہے شہناز بیگم کہ میرے اکاؤنٹ میں ایک ہزار روپے جو ادبھائی نے امانتاً جمع کروائے تھے۔ آج صبح صبح کہنے آئے تھے کہ روپے نکلوا دو لڑکے کی ملازمت کے لئے ضمانت جمع کرانے ہے۔

بیگم:۔ (ایک دم کھڑے ہو کر خوابناک آواز میں) رہ گئے دس ہزار۔

ضیائی:۔ (مجرمانہ انداز سے سر جھکا کر) ہاں یہ بات تو ہے — (رکتے رکتے) اور تم جانتی ہو کہ میری بیوی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانے میں کیسی استاد ہیں۔

بیگم:۔ (اسٹیج کے آخری کونے پر آ کر) بے شک۔ بے شک (چھت کی طرف دیکھتی ہے)

ضیائی:۔ (سر جھکا کر مجرمانہ آواز میں) پانچ سو روپے اس نے جمع کرائے تھے میرے پاس — موٹر خریدنے کا ذکر سنا تو کہنے لگی کہ میرے روپے دیدو۔ لڑکیوں کے کپڑے بنانے ہیں۔

بیگم:۔ (تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتی ہے اور پھر وہاں کھڑے ہو کر) رہ گئے ساڑھے نو ہزار (اپنی مٹھیاں ہسٹریا کے انداز سے بھینچ لیتی ہے)

ضیائی:۔ (معصومیت سے) ہاں یہ بات تو ہے شہنو۔

بیگم :۔ (زور سے) اوہ ــــــ

(مڑ کر میز تلاش کرتی ہے اور پھر دوڑ کر اپنی بندھی ہوئی مٹھیاں خالی بک شیلف پر دے مارتی ہے لیکن خود ہی اپنے ہاتھوں کی چوٹ سینکنے کو منہ سے گرم بھاپ دیتی ہے اور ضیائی کی طرف سے پیٹھ کرکے بک شیلف پر جھک جاتی ہے)

ضیائی :۔ ارے ــــــ چہ چہ ۔

(دیوان سے اٹھ کر دو چار قدم بیگم کی طرف بڑھتا ہے اور پھر افسوس سے سر ہلاتا وہیں جم کر رہ جاتا ہے اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگتا ہے ۔ اس دوران میں مزدور عقبی دروازے سے کمرے میں جھانکتے ہیں اور دیوان خالی دیکھ کر اسے اٹھا کر کھسک لیتے ہیں)

ضیائی :۔ اچ ۔ اچھا ۔

(ٹھنڈی سانس لے کر الٹے قدموں چل کر دیوان پر بیٹھنا چاہتا ہے ۔ لیکن دیوان کی عدم موجودگی محسوس کرکے سنبھل جاتا ہے اور بک شیلف پر جھکی ہوئی بیگم کو دیکھ کر بڑبڑانے لگتا ہے)

(رعب کر کر (لبسور کر) میرے پاس بارہ ہزار روپیہ ہوتا تو تمہیں مجھ پر اتنا غصہ کیوں آتا ۔ اس ظالم معاشرے میں ہر چیز روپوں کی کمی یا زیادتی سے کھوئی اور خریدی جا سکتی ہے ۔ یہ تمہاری اتنی عزیزہ موٹر خریدنے کے لائق نہیں ۔ میں تمہیں تصور میں بھی اپنے پہلو میں نہیں بٹھا سکتا ۔ کیونکہ میرے پاس بارہ ہزار روپیہ نہیں (لمبی سانس لے کر) یہ ظالم معاشرہ ــــــ

[illegible] (شیلف پر مٹھیاں مار کر چیختے ہوئے) بند کیجئے اپنی یہ داستان ۔

[illegible] بیگم کی طرف دو قدم بمشکل بڑھ کر) یہ داستان کبھی ختم نہیں ہوگی ۔ بیگم شہناز رضا ۔ اس وقت میرا دل ٹوٹ گیا ہے (چھت کی طرف دیکھ کر) تمہارے رضا صاحب کے بینک بیلنس سے تین ہزار روپے کی کمی ہو جانا ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت

ہے اور اس حقیقت نے ہم دونوں کی دنیا ہی بدل دی۔

بیگم:۔ (بے صبری سے پلٹ کر یک بشیلف پر کہنی رکھ کر) یہ تین ہزار، تین ہزار کی رٹ کیا لگا رکھی ہے جناب — ڈھائی ہزار کم کر رہے ہیں آپ۔ حساب جوڑ لیجئے۔ بینک میں آپ کے بارہ کے بجائے گیارہ ہزار نکلے؟ ایک ہزار یہ کم ہوا۔ ایک ہزار آپ کے جواد بھائی کے کہئے دو ہزار ہوئے نا — پھر پانچسو آپ کی بیوی کے نکل گئے۔ ہو گئے ڈھائی ہزار — اب آپ باتوں باتوں میں پانچسو اور یوں اڑا گئے جیسے روپیہ نہ ہوا گھر کا کوڑا ہو گیا۔

ضیائی:۔ (سنجیدگی سے) روپیہ کوڑے سے بدتر نہیں تو کیا ہے۔ دنیا روز رہی ہے کہ روپے کی قیمت پیسے برابر بھی نہیں رہی — تم نے اقتصادیات پڑھی ہوتی تو بات تمہاری سمجھ میں آتی۔

بیگم:۔ اچھا اچھا میں جاہل سہی — مجھے تو یہ بتائیے کہ حساب میں آپ نے بارہ ہزار سے ڈھائی ہزار نہیں گھٹائے؟ دو ہزار اور پانچسو کتنے ہوتے ہیں۔

ضیائی:۔ پورے تین ہزار (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) کیونکہ ساڑھے نو ہزار میں سے پانچسو میری بیٹی یاسمین کے ہیں — اور ....

بیگم:۔ (دانت بھینچ کر) اور — اور

(بیگم مٹھیاں بھینچ کر ضیائی کی طرف غصے میں بڑھتی ہے لیکن اندر آتے ہوئے فدا اور مزدوروں کو دیکھ کر بمشکل کھڑکی کی طرف منہ پھیر کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ دونوں مزدور مشین کی سی تیزی سے یک شیلف اٹھاتے ہیں فدا اس پر سے لڑھکتی ہوئی تصویر تھامتا ہے۔ نیپکن سے اسے جھاڑتا ہے اور چھت سے لو لگائے ہوئے ضیائی کے ہاتھ پر تصویر رکھ کر ہوا کی طرح باہر نکل جاتا ہے۔

(منہ پھیرے پھیرے سخت آواز میں) ضیائی صاحب۔

ضیائی:۔ (معصومیت سے تصویر کو تکتے ہوئے) جی، جی فرمایئے۔

بیگم :- (منہ پھیرے پھیرے) دیکھئے ضیائی صاحب عین وقت پر آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک
کیا ہے اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آپ کو ـــ آپ کو میں ـــ

ضیائی :- (چھت کی طرف دیکھ کر) شہناز بیگم اگر سب انسان ایک دوسرے کو سمجھ لیا کرتے
تو یہ دنیا اتنی پیچیدہ نہ ہوتی۔ آپ اگر یہ بات سمجھ لیتیں کہ مجھے آپ ہی نہیں، آپ
کی ایک ایک چیز سے کتنا لگاؤ ہے، آپ کی موٹر مجھے کیوں عزیز ہے تو ـــ

بیگم :- (ایک دم پلٹ کر بات کاٹتے ہوئے) ضیائی صاحب آپکے پاس چیک بک ہے اس وقت؟

ضیائی :- (اثبات میں سر ہلا کر لمبی سانس لیتا ہے) جی۔

بیگم :- شکر ہے ـــ اچھا دیکھئے یہ ذمہ داری بھی میرے ہی سر ہو گی۔ میں رضا صاحب کو
بات سمجھا دوں گی۔ آپ کے پاس نو ہزار آپ کے ہیں۔ آپ اسی رقم کا چیک کاٹ
دیجئے۔ اور موٹر اپنے پاس ہی رہنے دیجئے۔

(ضیائی بے حد سعادت مندی سے ایک ہاتھ سے بیگم کی تصویر سینے
سے دبائے دوسرا ہاتھ جیب میں ڈالتا ہے۔ ساری جیبیں ٹٹول کر آخر
بے جلا سگار نکال کر مفکرانہ انداز سے دانتوں میں دبا لیتا ہے۔ بیگم سوالیہ
نشان بنی ضیائی کی طرف دیکھتی ہے۔ اسی لمحے فدا کی رہنمائی میں دونوں مزدور
اندر آتے ہیں اور دونوں مل کر زمین پر بچھا ہوا قالین گول کرنا شروع کر
دیتے ہیں۔ بیگم خود ہی قالین پر سے ہٹ جاتی ہے۔ لیکن ضیائی دانتوں
میں بے جلا سگار دبائے بیگم کی تصویر کو دیکھنے اور مسکرانے میں مصروف
رہتا ہے۔ مزدور پھرتی سے قالین کو ضیائی کے قدموں تک گول کرنے
کے بعد رک جاتے ہیں۔ فدا دروازوں کے پردے اتار کر تہہ کر رہا ہے وہ
پردہ ہاتھ میں لئے آگے آتا ہے اور پردے والا ہاتھ لہرا کر ننگی زمین کی
طرف اشارہ کرتا ہے۔ ضیائی کھنکھار کر قالین پر سے ہٹتا ہے مزدور
قالین کندھے پر رکھ کر نکلتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے فدا پردے لئے ضیائی
کو غور سے دیکھتا باہر چلا جاتا ہے)

بیگم :۔ ضیائی صاحب ابھی میں نے چند منٹ پہلے کیا کہا تھا۔

ضیائی :۔ غالباً چیک بک کے متعلق پوچھا تھا ۔۔۔ (آہستہ سے) کتنی خوبصورت تصویر ہے!

بیگم :۔ ضیائی صاحب میں پوچھ رہی ہوں کہ پھر وہ چیک بک کہاں گئی۔

ضیائی :۔ جیب میں ہو گی شہناز بیگم (آہستہ آہستہ قریب آتے ہوئے) مگر میں سوچتا ہوں شہناز بیگم اپنا پورا بینک بیلنس تمہارے میاں کے نام لکھ دوں تو میرے پاس موٹر کا انجن "اوورہال" کرانے کے پیسے بھی نہ بچیں گے جب کہ موٹر کا ایکسیڈنٹ ہو چکا ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو اور بات سمجھنے کی کوشش کرو تو میں عرض کروں کہ میرے بینک میں۔

بیگم :۔ (غصے سے بے قابو ہو کر) آپ کے بینک میں خاک نہیں۔ بار بار ذکر نہ کیجئے بینک کا۔

ضیائی :۔ (بُرا مان کر) آپ میرے بینک بیلنس پر خاک ڈال رہی ہیں ۔۔۔ مجھے کوس رہی ہیں (چھت کی طرف دیکھ کر) صرف اس لئے نا کہ آپ سمجھتی ہیں موٹر نو ہزار میں بیچ کر مجھ پر احسان کر رہی ہیں۔ مگر میں نے بُرے سے بُرے وقت میں بھی کسی کا احسان نہیں لیا۔

بیگم :۔ (بے بس ہو کر) اور میں رضا سے کیا کہوں گی۔ میں نے کتنی حماقت کی آپ پر بھروسہ کر کے ۔۔۔ اب میری مجبوری دیکھ کر آپ ۔۔۔

ضیائی :۔ (بات کاٹ کر بڑے افسوس سے) میں کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا ۔۔۔ مجھے نہیں چاہیئے موٹر دوٹر ۔۔۔ میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں یہاں سے چلے جانے کی اذیت برداشت کر لوں گا مگر آپ کے آنسو مجھے گوارا نہیں ۔۔۔

(ضیائی دروازے کی طرف آہستہ سے مڑتا ہے اسکے ہاتھوں میں بیگم کی تصویر ہے اور ہونٹوں میں بے جلا سگار۔ بیگم ضیائی کو جاتا دیکھتی ہے تو غصے سے بے قابو ہو کر مٹھیاں تانے ضیائی کی طرف بڑھتی ہے اسی لمحے جیری دائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آتا ہے اسکے ہاتھ میں دیا سلائی کی ڈبیہ ہے۔ بیگم جھجک کر رک جاتی ہے اور اپنا چہرہ معمول پر لانے کی کوشش میں بھدے طریقے سے مسکراتی ہے ضیائی جیری سے ڈبیہ مانگ کر اپنا سگار سلگا لیتا ہے اور بیگم کی تصویر

(چیری کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے)

چیری:۔ تھینک یو انکل ضیائی۔

ضیائی:۔ (چیری کے ہاتھ میں دیاسلائی کی ڈبیہ دیکر) تھینک یو چیری۔

(ضیائی دروازے تک جاتا ہے)

ضیائی:۔ چیری بیٹے ممی سے کہو اگر موٹر آٹھ ہزار میں ہوتی تو میں ——

(بیگم بندھی ہوئی مٹھیاں رخسار دل سے لگا کر جھک جاتی ہے اسی لمحے فدا کھڑکی کے باہر سے کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ کر کمرے کا آخری پردہ اُلٹتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے دوبارہ سر کھڑکی میں ڈال کر پکارتا ہے۔

فدا:۔ اجی یہی تو میں کہہ رہا ہوں بٹیا بیگم۔

(بیگم چونک کر فدا کو دیکھتی ہے اور ایک قدم شدید غصے کے عالم میں فدا کی طرف بڑھتی ہے۔)

فدا:۔ (ڈر کر) اجی تو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اتنی سی بات پوچھنا تھی کہ بتّے میاں کو کیا جواب دے دوں۔ بڑی دیر سے باغ میں بیٹھے سوکھ رہے ہیں بے چارے آرٹسٹ صاحب۔

(سب فدا کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں —— ضیائی کے منہ سے سگار گر پڑتا ہے اور بیگم بے تحاشہ خوش ہو کر "فیدو بابا" کہہ کر اس کی طرف بڑھتی ہے اور پردہ گر پڑتا ہے)

نغمہ کا سفر

جیلانی بانو

یہ ایسا وقت تھا کہ اس پرانی ڈیوڑھی کے مکین نہ تو چراغ جلا سکتے تھے نہ بجھا سکتے تھے۔
بارش آنسوؤں کی طرح ڈیوڑھی کی کگروں سے بہہ رہی تھی۔
اونچی سی نوٹی پھوٹی بد وضع ڈیوڑھی جیسے کھڑے کھڑے اونگھنے لگی تھی۔ نچلی منزل کی سلاخوں دار کھڑکی میں منہ اڑائے نوید کھڑی تھی۔ اتنی معصوم سی تر و تازہ صورت اتنی پرانی بدصورت کھڑکی سے یوں چمک رہی تھی جیسے وہ کوئی پریوں کی کہانی والی شہزادی ہو جسے ایک ظالم دیو لاکھوں برس پہلے یہاں قید کر گیا۔ مگر یوم نجات تو آچکا تھا۔ وہ بھی اس ڈیوڑھی سے، رخصت ہونے کی تیاریاں کر چکی تھی۔ اب وہ اس کھڑکی میں کھڑی ہو کر کبھی ریڈی کا انتظار نہ کرے گی۔ برہا کے گیت نہ گنگنائے گی۔ اس کے ادھورے نغمے اب یہاں سے پرواز کر جائیں گے — نوید نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کالی چتیوں والی چھپکلی ایک چھوٹی چھپکلی کے پاس بیٹھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے دادی کی طرح اسے سنا رہی ہو کہ بی بی، لو آج ایک اور کہانی ختم ہوئی یہاں!
جب کبھی ریڈی نہ آتا، بھیا کی طبیعت خراب ہو جاتی یا ممتا کوئی اداس سا گیت شروع کر دیتی تو نوید پناہ ڈھونڈنے اس کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی۔ اس اندھیرے کمرے میں آ کر اسے بڑا سکون ملتا تھا، جیسے ساری دنیا سے ناطہ توڑ کر وہ قبر میں جا چھپی ہو۔ یہ کمرہ پرانے سامان سے بھرا پڑا تھا۔ دادی کی کہانی کے تو سارے ذرے اسی کمرے کی سیلی مٹی میں ملے ہوئے تھے۔ دادی جب کبھی اپنی کہانی کا کوئی اہم باب شروع کرتی تھیں تو بار بار اس کمرے کا حوالہ دیتی جاتیں۔
"نوید پاشا! وہ تہہ خانے والے کمرے میں سونے کی ڈنڈی کا پنکھا ہے نہیں! وہیچ

اٹھا کر میں تمہارے دادا حضرت کو ماری تھی۔"

"اچھا اچی ۔۔۔" نوید بڑے تعجب کا اظہار کرتی۔ جیسے اس پنکھے کو اٹھا کر اس نے سیکڑوں بار اپنے ہونے والے دولہا کو مارنے کی مشق کی ہو۔ حالانکہ وہ پنکھا اپنے ساتھ کمرے کی ساری قیمتی چیزوں کو اڑا کر لے جا چکا تھا۔ ان چیزوں کا پل بنا کر ہی تو نوید ڈگری پاس کر چکی تھی۔ تمام برس میٹرک کا امتحان دینے علی گڑھ بھیجی جاتی اور صادق ہر روز تیس چالیس روپے اڑا ڈالتا۔

"اماں کہتی تھیں جب میں پیدا ہوئی تو خاندان میں بڑے جھگڑے پڑے گئے۔ وہ تہہ خانے والے کمرے میں منقش میان والی تلوار ہے نہیں!"

"جی ۔۔۔" نوید کتاب بند کر کے دادی کی بات سننے لگتی۔

"وہی ۔ ارنکال کر چچا حضرت بولے تھے۔ دیکھتا ہوں میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے کس کو آتا ہے زمرد بیگم کو بیاہنے ۔۔۔؟"

اور پھر دادی ہنسنے لگتیں۔ وہی شگفتہ اور بے ساختہ ہنسی۔ اگر دادی دیوار کے پیچھے سے ہنس رہی ہوں تو لوگ یہی سمجھتے کہ کوئی اٹھارہ انیس برس کی لڑکی بلا وجہ قہقہے لگا رہی ہے۔ اور صرف ہنسی ہی نہیں پچھتر برس کی دادی نے اپنے سیاہ بال، آنکھوں کی چمک اور مستی لئے مضبوط دانت ۔ ہر چیز جیسے کسی کی امانت بنا کر رکھ چھوڑی تھی۔

"ہائے اللہ پیدا ہوتے ہی شادی کا سوال اٹھ کھڑا ہوا!" نوید کو اس ہزار بار کی سنی ہوئی کہانی کو ہر بار نئے سرے سے سننا پڑتا۔

"اور کیا ۔۔۔" دادی اپنے کانوں میں جگمگانے والی ہیرے کی بالیاں ہلا کر کہتیں۔ یہ باتیں سناتے وقت ان کے چہرے پر چراغ جل جل کر بجھ جاتے۔ آنکھوں کے آس پاس والی شکنوں میں اضافہ ہو جاتا اور وہ جانے کیوں بالکل جوان چھوکریوں کے انداز میں کرسی پر سمٹ کے بیٹھ جاتیں۔

"تم یوں سمجھو کہ برسوں سے شلجم تپلی کے نواب جس لڑکی کا انتظار کر رہے تھے وہ پیدا ہو گئی۔ دادا حضرت کو دکھ تھا تو یہی کہ ان کے خاندان میں چار پشت سے لڑکی نہ ہوتی

تھی۔ ہمارے بھائی بہنوں کے نام سے واقف ہی نہ تھے۔ باپ بیٹیوں کی محبت سے محروم رہے اور شیش محل کی دولت پر شہر کے جاگیرداروں کی بیٹیاں راج رچتی رہیں۔"

بات کرتے کرتے دادی چھت کو دیکھنے لگتیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں موندنے لگتیں۔ نوید سمجھتی کہ اب وہ اونگھ رہی ہیں۔ مگر اچانک انہیں کوئی سرد ہوا کی لہر کپکپا جاتی اور وہ چونک کر اپنے مفلوج پیر دیکھنے لگتیں۔

"ایک بار جب میں یہی کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی تو اپنے شاعری سکھانے والے استاد تاب کو بھی یہ قصہ سنایا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے پیدا ہونا تھا اس لئے سو برس پہلے سے شیش محل میں کسی اور لڑکی کو پیدا نہ ہونے دیا گیا تو یہ سنکر وہ ہمارا احمق شاعر بہت مرعوب ہوا۔ کہنے لگا یہ تو بہت پرانی کہانی ہے اس سے قبل جب موسیٰ پیدا ہونے والا تھا تو فرعون نے بھی یہی کیا تھا۔ کرشن کو بنسی کی تان چھیڑنا تھی تو بندرابن میں کنس نے ہر ماں کے لبوں سے اس کا ادھورا نغمہ چھین لیا تھا مگر نغمہ اپنا سفر نہیں روک سکتا۔ وہ تو چلتا ہی رہے گا۔ کائنات میں ہمیشہ گونجتا رہے گا۔

پھر دادی نے ایک گہری تھکی ہوئی سانس لی۔ جیسے کھڑکی سے باہر انھوں نے کسی دم توڑتے ہوئے ادھورے نغمہ کو دیکھ لیا ہو۔

"بڑا بے وقوف تھا وہ شاعر۔ مگر میری ہر بات اسے ماننا پڑتی تھی۔ پھر بھی اب لگتا ہے جیسے ابھی کل کی ہی تو بات ہے اور وہ گدھا ابھی تک اپنی بات منوانے کا انتظار کر رہا ہے۔ میں کمبخت تو پاؤں توڑ بیٹھی۔ اس ڈیوڑھی سے باہر کیسے جاؤں!

اس تہہ خانے والے کمرے میں بیٹھ کر نوید کو اکثر یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود دادی ہے اور اسکے چاروں طرف تاب کی بے قرار آنکھیں پہرہ لگائے بیٹھی ہیں۔ وہ اندھیرے کمرے کے ٹوٹے پھوٹے سامان کو گھبرا کے دیکھتی۔ اوپر روشن دان میں سے روشنی کی دو شعاعیں کسی کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی طرح اسے گھورتیں۔ پھر اوپر سے کوئی چوہیا دھم سے کودتی اور نوید کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔ پلستر کے بغیر جھانکتی ہوئی ٹوٹی اینٹوں میں کئی نقش بن بن کے بگڑتے۔ پھر کانسی کے مجسمے میں جان پڑ جاتی اور دونوں ہاتھوں

سے تھوڑی پکڑے وہ یونانی شہزادہ آہستہ سے گھوم کر اسے دیکھتا ـــــ دیکھے جاتا ـــــ
اور نوید جیسے اس کی نظروں کے سحر سے پتھر بن جاتی ۔ اس میں اتنی قوت بھی نہ رہتی کہ نگاہیں
اٹھا سکے ۔ پھر اسے دادی کا غرور یاد آجاتا اور وہ بڑے ناز سے اٹھتی ۔ اس طرح کہ
اپنی نگاہوں کے سحر سے اس شہزادے کو پتھر بنا ڈالتی ۔

کوئی پوچھے کہ جب باہر نکلنے کے بعد گھنٹوں اس کا دل اچھلا کرتا ہے تو وہ کیوں گھستی
ہے اس کمرے میں ! وہ تو چھبیس برس کی ایک مقبول لیڈی ڈاکٹر ہے ۔ کمزور عورتوں
کے دمنوں پر بڑے زور زور کے تھپڑ لگاتی ہے مگر یہ خوبصورت اور ذہین لیڈی ڈاکٹر
اس کمرے میں آکر دس برس کی لڑکیوں کی طرح پرچھائیوں سے کھیلتی ہے ۔ اور ہمیشہ توبہ
کرتی کہ اب کبھی اس کمرے میں نہ جائے گی کیونکہ خواہ مخواہ رات بھر بھیانک خوابوں سے الجھنا
پڑتا ہے ۔ صبح ہسپتال جاکر وہ اپنے ہی لکھے ہوئے نسخے نہ پڑھ سکتی ۔ گھبرا گھبرا کر ریڈی
کو اپنے خواب سناتی تھی اور ہسپتال سے آتے ہی کپڑے بدل کر دادی کے پاس
جا بیٹھتی ۔

ان دونوں بہنوں کے لئے دادی بڑی عجیب سی چیز تھیں ۔ اس گڑیا کی طرح جس سے
لڑکیاں بچپن میں جی بھر کے کھیلتی ہیں اور بڑی ہو کر بھی انہیں الماری سے نکال کر نہیں پھینکتیں
کبھی کبھار یوں ہی بھولے سے ان کا ہاتھ گڑیا پر پڑ جاتا ہے تو پھر بنا سنوار کر اسے کسی
کونے میں چھپا آتی ہیں ۔

جب نوید چھوٹی سی تھی اور اماں دودھ پیتی ہما کو چھوڑ کر چل بسی تھیں تو وہ
دونوں بہنیں دادی کے کولہے سے لگی دن رات کہانیاں سنا کرتیں ۔ دادی کے لحاف میں
ایک طرف ہما دبی ہوتی اور دوسری طرف نوید ۔ مگر صادق دادی کی بور کہانیوں سے اکتا کر
اپنے کھٹولے پر بیٹھا چلائے جاتا ، مگر نوید اور ہما تو دادی کی ہزار بار کی دوہرائی ہوئی کہانی
سنتے وقت ایسے کھو جاتی تھیں کہ ہنکارے تک نہ بھرتیں ۔ انہیں دادی کوئی مافوق
الفطرت ہستی نظر آتی تھیں جن کے پیر عین بیاہ کے دن خود بخود مفلوج ہو گئے تھے ۔ جو
بچپن میں اپنی گاڑی کے آگے گھوڑے کی بجائے آدمی کو جوتا کرتی تھیں اور ان کی گڑیاں خود بخود

اٹھ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کی گڑیا کے بیاہ میں پانچ ہزار روپے خرچ ہوتے تھے۔ اور نوید کے پپا اکثر کہا کرتے تھے کہ لڑکیوں کو بیاہنا کوئی اتنا آسان تو نہیں ہے۔ دس پانچ ہزار تو چاہئیں۔

صادق کو صرف مار دھاڑ اور خوف ناک جنوں کی کہانیاں پسند تھیں۔ اس لئے دادی کی پرانی کہانیوں پر وہ چھیڑخانی شروع کر دیتا۔ کبھی لحاف میں گھس کر نوید کو لاتیں مارتا۔ کبھی ہما کا منہ چڑا دیتا یا پھر اپنے لحاف میں منہ چھپا کر زور زور سے گانے لگتا۔

ایک راجے کا بیٹا پرانے والا گھوڑا
دلیس دیس کی سیر کی خاطر اپنے گھر سے نکلا

اس کی چیخ و پکار پر سب سے زیادہ نوید کو غصہ آتا۔ مگر دادی کی طرح اسے کبھی ڈانٹنا نہ آتا تھا اس لئے ہما جلدی سے اٹھ کر پپا سے صادق کی شکایت کرآتی۔ اگر پپا اخبار میں کسی نئی ایجاد کی ہولناک پڑھنے میں مصروف ہوتے تو ہوں ہاں کرکے ٹال جاتے۔ اور اگر داڑھ کے درد میں تڑپ رہے ہوتے تو اپنی چھڑی اٹھا کر صادق پر پل پڑتے تھے۔ آگے آگے صادق اور پیچھے پیچھے پپا۔ لیکن مار کھا کر بھی وہ نہ دبتا۔ کئی بار اس نے پپا کو دھکا دے دیا۔ خود بھی ان پر مکّے برسانے لگا۔ "نہیں مانوں گا۔ اور کروں گا۔" وہ روتے میں نعرے لگاتا جاتا تھا۔ کسی بات سے ڈرنا اور کسی کی بات سننا صادق نے سیکھا ہی نہ تھا۔ پٹنے کے بعد جب دادی اپنی معجون کھلا کر اسے بہلا دیتی تھیں تو وہ پلنگ پر لیٹا لیٹا پپا کو گالیاں دیتا۔

"پپا، سٹیا — سٹیا — پولیس کو بلاؤ پپا کو پکڑلے۔"
"دیکھئے دادی اب پپا کو گالیاں دے رہا ہے۔" نوید بڑی مظلومی سے کہتی۔
"ہاں دوں گا۔ تجھے بھی دوں گا۔ نمّی۔ نمّی۔ پمّی اُود اُود دد —"
وہ لحاف اٹھا کر اس کا منہ چڑا دیتا۔
"صدقو کا بچہ۔ اللہ کرے فیل ہو جائے۔"

ہما بھی سوچ سوچ کر اسے کوسنے دینے لگتی۔ مگر صادق کا ایک زنّاٹے کا تھپڑ اسے بھی ڈرا دیتا۔

"مجھے تو ایک پیسے میں جادوگر کے ہاتھ بیچ دوں گا۔"
وہ ہما کو ڈراتا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

بچوں کی اس اودھم سے دادی کا ناک میں دم تھا۔ ادھر وہ خود ٹانگوں سے مجبور تھیں اور پھر نکسچڑھے، رنڈوے بیٹے کے نخرے ایسی چھوٹی موٹی لڑائیوں سے تنگ آ کر ایک دن پپا نے انہیں یتیم خانے میں داخل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

یہ بچے دادی کے لئے افیون کی ٹکی تھے۔ جسے وہ زہر سمجھتی تھیں۔ مگر کھاتے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ ایسے بچے یتیم خانے جانے کو تیار ہو رہے تھے تو ان کے خاندانی ہٹ دھرم خون نے بالکل منع نہ کیا۔ دوسروں کے بیچ میں بولنے والی وہ کون ــــ! کوئی ان کے بیچ میں بول کر تو دیکھ لے! ابھی تہہ خانے والے کمرے سے دادا میاں کی مرصع میان والی تلوار نکال لائیں۔

صادق سات برس کا تھا اور یوں خوشی خوشی سامان باندھ رہا تھا جیسے پکنک منانے جا رہا ہو۔ ہما تین برس کی تھی اور پپا کے ساتھ جہنم میں جانے کو بھی تیار تھی بشرطیکہ پپا کی گود میں ہو۔ تو بیہ پانچ برس کی تھی اور تیز ہوا سے لے کر خوبصورت عورتوں تک سے اسے ڈر لگتا تھا۔ کہیں جانے کے نام پر اسکے آنسو نکل آتے تھے۔ ایسی جگہ رہنے کا تو تصور بھی محال تھا جہاں دادی نہ ہوں۔ اسی لئے ہما کو جوتے پہناتے میں وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

"پپا پھر ہم وہاں سے کب واپس آئیں گے۔"

"کبھی نہیں۔" پپا نے بے رخی سے کہا۔ ان کا چہرہ غصہ سے تمتایا ہوا تھا اور وہ تیزی سے دانتسے میں ٹہل رہے تھے۔

"جب اسکول کھل جائے گا تو آ جائیں گے نا!"

"نہیں۔"

"تو پھر ہم یتیم خانے میں کیا کریں گے!" صادق نے بڑے چاؤ سے پوچھا۔

"بھیک مانگنا۔ میری موت کا انتظار کرنا اور اپنی دادی کو دعائیں دینا۔" پپا نے غصہ میں کہا۔

"دادی بے چاری تو مدتوں کی مر گئی۔ تم لوگ دفنانا ہی بھول گئے۔" دادی نے اپنے

کمرے سے جواب دیا۔
"مگر تنی ہمت تمہارے بزدل باپ میں بھی نہ تھی کہ مجھے کفن پہنا کے قبر میں بھی اتار دیتے۔
اب تم اور تمہارے بچے مجھے کیسے مار سکیں گے؟"
"تو پھر پپا ہم وہاں نہیں جائیں گے۔ نوید نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے جوتوں
کے تسمے کھولنے لگی۔
"کیا کہا — ! کیا کہا — ؟ نہیں جائیں گی — ! پپا اس کی طرف لپکے۔
وہ سرپٹ بھاگی تو تہہ خانے والے کمرے میں تھی۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک گونہ
عافیت بھی ہے۔ پرانی مہریاں بھی انسان کی دوست ہوتی ہیں کیسی کے دکھ سن سکتی ہیں۔
لوگ کہتے ہیں کہ پڑھی لکھی لڑکیاں اپنے گھروں سے بھاگتی ہیں۔ مگر نوید کو تو ہمیشہ اپنے
گھر میں آکر ہی سکون ملتا تھا۔
ریڈی کہتا تھا کہ شادی کے بعد تو نوید کے ساتھ کسی میوزیم میں رہنا ہوگا۔ ورنہ نوید
کو نئے گھروں میں ایسی خوشی کہاں مل سکتی ہے؟ اب ایسے گھر ہر جگہ تو نہیں پائے جاتے ہیں
جن میں آج سے دو سو برس پرانا [illegible] ہو جہاں رہنے والی چھپکلیوں اور چمگادڑوں نے کئی کہانیوں
کو بنتے اور بگڑتے دیکھا ہو۔
اور نوید سوچتی — کیا پتہ کچھ دن بعد یہ کہانی بھی کسی میوزیم کی نذر ہو جائے۔ یہ چھپکلیاں
اور چمگادڑیں ایک اور المیہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی۔
اس طرح پپا کے سرخ سرخ دیدوں کو دیکھ کر نہ جانے کتنی بار ہما کا پائجامہ پیشاب میں
میں بھیگا۔ جانے کتنی بار پپا نے صادق کو روپے چرانے پر گھر سے باہر نکال دیا۔ جانے کتنی
بار پپا کے تھپڑ سے سرخ گالوں کو نوید نے اندھیرے تہہ خانے کی دیواروں سے رگڑا، تب
کہیں جا کر وہ اتنے بڑے ہو پائے تھے۔ اب تو نوید ڈاکٹری پاس کر چکی تھی۔ صادق نے بھی آوا
اور خوفناک جرائم کے بہت سے امتحان پاس کر ڈالے تھے۔ وہ بی۔ اے میں کئی سال فیل ہو
کے بعد کالج کی ایک لڑکی کو لے بھاگا۔ دو تین سال کی مقدمہ بازیوں کے بعد پپا اسے چھڑ
کرلائے تو وہ نئی دلچسپیوں میں کھو گیا۔ اس کے ہاتھ پیروں کو قرار نہ تھا۔ بدن میں بجلی بھ

ہوئی تھی۔ بے قرار آنکھیں بڑی دلیری سے ہر بات کی تہہ کو پہنچتیں اور اپنا کام نکال لیتیں۔ اب رہی ہما بچاری بے وقوف سی دھان پان، سدا کی روگی لڑکی۔ وہ نوید آپا کی عقل سے کام لے کر جیتی تھی۔ ہر سال میٹرک کا امتحان دینے علی گڑھ بھیجی جاتی۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ کسی برس وہاں املی نہ ملتی اور میٹھے سالن کھانے سے اسے چکر آنے لگتے۔ کبھی آپا اسے رول نمبر لکھنے کی ہدایت دینا بھول جاتیں اور وہ فیل ہو کر خوب روتی۔ کبھی علی گڑھ کے سارے مچھر مل کر طے کر لیتے کہ ہما کو خوب ستائیں گے۔ — علی گڑھ کے مچھروں کو یاد کر کے تو وہ جاتے وقت دادی سے مل کر خوب روتی تھی۔ اسے صرف دو کام بھاتے تھے۔ اپنے ٹوٹے ستار پر خوب گیت گائے یا اپنے جہیز کے کپڑے سیئے۔ حالانکہ ابھی ہما چھوٹی نوید کے بیاہ پر بھی کسی نے سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ مگر ہما کو پیاری سی دلہن بننے کا بڑا ارمان تھا۔ وہ ہر وقت اپنا جہیز جوڑنے کی فکر میں رہتی تھی۔

کھڑکی میں کھڑے کھڑے نوید کے پیر دکھ گئے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اب کس کی راہ دیکھ رہی ہے!

پہلے اسے ایک منٹ کی بھی فرصت ملتی تھی تو کھڑکی میں چلی جاتی۔ املی کے اس پرانے پیڑ کو دیکھے جاتی۔ جہاں اب ریڈی اپنی موٹر سائیکل کھڑی کرتا ہے اور دادی کہا کرتی ہیں کہ اسی پیڑ تلے تاب ان کے انتظار میں ٹہلتا تھا۔ اب بھی جب وہ ریڈی کو اندر آتے دیکھتی تھی تو وہ کبھی کبھی تاب میں بدل جاتا۔ پھر وہ دبے پاؤں اندر آ کر پورچ میں سے اندر جھانکنے لگتا۔ یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ نوید کے پیا نواب شجاعت علی خاں کے موڈ کا کیا حال ہے۔ کہیں وہ آس پاس تو نہیں ٹہل رہے ہیں کہ جاتے ہی کتے کی طرح لپٹ جائیں۔ لیکن اس کی موٹر سائیکل کی آواز نوید کو باہر کھینچ لاتی تھی۔ وہ اچانک اندھیرے غار جیسے پورچ میں طلوع ہوتی اور اس کے بازوؤں میں گر جاتی۔ پھر وہ نوید کو تھامے اس غار میں گھس جاتا۔ گول گول اندھیرے زینے اور سیلے سیلے دھندلے کمرے۔ پھر ایک روشنی کی کرن نظر آتی۔ اور اچانک چاروں

طرف اجالا سا پھیل جاتا۔ دادی سامنے بیٹھی ہنستی نظر آتیں۔ ہاتھ میں چاندی کے گھنگھروں والا سروتہ اور سیوں پر نقرئی گھنگھروں والی ہنسی۔ مگر ریڈی کو دیکھ کر وہ اچانک چپ ہو جاتیں۔ جیسے کمسن لڑکیاں اپنے باپ کی صورت دیکھ کر سہم جاتی ہیں۔ حالانکہ نوید نے بارہا محسوس کیا تھا کہ ریڈی کی باتیں دنیا کے بارے میں اسکے نئے نئے انکشافات۔ اس کی عادات واطوار۔ ہر چیز دادی کو بہت پسند تھی۔ اس کے باوجود جب نوید ریڈی کے پاس کھڑی ہوتی تو جیسے دادی کو سامنے بھڑکتی ہوئی آگ نظر آتی تھی۔ وہ بات بھول جاتیں جو وہ سنا رہی تھیں۔ انھیں ہما کی کسی حماقت پر غصہ آجاتا۔ کوئی ایسا ضروری کام یاد آجاتا جو صرف نوید کر سکتی تھی۔ اس لئے بچاری نوید پاؤں پٹکتی خاموشی سے دادی کا حکم بجا لانے دوڑتی۔ دادی کا کہا ماننا اس کی سرشت میں داخل تھا۔

نوید کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں آگئی۔

اتنی صبح ریڈی آتھوڑی جاتا ۔۔۔! لیکن اچانک پھاٹک کھلا اور برساتی میں ملفوف ایک شخص جلدی جلدی پورچ کی جانب بڑھ گیا۔ ایسے بدشکل پاتوں والا ریڈی تو نہیں ہو سکتا۔

غوثو چچا آئے تھے اور اپنے ساتھ یہ خبر لائے تھے کہ راشد میاں کے سسرے پر نزع طاری ہو چکی ہے۔ کسی کے نزع میں تڑپنے کی خبر ایسی نہیں ہوتی کہ آدمی مسرت کے مارے ہانپتا کانپتا صبح ہی صبح بھیگا چلا آئے۔ مگر بقول غوثو چچا کے وہ خود بڑے دور اندیش واقع ہوئے تھے۔ یعنی اب راشد میاں اپنے سسرے کی جائیداد کے مالک بن جائیں گے۔ اور یہ دولت مند راشد میاں بالآخر غوثو چچا کے بھانجے ہی کہلائیں گے۔

بارش کا زور بڑھ گیا۔ ٹھنڈ کے مارے دادی کے جوڑوں کا درد بھی جاگ اٹھا۔ ابھی فون پر کسی دوکان دار نے پپا کو یاد دہانی کی تھی کہ صادق نے مزید ایک ہزار کا سامان ادھار لیا ہے وہ بل ادا کیجئے۔ رات حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے کرتے پپا ریڈی سے یوں الجھ پڑے تھے کہ جاتے وقت ریڈی کا موڈ بہت خراب تھا۔

جب سورج ایسی بیزار کن خبروں کے ساتھ طلوع ہو تو چائے میں شکر کا زیادہ ہو جانا
لازمی ہے۔ پپا گرج رہے تھے۔ نوید سر پر تولیہ ڈالے شلوار کے پائینچے اٹھائے، چائے دانی
لئے بار بار چولھے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ ہما نے بھی گنگنانا بند کر دیا تھا۔ اور کسی طرح یہ
ثابت کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ پپا کی پیالی میں ایک چمچے سے زیادہ شکر نہیں ہے۔
دادی بار بار کہہ رہی تھیں کہ کوئی کھڑکیاں بند کر جائے۔ نومبر کی یہ بے موسمی بارش ان
کے بدن کو تلوار کی طرح کاٹ رہی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ برسات میں دادی کی رگ رگ
میں ٹیسیں اٹھتی اور بچاری نوید کی ڈاکٹری اس درد کا علاج نہ ڈھونڈنے پر جھینپ جاتی۔ اسی
لئے تو دادی کو لڑکیوں کی پڑھائی پر اعتقاد نہ تھا۔
اسی وقت غفور چچا کو بوندوں کی طرح ٹپکنا تھا۔
آتے ہی انہوں نے چائے اور شکر کے مسئلے کو حل کرنے کی خاطر وہ کپ منہ سے لگا
لیا۔ پھر اپنی چھدری داڑھی پر ہاتھ پھیر کے تعلیم نسواں پر تقریر شروع کر دی۔
"جی حضت۔ اب پڑھی لکھی لڑکیاں چائے بنانا کیا جانیں۔ نوید ماشا اللہ ڈاکٹر بن گئے
تو پھر آپ ان سے چائے کیوں بنواتے ہیں۔!
"لعنت بھیجئے اس ڈاکٹری پر۔" پپا کو اپنی بھولی ہوئی چیخیں پھر یاد آگئیں۔ ہمارے
دادا پر دادا خوش قسمت تھے کہ بیٹیوں سے محروم رہے۔ میرا بس چلتا تو کسی کو ایک
حرف نہ پڑھاتا۔"
پپا کو تیس برس کی تحصیل داری نے عرش پر پہنچا دیا تھا۔ مگر پنشن نے پھر تپتے صحرا
میں لا پھینکا۔ تحصیلدار کی پنشن اور رنڈی کے بڑھاپے میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں پھر
بدلے ہوئے ماحول سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور موت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ پپا کو
بیک وقت ٹوٹنے والے بلڈ پریشر، ذیابیطس اور اختلاج کے حملوں نے نچوڑ ڈالا تھا۔
پنشن کے بعد حکومت چھننے کے احساس، شدید بیکاری اور دنیا کی تہلکہ خیز خبروں نے انہیں
اور بھی چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ان کی آواز کا تحکم اور بڑھ گیا تھا۔ گھر گھر کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں
وہ اپنا حکم سنوا کر چھوڑتے۔ گھومنے والی کرسی پر بیٹھے وہ دن بھر سوچتے تھے کہ ادھر ادھر

دوڑنے والے نوکر اور اپنی مرضی کے مختار بیٹے انہیں بالکل نظر انداز کر چکے ہیں۔ ماں نے تو خیر کبھی انہیں اپنا بیٹا سمجھا ہی نہ تھا۔ اس لئے وہ بات بے بات چلا کر اپنی موجودگی کا اعلان کرتے۔

"اجی بڑھاپے سے کیا ہوتا ہے بھائی صاحب۔ ہماری تو قسمت ہی کھوٹی ہے۔" وہ بڑے آرام سے کرسی پر دراز ہو گئے۔ ایک سالم انڈا منہ میں رکھا اور نوید کو اندر آتے دیکھ کر بولے۔

"اجی ڈاکٹرنی صاحبہ ہمارے لئے بھی ایک نسخہ لکھ دیجیے کہ یہ دل کی دھڑکن بند ہو۔"

"اچھا چچا ابھی لکھتی ہوں۔" نوید جانتی تھی کہ چچا کو کوئی بیماری نہیں ہے محض نسخہ لکھوانے کا شوق ہے۔ تاکہ نوید کو یاد رہے کہ اس کے ایک منہ بولے چچا ہیں جن کا علاج اسے زندگی بھر کرنا ہوگا۔

غوثو چچا گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار تھے اور اپنی عظمت کی قبر پر جیتے دیئے کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ سینز مہاگیرداروں کی انجمن پر ان کا تقرر محض اس لئے ہوا تھا کہ وہ ابھی تک پھٹے پرانے مہرد کی شیروانیاں پہن رہے تھے۔ چار بیویوں اور ان کے پندرہ بچوں کو سنبھالنے، اور نوکری جیسے ذلیل پیشے کی بجائے صرف اسی دولت پر جیتے تھے جو جاگیرداری ختم ہونے کے بعد انہیں چوتھے پانچویں مہینے سرکار دیتی تھی۔ اخبار، ٹیلی ویژن، مصنوعی چاند پر انہیں بالکل اعتقاد نہ تھا۔ ان شیطانی کارناموں پر غور کرنے کی بجائے وہ اپنے ماضی کے خوابوں میں کھوئے رہتے تھے۔ اسی لئے جب وہ شجاعت حسین خاں کے ہاں آتے تھے تو یوں لگتا جیسے کئی صدیاں ایک دم الانگھ کر بالکل نئی دنیا میں آ گئے ہیں، جہاں ذرا ذرا سی لڑکیاں ڈاکٹر بنی پھر رہی ہیں۔ بزرگ مرنے کی حسرت میں تڑپ رہے ہیں اور لڑکے نیلی پیلی قمیص پہنے، سگریٹ منہ میں دبائے لڑکیوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے ہیں۔ غوثو چچا دوبارہ جاگیرداری دور آنے پر موجیں اڑانے کی اسکیم بناتے تھے تو نوید کو بالکل ہنسی نہ آتی۔ اسے غوثو چچا پر ترس آتا تھا۔ جیسے وہ خود اپنے اوپر ترس کھاتی تھی۔ زندگی کے سہانے خواب دیکھنا تو کوئی جرم نہیں ہے ـــــ! اور پھر خواب میں تو انسان اپنے دل کا غلام ہوتا ہے۔ اپنے بس میں کب رہتا ہے! ایسے ہی کسی خوابیدہ لمحے میں

نوید ریڈی سے ٹکرا گئی تھی۔ یوں ہی میڈیکل کالج کے کسی فنکشن میں اس نے نوید کو اسٹیج پر دیکھا۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ "دکن مورننگ نیوز" جیسا معیاری اخبار جب کسی لڑکی کی اتنی تعریف کرے تو عام پبلک کا کیا پوچھنا۔ بس بجلی سی پھر گئی۔ مگر ابھی حیدر آباد اتنا ترقی یافتہ کہاں ہوا تھا کہ شریف خاندانوں کی لڑکیاں سوانگ بھر کے اسٹیج پر آئیں۔ اس دن پپا نے نوید کی تعریف میں ریڈی کا آرٹیکل پڑھا تو اسٹیج کا مستقبل اور میڈیکل کالج کی شہرت، سب پپا کی ڈانٹ سن کر سہم گئے۔ اور نوید تین دن تک تہہ خانے والے کمرے میں ٹوٹی مسہری کے تکیے میں اپنے آنسو جذب کرتی رہی۔ بالآخر ایک دن ریڈی آیا۔ ریڈی حیدر آباد کا مانا ہوا مشہور ایڈیٹر تھا۔ اس کے اخبار کی آواز پورے بھارت میں گونج رہی تھی۔ ریڈی بہت بڑا آدمی تھا بہت مشہور انشا پرداز اور بہت بڑا اصول پرست۔ یہی بات تھی کہ صرف تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر عینک لگی تھی۔ اس کے پاس اپنی کار تھی۔ اور اپنا ایک مخصوص نظریہ زندگی بھی۔

کہاں تو پپا نے نوید کی تعریفیں اخبار میں دیکھ کر ریڈی پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر لیا تھا یا اس کے استقبال کو پورے پورے بچھ گئے۔ کبھی آج کل تو ان ایڈیٹروں کے ہاتھ میں خدائی ہے۔ پپا کو کامل امید تھی کہ جب پھر شاہی دور آئے گا تو اپنی وفاداری دکھانے کے لئے بہت سوں کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے انہوں نے نوید کو حکم دیا کہ دادا حضرت کا مینا کاری والا چائے کا سٹ نکالے۔ پھر تہہ خانے والے کمرے کے علاوہ اپنی امی جان سے تعارف کروانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ پپا کے پاس اپنی امارت کے اب دو ہی ثبوت رہ گئے تھے۔ ایک تو تہہ خانے والے کمرے میں پڑے ٹوٹے پھوٹے اسٹیچوز، سچی چینی کی ٹوٹی پھوٹی پلیٹیں۔ فانوسوں کے ٹکڑے اور پھر ان کی خوبصورت آنکھیں، کالے بالوں اور مضبوط دانتوں والی امی جان جنہیں پپا نے یوں ہی اپنی امارت کا سرٹیفکیٹ بنا کر رکھا تھا جیسے بھکاری اپنے مفلوج بچوں کو دکھا کر بھیک مانگتے ہیں۔

ریڈی کو صرف نوید کی کشش کھینچ کر لاتی تھی۔ مگر اس گھر میں گھس کر وہ پھر واپس نہ جا سکا صرف تہہ خانے والا کمرہ ہی سحر زدہ نہ تھا۔ دادی کی دلکش ہنسی، پپا کی افلاطونی گفتگو، صادق کا

خطرناک ذہن۔ ہمّا کی بے وقوفی۔ ایک بات ہو تو گنوائی جائے۔ ریڈی تو پہلی بار جیسے چڑیا گھر کی سیر کرنے آیا تھا۔ دو چار ہفتے بعد ہی یہ عالم تھا کہ نوید کو گھنٹوں کتاب سامنے رکھے اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر وہ کبھی پپا کو فوری قرض حاصل کرنے کی کوئی ترکیب سوجھاتا۔ کبھی دادی کو اسپوٹنک کی ٹکنک سمجھا رہا ہے۔ ہمّا کو حساب پڑھا رہا ہے۔ صادق کو بتا رہا ہے کہ جعلی چیک کو کیش کروانے کی سزا کیا ہوتی ہے۔!

ان سب سے ہٹ کر جب وہ نوید کے پاس آتا تھا تو وہ بالکل خفا نہ ہوتی۔ اگر ریڈی اس گھر میں یوں نہ گھل مل جاتا تو وہ کیا کرتی! اس گھر سے علیحدہ ہو کر نوید کو نہ تو کوئی خوشی مل سکتی تھی نہ سکون۔ پپا اس کے دائیں ہاتھ کی طرح زندگی کی ایک ضرورت بن چکے تھے۔ ہمّا پپا سے مشورہ لئے بغیر پانی بھی نہ پیتی تھی۔ صادق جب کئی ہفتے گھر نہ آتا تو وہ کھڑکی کے پردے سے لگی اپنے آنسو پونچھ پونچھ کر تھک جاتی۔ اور دادی ــــ! دادی تو اس کے لئے جانے کیا کیا تھیں! ہاسٹل سے آتے ہی وہ چھوٹی بچیوں کی طرح دوڑ کر دادی سے لپٹ جاتی تھی۔ بچاری دادی نے بھی کیسی تلخ زندگی گزاری تھی۔ اُن کے زمانے میں عورت کتنی مظلوم تھی۔ کیسی بے بس کہ دادی خودکشی بھی نہ کر سکیں۔ زندگی ان کے لئے زہر کا گھونٹ بن کر رہ گئی۔ بعض وقت جب دادی اپنی کہانی کا کوئی اداس سانحہ سناتی تھیں تو وہ رسالوں سے انہیں قائل کرنا چاہتی۔

"مگر آپ تو اس زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی تھیں دادی۔ آپ کا حکم تو سب مانتے تھے۔ پھر آپ نے اتنی تلخ زندگی کیوں گذاری! آپ چاہتیں تو ضرور زندگی کو حسبِ ذائقہ بھی بنا ڈالتیں۔"

"مگر ایک کڑواہٹ ایسی بھی ہوتی ہے جسے تم کتنی بھی شکر کے ساتھ کبھی نہیں نگل پاتیں۔"

دادی ٹانگ برابر کی چھوکریوں سے بات کہنا نہ چاہتی تھیں۔ مگر جانے کیسے ان کی آواز نوید تک پہنچ گئی تھی۔

"ہاں آپ کے زمانے میں تو ـــ" نوید نے کچھ کہنا چاہا۔

"میرا اور تمہارا زمانہ کیا ـــ!" دادی نے چاندی کی خلال دانتوں میں سے نکال کر اس کی بات کاٹی۔

"عورت ہر زمانے میں عورت ہی رہے گی۔"

دادی نے اپنی اونی شال کو کاندھوں پر ڈال لیا۔ ایسا سرد اونی کپڑا انہوں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں پہنا تھا۔ اس میں بھی کھوٹ ہوگی ۔۔! انہوں نے سوچا کہ یہ بات اگر وہ اس دا اس لڑکی سے کہہ دیں تو وہ ہنس پڑے گی کہ دادی کو تو اب ہر چیز میں کھوٹ نظر آتی ہے۔

کتنی اچھی تھی دادی کی یہ خوبصورت پوتی ۔ اسے دیکھتیں تو دادی کو آج سے ساٹھ سال پہلے والی اپنی صورت یاد آجاتی ۔ یہ کیسے ہوا ۔۔۔! ایک دن تو دادی کا بوڑھا ذہن سوچتے سوچتے چکرا گیا۔ ہماری صورت کا ایک نقش جا دو داں کیسے ہو جاتا ہے! بالکل ویسی ہی اپنے خطرناک حسن سے ناواقفیت ۔ ویسا ہی ساری دنیا کی خوبصورتی سے پیار۔ ہر ایک کے دکھ پر اپنی آنکھوں میں آنسو سجانے کا جذبہ۔ وہی دمکتی ہوئی ہیرے کی کنیاں جیسی آنکھیں جنہیں دیکھنے والے بدنصیب کو پھر ساری دنیا میں اندھیرا نظر آتا ہے۔ مگر بعض وقت جب دادی بڑے غور سے نوید کو ہنستے دیکھتیں۔ اس کی چال پر قربان ہونے کی سوچتیں تو اچانک انہیں احساس ہوتا کہ ان کا عکس اتارنے والے مصوّر نے یہاں بھی ایمان داری سے کام نہیں لیا۔ انہیں اپنے عکس میں بھی کھوٹ نظر آتی۔ جب نوید رات رات بھر کتاب پر جھکی رہتی تھی۔ اپنے باپ کی ڈانٹ سنکر چھوٹی بچیوں کی طرح رونے لگتی۔ جب صبح سویرے اٹھ کر اسپتال جانے سے پہلے وہ جلدی جلدی فرش دھوتی۔ پائپ سنبھال کر درختوں کو پانی دیتی۔ چائے کی ٹرے لیکر دادی کے کمرے میں آتی تو دادی کی آنکھوں میں چراغ بجھنے لگتے ۔ انہوں نے اس عمر میں کسی کا غصہ برداشت نہیں کیا۔ کبھی اپنے ہاتھ خود نہ دھوئے۔ پھر ستر برسوں نے یہ کیا ستم کیا کہ ان کا وہ پٹھانی خون تپ کر مرہم بن گیا ۔۔۔! اپنی آنکھوں کو پونچھ کر وہ کھڑکی سے باہر پھیلا ہوا چمکیلا آسمان دیکھنے لگتیں، جس کی جوانی لازوال ہے۔ یہ آسمان کتنا پرانا ہے! جب دادی چھوٹی سی تھیں تو اماں کی گود میں لیٹی اسے چھونے کی کوشش کرتی تھیں۔ پھر کچھ سمجھ آئی تو انہوں نے آسمان کی اہمیت جس دن محسوس کی جب آسمان کی طرح ان کے دل میں بھی ایک چاند اتر آیا تھا۔ اس دن انہوں نے جانے کیا کیا سوچا تھا کہ آسمان بہت دور ہے اور ان کے دل کی طرح وہاں کی اندھیاری میں بھی ایک دیا جل رہا ہے جسے کالے بادل چاہیں تو پل بھر میں بجھا دیں۔ پھر آسمان رونے لگا۔ اسکے آنسو ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے ۔ تب دادی اپنی نمناک آنکھوں کو پونچھ کر نوید

کی طرف مڑ گئیں، جیسے آسمان کی پراسرار پہنائیوں کی ابھی کچھ خبر نہ تھی۔
"سنا نوید پاشا، ایک بار میں نے کتابیں دکھا کر تاب سے پوچھا تھا کہ کیا آسمان پر بھی لوگ شاعری کرتے ہیں؟"
"جی ——؟" نوید نے کتاب بند کر کے بڑی مشتبہ نظروں سے دادی کو دیکھا۔ بعض وقت اسے دادی کا دماغ بھی فالج زدہ معلوم ہوتا تھا ورنہ عورت کی سماجی حیثیت پر بات کرتے کرتے وہ آسمان کی شاعری میں کیسے کھو جاتی ہیں۔
"تو سنا تم نے! میں نے تاب سے پوچھا کہ ٹوٹے ستارے دیکھ کر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آسمان کے اندھیرے میں چھپا کوئی رو رہا ہے! کیا وہاں بھی شاعر رہتے ہیں۔؟"
"ہاں ہاں، کیوں نہیں" اسنے اپنی ستاروں کی سی آنکھیں جھپکا کر جواب دیا تھا۔ یہ دنیا کی شاعری ہی تو ہے۔ مثلاً آپ۔ آپ کو میں خدا کا ایک لاجواب شعر کہہ سکتا ہوں۔ ہا ہا ہا۔
دادی ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔ پھر انہوں نے اپنے قہقہے میں نوید کو شریک کرنے کے لئے دیکھا تو نوید بڑی خوف زدہ نظروں سے انہیں تک رہی تھی۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی تھی۔
"بہت ہی اوندھی سیدھی باتاں کرتا تھا وہ اجاڑ صورت۔" دادی نے خلا میں دور کہیں دیکھتے ہوئے بات کا سلسلہ جوڑا۔
"اس کی بکواس کی میں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ کبھی اس کی بات کا برا نہیں مانا۔ بابو بولتے تھے، تاب بڑا قابل آدمی ہے بی بی پاشا۔ جو علم چاہتے ہو اس سے حاصل کر لو۔ ورنہ بعد میں آپ پچھتائیں گے۔"
اور سچی —— میں بعد میں بہت پچھتائی۔ اس سمندر سے ایک قطرہ بھی نہ پاسکی۔ بالکل جاہل اجڈ رہ گئی۔ اور میری بجائے تاب کی ڈانٹیں سننے والی پاروتی نے جانے کیا کیا پالیا اس سے۔"
باتیں کرتے کرتے دادی پھر کہیں دور دیکھنے لگیں۔ نوید نے سوچا کہ ہر بوڑھے آدمی کی طرح دادی کو بھی اپنی گمشدہ جنت کی تلاش ہے جو یقیناً زمانے کے لیٹرے تاراج کر چکے ہیں۔ اب ان کا سب سے اچھا علاج یہی ہے کہ ان کی بات سن لی جائے۔

پھر کیا ہوا دادی ـــ! وہ آرام سے قالین پر لیٹ کر دادی کی ہزار بار سنائی ہوئی کہانی پھر سننے کے لئے آمادہ ہو گئی۔

"بڑا بے وقوف تھا وہ بچارہ شاعر" دادی پھر کمرے میں پلٹ آئیں۔

"میری تو ہر بات ماننا پڑتی اسے۔ میری ساری غلطیوں کو نظر انداز کر دیتا۔ میری کوڑھ مغزی پر اسے بڑا تعجب ہوتا تھا۔ ہمیں پڑھانے والے استاد الحاج امین الدین ہاشمی چشتی و القادری عفی عنہ کا یقین راسخ تھا کہ ہر عورت ناقص العقل ہوتی ہے اور میں ہر وقت اس کا ثبوت فراہم کرتی تھی۔ جھنجھلا کر وہ کتاب کو پٹینا شروع کر دیتے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں لڑکیوں کے لئے اسکول ہی کہاں تھے۔ بڑے آدمیوں کی لڑکیوں کے لئے اتالیق رکھے جاتے تھے۔ کتاب میرا ہم مکتب تھا۔ اسے میرے ساتھ اس لئے بٹھایا جاتا تھا کہ میں غلطی کروں تو مولانا اسے مار کے مجھے عبرت دلائیں۔ کتاب کو دیکھ کر مجھے واقعی عبرت ہوتی تھی بچارا ہمارے بابا کے منشی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ منشی صاحب چاہتے تھے اپنی ساری جائیداد بیچ کر اسے ولایت بھیجیں۔ انگریزی پڑھائیں۔ مگر ہمارے دادا حضرت کا حکم تھا کہ وہ میرے ساتھ پڑھا کرے۔ جب تک مولانا نہیں آتے تھے وہ میری خوشامدیں کرتا تھا کہ اپنا آموختہ یاد کر لوں۔ وہ عمر میں مجھ سے دو سال بڑا تھا اور مولانا کے برابر نہ سہی ان سے آدھا علم تو حاصل کر ہی چکا تھا۔ پھر بھی میرے ساتھ بیٹھ کر آمد نامے کی گردان کرنا پڑتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے اٹھا کر نارنگی کے جھاڑ پر بٹھا دیتا تھا۔ محض اس وعدے پر کہ آج میں پڑھتے وقت کوئی غلطی نہ کروں۔ مگر میں کیا کروں۔ تو یہ پاشا! وہ اجاڑ صورت بڈھا تو جیسے طے کر کے آتا تھا کہ کتاب کی انگلیوں سے خون بہائے بغیر نہ اٹھے گا۔ اس منحوس بوڑھے کی صورت سے مجھے نفرت تھی۔ اس کی خوفناک باتیں سنکر مجھے بُرے بُرے خواب نظر آتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میری زندگی بھی ایک گناہ ہے اور میری ساری دلچسپیاں شیطانی ہیں جو مجھے دوزخ کا کندہ بنا دینگی وہ ہر وقت ڈراتے تھے کہ اپنی آخرت کی فکر کرو بٹیا۔

اور میں جھنجھلا کر بولتی۔

"حضرت مجھے اپنی کسی بات کی فکر نہیں کرنا ہے۔ یہ کام بابا اور چاچا کا ہے ـــ سچ بھئی، ہمارے زمانے میں تو لڑکیاں بڑے مزے میں رہتی تھیں۔ تمہاری طرح تھوڑی کہ ہنسنے کھیلنے کی

ساری عمر کتابوں کو آنکھوں سے لگا کر گزاری ۔۔۔ کیوں ۔۔۔! اس لئے کہ اپنا مستقبل آپ ہی جو بنانا ٹھہرا ۔۔۔!

میں نے تو کبھی اپنی فکر نہیں کی ۔" ۔۔۔ دادی نے تو یند کی جانب دیکھا جو انہیں ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھی ۔ اور دادی سنائے جارہی تھیں ۔ جانے انکے لب ہل رہے تھے یا نہیں! جانے وہ تو یند کو اپنی کہانی سنا رہی تھیں یا اپنے آپکو اٹھا کر کسی اور دنیا میں لے گئیں تھیں ۔۔۔!

بڑے چچا حضرت مجھے کتنا چاہتے تھے ۔ ان کا ارادہ تھا کہ مجھے موسیقی سکھائیں ۔ وہ سنگیت کے رسیا تھے ۔ ان کے مقابل کا گویا حیدرآباد میں کوئی نہ تھا ۔ شلجم پلی کے لوگ دوسرے جاگیرداروں کی طرح سسک سسک کر نہ جیتے تھے ۔ بڑے چچا نے دو لاکھ کی جائیداد موسیقی کی لہروں میں بہا دی تب کہیں ان کا گلا انمول ہوا ۔ مگر بپا مجھے گاتے دیکھ کر ہنستے تھے :" اجی حضرت کہیں شاعر بھی مغنی بن سکتے ہیں ۔!

بپا چاہتے تھے کہ میں حیدرآباد کی خاتون شاعر بنوں ۔ مجھ میں کوئی ان دیکھی بات دیکھنے کے متمنی تھے ۔ میرے نانا کو مجھے ڈاکٹر بنانے کا ارمان تھا ۔ مگر دادی یہ سنکر خوب لڑتیں ۔

" ایسی کیا مصیبت آئی ہے کہ اتنا پڑھ کر اپنا جی ہلکان کرے ۔ مرتے سڑتے مریضوں کے سرہانے بیٹھے ۔! اس کی تو لونڈیاں بھی ڈاکٹر نہ بنیں گی ۔"

اس کھینچا تانی میں گیند کی طرح میں اِدھر سے اُدھر لڑھکتی پھرتی ۔ کسی دن بپا میرے ہاتھ سے طنبورہ چھین کر پھینک دیتے ۔ دادی میری کتابوں کو آگ لگا دیتیں ۔ کبھی چچا حضرت الحاج مولانا شاہ نصیرالدین ہاشمی چشتی والقادری عفی عنہ کو دھکے دیکر باہر نکال دیتے ۔ اماں گھوڑے کی سواری سکھانے کی مخالف تھیں تو دادا حضرت کو اس بات پر سخت غصہ آتا تھا کہ میں استانی ماں کے سامنے، منہ پر لٹیں بکھیرے پسینے میں شرابور، سوئی میں دھاگہ پرو نا سیکھ رہی ہوں ۔

آس پاس کے اس ہجوم کو ہٹا کر میں نے کئی بار اپنے آپ کو ڈھونڈنا چاہا ۔ ہزاروں فکریں جان کھائے جاتیں ۔ راتوں کو میں چونک پڑتی ۔ یہ بڑی چچی اماں کتنے زور سے ہنستی ہیں ۔۔۔ اور تاب ۔۔۔ تاب ۔۔۔ تاب کیسا آدمی ہے ۔ اپنی انگلیوں کے زخموں کو پوچھ کر وہ علم کی تلاش میں جانے کہاں کہاں گھوما پھر جب مولانا کا وصال ہوگیا اور میں سمجھ دار ہوگئی تو پھر تاب میرا اتالیق مقرر

ہوتا تاکہ مجھے شاعری کرنا سکھا سکے۔ مگر میں اس سے بھی کچھ حاصل نہ کر سکی۔ میں کی نگاہیں شاہ نصیرالدین کی طرح ادھر اُدھر کسی کو ڈھونڈتی تھیں جسے میری غلطیوں کی سزا دے سکے۔ پھر وہ دانت کچکچا کر مجھے دیکھتا۔ "آپ تو بالکل کندہ ناتراش ہیں۔"

"دادا حضرت کہتے تھے میں شلجم پلی کا ہیرا ہوں۔" میں اکڑ کے جواب دیتی۔

"ہیرا — ! وہ منہ بنا کر کہتا۔ ہیروں کا بھی آخر کیا مصرف ہے! میں نے سنا ہے کہ لوگ انہیں چاٹ کر مر جاتے ہیں۔"

"اور جسکے پاس ہیرا ہو اس سے اونچا کوئی نہیں ہوتا۔ اسکی خاطر بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔" تاب کی صحبت نے مجھے بھی جواب دینا سکھا دیا تھا۔

"اچھا تو یہ لڑائیاں کب شروع ہونے والی ہیں!" اسنے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"ایک لڑائی تو شروع بھی ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے کہا نہیں۔ ہاں اب مجھے دل میں کھنے اور زبان پر لانے والی بات میں امتیاز ہو گیا تھا تب ہی تو تاب کے اشعار اور رضا کی یاد مجھے ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ رضا میرا منگیتر تھا۔ اسے اپنی قسمت پر ناز تھا اور شلجم پلی کے حدود میں سات خون اس پر معاف کر دیئے گئے تھے۔ جالینوس جنگ اور ان کے حواری خاندان اس رشتے پر ہاتھ ملتے رہ گئے تھے۔ رضا اپنی حویلی کے حصار میں بند رہتا تھا۔ تاکہ دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ میں اس بات سے بہت الجھتی تھی۔ جانے وہ حویلی میں بیٹھا کیا کرتا ہوگا! نہ جانے اسے شعر کہنا آتے ہیں یا نہیں —! تاب کیسا اچھا شاعر ہے! ایک دن تو وہ دو گھنٹے تک مجھ سے فی البدیہہ اشعار میں باتیں کرتا رہا۔ ہائے میں تو مبہوت رہ گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ جواب میں ایک شعر ہی کہہ سکوں۔ مجھے ہر وقت کتابوں میں غرق دیکھ کر دادا حضرت کو بڑا غصہ آتا تھا۔ دادا حضرت شاعری پسند نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے شاعری سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں۔ یہ تو دیمک بنکر آدمی کو چاٹ جاتی ہے جو شاعری کرتا ہے وہ بس شاعری کرتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ سنکر جانے کیوں میری روح کانپ جاتی تھی۔ اور پھر میں سوچتی کہ اپنے منگیتر کو چاند کے ہاتھ کوئی پیغام بھیجوں۔ آخر کسی رومانی شعر پر میں رضا کو یاد کر کے کیوں نہیں روتی۔ تاب کہتا تھا کہ برسات کی راتیں تو دوری کا فرق مٹا دیتی ہیں۔ ان راتوں میں تو ہر انسان کسی نہ

خواب میں کھویا رہتا ہے اور میں رات بھر بجلیوں اور بوندوں کے شور میں ڈوب کر سوچتی تھی
تاب کس کے خیال کو لئے سو رہا ہوگا۔ وہ کس کی یاد میں شعر کہتا ہے"!

"اوفوہ ــ آپ نے کیسی شاندار زندگی گذاری ہے دادی ـــ"

اچانک نوید کی آواز سنکر وہ دہل گئیں، جیسے کسی نے تڑسے انہیں بندوق کا نشانہ بنایا۔
وہ زندگی کی حسین وادی میں پرواز کرتے کرتے موت کی گھاٹی میں جا گری ہوں۔ اور پھر
بانے کیوں آج برسوں کے بعد جیسے کسی نے بھرے گھڑے کو چھلکا دیا اور وہ اپنی نم آنکھیں پونچھ
کر سوچنے لگیں۔ ان نادان بچوں کو کون سمجھائے کہ زندگی کبھی شاندار نہیں ہوتی۔ زندگی تو زہر
کا ایک گھونٹ ہے۔ کوئی چاہے تو اس میں شکر کا ایک چمچہ گھول لے۔ میری اس شاندار زندگی
پر میری اس احمق پوتی کو رشک آرہا ہے اور میں سوچ رہی ہوں کہ اگر نوید کی زندگی سے ایک لمحہ
بھی مجھے مل جائے تو ـــ تو میں اس کا کیا کروں گی! میری زندگی کے ہار میں یہ انمول موتی بیچوں
بیچ پرو دیا جائے گا۔ عین دل کے اوپر دھڑکا کرے گا۔ مجھے اپنی گزری ہوئی زندگی کیسی انمول
لگے گی!

میں سوچتی ہوں کہ جب بالشت بالشت بھر کی لڑکیاں ڈاکٹر بن جائیں گی تو پھر عجیب و
غریب مرض بھی آپ ہی پیدا ہوں گے۔

میں نے بھی اپنے باپ دادا دیکھے تھے جو ساٹھ ستر برس تک اپنی جوانی کا پھیلا گئے
گئے اور پھر بڑھاپے کے کسی مرض نے انہیں پچھاڑ ڈالا۔ لیکن مرتے وقت وہ زندگی سے سیراب
ہو چکے تھے ان کا دل مطمئن تھا اور دماغ میں میرے بیٹے کی طرح اتنے الجھاوے نہ تھے اپنے بیٹے
کی اس حالت پر میرا دل کٹ جاتا ہے کہ وہ بیماری کی وجہ سے زور سے چلا نہیں سکتا۔ اسکی
بات کوئی نہیں سنتا۔ مجھے اپنے باپ کا وہ پُر جلال چہرہ یاد آتا ہے تو ابھی تک سارا بدن کانپ
اٹھتا ہے۔ وہ دکن کا مرد آہن تھا۔ اپنی بات وہاں منوا چکا تھا جہاں نہیں مانی جاتی۔ وہ شطرنج
کا ماہر کھلاڑی تھا اور رشتے ہی مہروں کو چٹکی بجاتے میں آگے پیچھے کر سکتا تھا۔ مگر ایک دن وہ بھی
اپنا اٹھا ہوا قدم سنبھال کر ٹھٹھک گیا تھا۔ میں بھی تو اس کی ضدی اڑیل بیٹی تھی۔ اسکے دوش
بدوش گھومتی تھی اپنا حکم منوانے کے سارے اصول سیکھ چکی تھی مگر شلجم تلی کی اسٹیٹ ہی اتنی

بڑی ہو کر ایک لڑکی جنگھ کھول کر اڑنا چاہے تو کسی دیوار سے نہ ٹکرائے۔ میں بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھتی تھی۔ بچا حضرت کہتے تھے۔

"شلجم پلی کے لوگ فخر کریں گے کہ ہم نے انہیں زمرد حبیب گوہر دیا ہے۔"

اپنی اس قدر و قیمت پر میں اوچھی لڑکیوں کی طرح اتراتی اتراتی نہ پھری۔ میں نے زندگی کو ایک فرماں بردار غلام کی طرح برتا اور خود ایک بلند مینار پہ جا کھڑی ہوئی۔ وہیں سے جھک کر ایک دن میں نے تاب کو دیکھا۔ مولانا شاہ نصیر الدین عفی عنہ کی قمچیوں اور تھپڑوں کی ہو کش نے اس کے دل میں بہت سے درد جگا دیئے تھے۔ وہ آج بھی چڑیا کو بلی کے منہ میں دیکھ کر رونے لگتا تھا۔ باغ میں گرے ہوئے پھولوں کو اٹھا کر چومتا اور کسی اونچی جگہ رکھ دیتا۔ آسمان پر اڑنے والی آزاد چڑیوں کے غول کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا اور دیکھتا رہ جاتا۔ پھر اپنے آنسوؤں کو اٹھا کر ایک کاپی میں جمع کر دیتا۔ عید کی رات جب بڑی ڈیوڑھی میں ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا تو حیدر آباد کے سارے شاعر تاب کے آگے اپنی آب و تاب کھو دیتے تھے۔ ابا اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر بڑے فخر سے کہتے تھے کہ تاب کی یہ ساری ذہانت ان کی بیٹی کا صدقہ ہے۔ تعجب ہے کہ تاب نے اس بات پر کبھی بُرا نہ مانا۔ حالانکہ میری طرح ابا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ مولانا نے اپنے مکوں اور چھڑی کے ذریعہ سارا علم تاب کے دماغ میں انڈیل دیا تھا۔ میرے اوپر انکے علم و فضل کی کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔

یہ شاعر بچارے دکھوں کی بھٹیوں میں جانے کتنا تپتے ہوں گے! مولانا فرمایا کرتے تھے کہ انسان کسی کو اسی لئے چاہتا ہے کہ وہ عشق حقیقی کی پہلی منزل پر قدم رکھ سکے۔ اللہ کی محبت پہلے کوئی خواہش بن کر جاگتی ہے۔ پھر اس نغمے کو سنکر انسان مدہوش ہو جاتا ہے۔ یہ سحر اسے مغنی کے قریب لے جاتا ہے۔ ایک دن نصیب کی معراج اس نغمے کو بھی سفر پہ لے جاتی ہے۔ ب مغنی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ رومی نے ایک جگہ کہا ہے کہ — کہ —

میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سنتی تھی۔

"نہیں حضرت یہ کیسے ممکن ہے کہ مغنی بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے!"

"ہوتا ہے —" مولانا اصرار کرتے۔

اور میں تاب سے کہتی ۔۔۔ "حضنت قبلہ فرماتے ہیں کہ ایک دن مغنی اپنے ساز کو بھی پھوڑ دیتا ہے۔" اور وہ بچارا سر بات کی تائید کرتا۔ میں اسے اپنی اہمیت جتاتی۔ اپنے مستقبل کے پلان سناتی۔ مجھے رضا ذرا اچھا نہ لگتا تھا۔ مگر تاب کو میں سناتی تھی کہ رضا کے لئے میں کیسے جیوں گی کیسے مروں گی! اس لئے میری لٹ تجتی پر ایک دن وہ چڑ گیا تو اس نے غصہ میں کہہ تھا۔

"آپ اس قابل ہیں کہ رضا آپ کو اپنی تجوری میں بند کردے۔"

"کیوں ۔۔۔!" میں واقعی اس کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

"اس لئے کہ آپ بہت قیمتی ہیرا ہیں۔ آپ کو چاٹ کر کوئی مر سکتا ہے۔"

"کون ۔۔۔؟" میں نے منہ اٹھا کر پوچھا۔

"ہشت ۔۔۔" اس نے پہلی بار مجھے جھڑکی دی اور پرے سرک گیا۔ اس کے چہرے پر الاؤ دہک رہا تھا اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"آپ سمجھتی ہیں کوئی زہر کھلائے گا اور اس کے لئے آپ کی خوشامد بھی کرے گا ۔۔۔! اس خیال کو دل سے نکال دیجئے کیونکہ رضا بڑا سخت مزاج ہے۔"

"تم مجھے ہر وقت رضا سے کیوں ڈراتے رہتے ہو!" میں نے چونک کر پوچھا" اگر رضا بُرا ہے تو میں اسکی اوقات پر بھی سات بار تھوک دوں گی۔"

"اچھا!" اس نے بڑے طنز کے ساتھ کہا اور پھر جھک کر میرے پیر دیکھنے لگا" ان پیروں میں اتنا دم ہے کہ یہ اپنی مرضی سے اٹھ سکیں!"

"ہاں ۔۔۔" میں نے غصہ کو بڑی مشکل سے روک کر کہا" ان پیروں میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکیں۔"

"اچھا ۔۔۔!" اس نے تلخی کا ایک بڑا گھونٹ پیا اور پھر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ۔۔۔ "ہم بھی دیکھیں گے آپ کی طاقت۔"

"ابھی کیا دیکھو گے! دس بیس برس کے بعد پوچھنا۔"

عنقریب دلہن بننے والی اور میاں کے ساتھ ساتھ کئی بچوں پر حکومت کرنے والی بیوی

کے غرور سمیت میں اسے جواب دے رہی تھی۔

"پچاس برس بعد سہی ——" وہ جانے کیسے مسکرایا۔ اگر تمہاری آنکھوں میں اتنا دم باقی ہے کہ تم مجھے پہچان سکو۔"

اس دن کے بعد تاب ہمارے یہاں نہیں آیا۔ میری شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ ہر روز رضا کے ہاں سے ایک نیا حکم چلا آتا۔

"دولہا پردے کا بہت حامی ہے اس لئے دلہن کو گھوڑے کی سواری چھوڑنا ہو گی۔ —— دولہا عورتوں کی تعلیم کو معیوب بات سمجھتا ہے اس لئے دلہن کے جہیز میں کوئی کتاب نہ آنے پائے۔ دولہا کو نازک مزاج عورتیں پسند نہیں ہیں اس لئے دولہن کو اچھی طرح کھلا پلا کر مضبوط بنا دیا جائے۔

اس دن اپنے پندرہ برس کے اونچے پورے قد کو بھول کر میں خوب مچلی تھی "میں نہیں بیاہ ہم نہیں کرتے رضا سے شادی۔ وہ اجاڑ صورت مجھے بہت ستائے گا۔"

اور سب میرے بچپن پر ہنستے رہے۔ کسی نے میرے آنسوؤں پر دھیان نہ دیا۔ یہاں تک کہ ٹڈی دل کی طرح برات والے ہماری ڈیوڑھی پر ٹوٹ پڑے۔ اور آتش بازی کے دھماکوں سے میں لرزنے لگی۔

"کیوں —— بھلا اس کمینے کی کیا مجال ہے کہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے۔" میں نے ایک جوان کی طرح اندر ہی اندر اپنی سختی محسوس کی اور شادی کا ہنگامہ یوں دیکھنے لگی جیسے اپنی کسی سہیلی کے بیاہ میں آئی ہوں۔

توبہ ہے۔ لوگ بریانی کی بوٹیوں پر کتوں کی طرح لڑتے ہیں —— ایک عورت نے آنکھ بچا کر میری انگلی سے ایک انگوٹھی اتاری اور چلتی بنی۔ میں گھونگھٹ میں ہنس پڑی۔ یہ وہی ذہین انگوٹھی تھی جو بچپن سے رضا کی ہر میرے سر اوپر لگا چکی تھی —— دوسرے کمرے میں پھوپی اماں لوگوں کو جہیز دکھا رہی تھیں اور بڑے اطمینان سے دو سو کی ساری کو پانچ سو کی بتا رہی تھیں۔

"اتنا جہیز دیا تو کونسی بڑی بات کی بہن!" میری کوئی دوسری یا تیسری ساس کسی سے کہہ رہی تھی۔

"ہم نے بھی تو اپنا ہیرا سا بیٹا دیا ہے۔"

"مگر میرا جاٹ کر تو لوگ مر جاتے ہیں —!" میری کوئی سنتا تو کہتی۔

اور پھر وہ سب اپنا تحکمانہ انداز لئے مجھ سے نکاح کا اقرار کروانے آگئے اڑیل بپا۔ ضدی ماموں۔ چلانے والے چچا حضرت۔ عورتیں رونے لگیں کہ میں کہیں اس خونخوار بھیڑیے کے ساتھ جینے مرنے کا اقرار نہ کر بیٹھوں! مجھے تو پچاس برس بعد تاب کو منہ دکھانا تھا۔ اور اس امید کو میں کیسے ختم کر دیتی! میری چیخوں سے سب "اراق" اکھٹے ہو گئے۔

پھر کمرہ خالی کر دیا گیا اور چچا حضرت نے میرے سر پر تلوار رکھ کر جانے مجھ سے کیا اگلوایا۔

مگر رخصتی کے وقت میں دالان کا کھمبا پکڑ کے اڑ گئی پھر دھڑام سے گر پڑی۔

دوسرے دن مجھے ہوش آیا تو وہی خت رق سنا ڈیوڑھی تھی جس میں سے بھاگتا چاہوں تو دروازوں میں سے دروازے نکلے چلے آتے۔ اس کے آخری دروازے پر میری ساس پہرہ دار بنی کھڑی تھی اور خونخوار آنکھوں سے میری مفلوج ٹانگوں کو گھور رہی تھی جو رات سے اکڑ گئی تھیں۔

رضا بچارے نے شہروں شہروں سے حکیم ڈاکٹر بلوا کے میرا علاج کیا۔ مگر میری ٹانگوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"ہوں — پھر —!" نوید اسی طرح محویت کے ساتھ کہانی کی گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

"پھر کیا ہوا دادی —!" نجمہ بھی جانے کب قالین پر آ بیٹھی تھی۔ اور دادی کی کہانی سن رہی تھی۔

"کچھ نہیں — دادی نے اپنی بے حس ٹانگوں پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ بعض وقت مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا بھولا ہوا وعدہ میری ٹانگوں نے نبھایا جیسے میں آج بھی بپا کی ڈیوڑھی کا کھمبا پکڑے کھڑی ہوں اور میری ہمت دیکھ کر بچارا تاب جھینپ گیا ہے۔ یہ شاعر اپنے آپ کو انسانوں سے برتر سمجھتے ہیں۔"

جب دادی بہت دیر تک کچھ نہ بولیں تو نوید نے چونک کر انہیں دیکھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی چھت پھاڑ کر یہاں آ گری ہوں۔ پھر اس نے بڑے رسان سے کہا۔

"دادی مگر ایسا کیوں ہوا کہ کوئی کسی سے محبت کر کے ساری دنیا سے نفرت کرنے لگے! آپ کے مولوی صاحب تو کہتے تھے کہ خدا کی بنائی ہوئی کسی مورت سے پیار کر کے انسان

ساری عذری سے محبت کرنے لگتا ہے ؟"

"سب بکواس ہے ۔" دادی بڑبڑائیں ۔

"تو پھر یہ تو خودکشی ہوئی نا!" وہ اپنی ادھ کھلی چوٹی کو ہتھیلی پر چابک کی طرح مارتے ہوئی ۔

دادی نے کوئی جواب نہ دیا ۔ انہوں نے اپنے جھریوں بھرے پپوٹے اٹھائے نوید کو دیکھا جس کے خوبصورت پاؤں بالکل ان ہی کی طرح نازک تھے ۔ پھر انہوں نے اس حوصلہ مند نوید کی کا چہرہ دیکھا جو یونیورسٹی کے سارے تیز رفتار لڑکوں کی دوڑ میں آگے نکل گئی تھی ۔ مگر اس کے باوجود بیچاری نہیں جانتی کہ ایک دن اس کے یہ نازک پاؤں گھر کی دہلیز نہ الانگھ سکیں گے ۔ کوئی قوت انہیں برف کی طرح سرد کر جائے گی پھر وہ ہنس پڑیں ۔ وہی اٹھارہ برس کی لڑکیوں کی جذباتی باتیں ۔

"ہم کیا جانیں بیٹی ۔ یہ خودکشی ہے یا کیا بلا! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ نیمرن رامش کے تعفن سے ہمارے داد کی ہستی گم ہو گئی تھی ۔ ان کے بچوں نے اپنی ماں کا نہیں ایک ڈائن کا دودھ پیا ۔"

"بیچاری عورتوں کی قسمت ہی کھوٹی ہوتی ہے ۔" ہما نے بھی کچھ کہنا ضروری سمجھا ۔ حالانکہ دادی کی اس ہزاروں بار کی دہرائی ہوئی کہانی سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ لڑکیوں کے لیے باجے گاجے کے ساتھ بارات آئے ۔ وہ مہندی لگا کر دلہن بنیں اور پھر ان کے دل کی کلی نہ کھلے ۔

اسی وقت دالان میں پپا کے ڈانٹنے کا شور اٹھا ۔ معلوم ہوا کہ کئی دن بعد صادق گھر آیا ہے ۔ محض اس لئے کہ پپا اسے فوراً تین سو روپے دے دیں ۔ پپا اپنے بیٹے کے آگے آندھی میں کانپنے والا خزاں رسیدہ پتہ تھے ۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ غصہ اور تحکم کا کونسا حربہ استعمال کر کے اپنے بیٹے کو منائیں ——— وہ اپنے باپ کو مانتا ہی نہ تھا ۔ صرف باپ ہی کیا ۔ محبت اور وضعداری کے سارے رشتے اسنے اٹھا کر پھینک دیئے تھے ۔ امریکن فلموں ، جاسوسی ناولوں ، ٹک دھماکوں اور نمائشوں کی مقبولیت نے اس نئی نسل کو ڈھالا ہے ۔ تنگ موری کی رنگین پتلون ، چمڑے کی جیکٹ اور کٹے ہوئے بالوں والا یہ لڑکا جانے کس زہر میں ڈوبا پایا گیا تھا کہ دو سال

کے اندر ہی اسے اپنی کینچلی بدل ڈالی۔ کالج سے اس کا نام خارج کر دیا گیا۔ پپا نے اسے عاق کر دیا۔ بہنوں نے اس کے پاؤں پکڑ کے آنسو بہائے۔ دادی نے بھی کچھ نصیحتوں سے کام لینا چاہا مگر اس تیز رفتار آندھی کو کوئی نہ روک سکا۔ چند سال پہلے جمعہ کی نماز کو پابندی سے جانے والا۔ پپا کے سامنے ہمیشہ سر ڈھانپ کر آنے والا صادق اب منہ میں سگریٹ دبا کر پپا سے کہتا تھا۔

"میں یہ بکواس نہیں سنتا۔ فوراً تین سو روپے نکالیے۔"

پپا بچارے، ذیابیطس بلڈ پریشر اور اعصاب کے مریض یہ سنکر تھر تھر کانپنے لگے۔ آواز نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دل بھی ڈوبنے پر آمادہ ہو چلا۔ اسی وقت نوید ہنگامہ سنکر باہر نکلی تو صادق نے اپنے ایک ہاتھ سے پپا کے دونوں لرزتے ہوئے ٹھنڈے ہاتھ پکڑ لئے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ان کی جیب میں کنجی تلاش کر رہا تھا۔

"صادق بھائی ــــ!" نوید چلّا پڑی مگر صادق نے کنجی نکال لی پھر وہ کنجی لے کر کمرے میں سیف کھولنے چلا گیا تو نوید نے پپا کو سنبھالا مگر وہ خود ہی ٹھیک ہو بیٹھے۔ ٹھیک نہ ہوتے تو کیا کرتے ــــ! اتنے امراض کے باوجود موت جانے کہاں چھپی بیٹھی تھی ــــ! تھک ہار کر وہ یہی سوچتے کہ شاید ان کا بیٹا کبھی نہ کبھی راہ راست پر آجائے۔ دنیا میں نوجوان لڑکے آوارہ ہو جاتے ہیں مگر نوید کا اکلوتا بھائی ان سب منزلوں سے گزر چکا تھا۔ زندگی کا اسکے نزدیک کوئی مفہوم نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں کو دن دھاڑے پکڑ لیتا بڑے بڑے بینکوں میں گھس کر چوریاں کرتا۔ تیزاب بناتا۔ جعلی پاسپورٹ پر لندن اور امریکہ ہو آتا۔ صرف ستائیس برس کی عمر میں اس نے انسانیت کی ساری جھجک کھو دی تھی۔ نوید کی نصیحتوں پر وہ ہنسنے لگتا۔

"نوید بی بی، آپ بھی اپنی دادی کی طرح میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔"

"کیوں ــــ!" نوید تنک کر پوچھتی۔

"اس لئے کہ آپ ڈاکٹری پڑھتی ہیں اور یہ ارادہ رکھتی ہیں کہ اپنی حکمت سے بیماروں کو اچھا کر دیا کریں گی۔"

"ریڈی صاحب، وہ ریڈی کی طرف مڑ جاتا۔ عورتیں بڑی رجائیت پسند ہوتی ہیں۔ ورنہ آج کوئی ہوش مند انسان دس پانچ برس آگے کی بات نہیں سوچ سکتا۔

جی —— !" ریڈی کی عینک میں سے چمکنے والی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور وہ سوچتا کہ ایٹم بم بنانے والوں کا سب سے مہلک ہتھیار تو صادق کا ذہن ہے یہ ذہن جو انسانی قدروں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

ریڈی کبھی صادق سے نہ الجھتا تھا بڑے غور سے اس کی صورت دیکھتا جس پر لاابالی پن کے ساتھ ایک نفرت انگیز چمک تھی۔ جانے کس چیز کے مس نے اس کی ہر حس مٹادی تھی۔ ریڈی کو اس سے ایک اجنبی سی نفرت تھی۔ مگر اسکے باوجود صادق میں جو کشش تھی اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کے چہرے کے نقش نوید سے بہت ملتے تھے۔ دونوں بہن بھائی ایک ہی طرح ہنستے تھے۔ وہی گلابی رنگ جو ذرا سا غصہ یا خوشی دیکھتے ہی چھلکنے لگتا۔ اتنی تندمزاجی اور نفرت انگیز عادتوں کے باوجود صادق میں ایک موہنی سی کشش تھی۔ وہی خاندانی کشش جو نوید سے لے کر بوڑھی دادی پر بھی تھی۔ جو اس گھر میں تنک مزاج ریڈی کو کھینچ لائی تھی ریڈی کی نظر ہر وقت گھڑی پر رہتی تھی۔ وہ ایک ایک منٹ کو گن گن کر خرچ کرتا تھا۔ مگر یہاں آکر بھول جاتا کہ اسے دنیا میں کچھ اور بھی کرنا ہے —— !

پپ کا غصہ ٹھنڈا کرکے انہیں خمیرہ مروارید کھلا کر جب نوید سلا چکی تو باہر والے کمرے میں ریڈی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ صادق بھی ابھی باہر نہیں گیا تھا اور بڑے مزے میں ریڈی کو بتا رہا تھا کہ کل اسنے کس طرح بھرے بازار سے ایک موٹر اڑائی اور حسین ساگر روڈ پر اسکے کل پرزے نکال کر چھوڑ آیا۔

پھر اسنے اپنی تازہ بہ تازہ اسکیم بتائی کہ حسین لڑکیوں کو کس طرح بیچا جاتا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

میں ایسے بہت سے سیٹھوں کو جانتا ہوں جو گھریلو کنواری لڑکیوں کے دس پانچ ہزار دیتے ہیں۔ وہ بھی صرف آٹھ دن کے۔ اس کے بعد ہم لڑکی واپس لے جاکر پھر اس کے شہر چھوڑ آتے ہیں۔ اور یہ سارا کام اتنی احتیاط سے ہوتا ہے کہ لڑکی ہمیں بالکل نہیں پہچان سکتی۔

یہ سنکر ہما ہنسنے لگی۔

"ہائے اللہ۔ بھائی جان، اس لڑکی کو ایسا لگتا ہوگا کہ جیسے کوئی خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھی"

متین صورت اور پاک طینت صحافی ریڈی اس کی باتیں بڑے تحمل سے سنتا رہا۔ کبھی مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔ کبھی گھبرا کر اس نوجوان کو دیکھتا جو اتنی سی عمر میں تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔ بعض وقت جب نوید اس کے اتنے پاس ہوتی کہ وہ اس دنیا سے اوپر اٹھنے لگتا۔ اسی وقت اچانک نوید آنکھوں سے آنسو پونچھ کر یاد کرتی تھی "سمجھ میں نہیں آتا بھائی ہمارے گھر میں پیدا ہو کر اتنے کیسے بدل گئے ہیں"

اور ریڈی کہیں بہت بلندی سے پھسل کر نوید کے نرم بالوں میں پناہ لیتا۔ "یہی تو وجہ ہوئی نندو۔ اگر وہ اس گھر میں پیدا نہ ہوتا تو شاید مذہب، سماج، قانون، ہر چیز سے اتنی شرارت کے ساتھ بغاوت نہ کرتا۔ تمہاری دادی کی پرانی کہانیوں اور تمہارے ابا کی ڈانٹوں نے اسے قتل کر ڈالا۔

"کیا ——!" نوید کانپ جاتی" اور پھر ہولے سے اپنا نرم ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیتی۔ —— "ایسا نہ کہئے"

اس وقت بھی جب اس کا بھائی اپنی اسکیمیں سنا رہا تھا وہ دیوار سے لگی پتھر بن چکی تھی۔ ریڈی کی نگاہیں صادق کے سرخ نائیلون کے بش شرٹ اور ڈیکرون کی پینٹ پر سے ہوتی ہوئی اسکے بے قرار چہرے پر ٹھہر جاتیں۔ صادق کسی فلمی ہیرو کی طرح بڑے اسٹائیل سے ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہا تھا بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ گالیاں دے رہا تھا اس بات سے بالکل بے نیاز ہو کر کہ دوسرے کمرے میں اس کی پچھتر برس کی دادی بیٹھی ہیں۔ دالان میں وہ ابھی اپنے باپ کو پچھاڑ کر آیا ہے۔

کئی بار ریڈی نے ارادہ کیا کہ وہ اٹھ کر چلا جائے۔ مگر نوید کے اداس چہرے نے روک لیا۔

کھڑکی کے باہر شام کی ہوائیں بالوں کو کھینچے لئے چلی جا رہی تھیں۔ کمرے میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ نوید ابھی تک دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس کا سفید دوپٹہ ہوا سے اڑ کر صادق کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ یوں صادق اور نوید کو پاس پاس دیکھ کر ریڈی کو خیال آیا کہ تاریکی کتنی تاریک ہوتی ہے اور اجالا کتنا اجلا ہے ——؟

"اچھا ریڈی صاحب، اخبار کی سب سے ATTRACTIVE نیوز کونسی ہو سکتی ہے۔"
صادق نے نیا سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"جی ــــ!" ریڈی چونک پڑا۔ یعنی کس قسم کی نیوز!"

"یہی میرا مطلب کرائم وغیرہ کی خبروں سے ہے۔"

"یہ تو خبر کی نوعیت اور خبر سٹ کرنے والے رپورٹر پر منحصر ہے۔ مثلاً ایک لڑکی کا اغوا ایک معمولی سا واقعہ بھی بن سکتا ہے اور یہی بات اخبار کی سب سے اہم نیوز بھی بن سکتی ہے۔"
اسنے بیزاری سے صادق کو ٹالنا چاہا۔

"میں بھی اخبار کی ایک اہم نیوز بننا چاہتا ہوں جسے لوگ کبھی فراموش نہ کر سکیں۔" اپنے چھوٹے چھوٹے امریکن کاؤبوائے اسٹائیل بالوں پر اسنے ہاتھ پھیر کر بڑے اعتماد سے کہا اور پردہ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ نوید چونک پڑی تھی۔ اس نے پہلے حیرت اور دکھ کے ساتھ صادق کو دیکھا پھر دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی دادی کو، جو الھڑ دوشیزاؤں کے انداز میں باہر کھیلے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور آخر میں ریڈی کو دیکھا جس پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ غور کر رہا تھا کہ صادق میں اتنی نفرت انگیز عادتوں کے باوجود ایک کشش ہے۔ وہی کشش جو دادی نے اپنے چہرے سے اٹھا کر تھوڑی سی صادق، نوید اور سما کی صورتوں پر بھی مل دی تھی۔ ایک عجیب سی موہنی کشش جس کی بدولت اس خاندان کا ہر فرد جس پر چاہے خدائی کر سکتا تھا۔ جو اس گھر میں امول پرست ریڈی کو گھنٹوں بٹھائے رکھتی تھی۔

پھر نوید اپنی جگہ سے ہلی اور دواؤں کے بکس میں نئے انجکشن کا ٹیوب نکال کر پپا کے پاس چلی گئی۔ تیز ہواؤں اور بارش کی پرواکئے بغیر شجاعت علی چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ پپا کو اداس دیکھ کر نوید کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے باوجود وہ اس گھر سے اداسی مٹانے کا کوئی علاج نہ ڈھونڈ سکی تھی۔ اسے اپنے عالیشان اور سخت مزاج پپا اپنی ہٹ دھرمی کے باوجود بہت اچھے لگتے تھے۔ پنشن کے بعد کی بیکاری، مسلسل بیماریوں اور صادق کے دکھوں نے انہیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ان کی آواز کا تحکم بڑھ گیا تھا۔ اور وہ ہر چھوٹی بڑی بات میں اپنی رائے منوا کر چھوڑتے۔ دراںڈے کے ایک کونے میں

دن بھر میٹھے بیٹھے انہیں احساس ہوتا کہ دنیا ان کے وجود کو بالکل فراموش کر چکی ہے۔ مگر نوید کا جی چاہتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بجائے افسانہ نگار ہوتی اور اپنے اتنے پیارے! پیپے گریس فل باپ کے متعلق بڑی شاندار کہانیاں لکھتی۔ ان کے دل کا دکھ دنیا کے ہر انسان کے دل تک پہنچا سکتی۔ اسی لئے جب کبھی ریڈی یہ اندیشہ ظاہر کرتا تھا کہ اس کے سخت مزاج پپا اس کا بیاہ ریڈی سے نہ ہونے دینگے تو اپنے پپا کے اس ہولناک روپ کو یاد کر کے وہ رونے لگتی تھی جب سے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ شجاعت علی کے لئے کوئی بھی غیر معمولی خبر موت کا پیغام بن سکتی ہے تو نوید اور بھی گھبرا گئی تھی۔ ایک نہ ایک دن تو اسے ریڈی کے ساتھ جانا ہے۔ پھر پپا یہ خبر کیسے سنیں گے؟ ریڈی بھی کیسا بے وقوف تھا کہ اس گھر میں گھس آیا جہاں عورتیں اپنی ٹانگیں توڑے بیٹھی ہیں۔ یہ عورتیں اتنی جلدی کیوں تھک جاتی ہیں ——! نوید سوچتی۔ دادی تو خیر دادی ہیں لیکن مما بھی تو ڈاکٹری کی بیساکھیاں لگانے کے باوجود ریڈی تک نہیں جا سکتی۔ اور وہ بچارہ ساری دنیا کی بلکہ خیر خبروں سے منہ موڑے اس کی ہاں سننے کے انتظار میں تین سال سے یہاں بیٹھا ہے۔ یہ بات دادی بھی جانتی تھیں اور پپا بھی —— مگر مصلحتیں، مجبوریاں، اخلاقی کمزوری اور زردست انہیں کچھ نہ کہنے دیتیں۔

کون ہے؟

نوید نے گھبرا کے سوچا اور رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اسنے اپنے آپکو سمجھایا کہ دروازہ مت کھولنا معلوم ہے! بعض وقت بھولے سے دروازہ کھول دو تو اندر کون گھس آتا ہے!

ہوا کا کوئی جھونکا ہوگا۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا اور دوبارہ تکیے پر سر رکھ دیا۔

کسی تتلی کا تعقب کرتے کرتے میرا دل جھنجھوڑ گیا

باہر چاندنی بھی تو غضب کی پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی روپہلی راتوں میں تو دل بھی اجالوں سے بھر جاتے ہیں۔

بجائے ہوا کے جھونکے بھی کیا کریں۔

ریڈی کہتا تھا اسنے دس برس سے چاندنی رات نہیں دیکھی۔ وہ شام کو اخبار کے آفس جاتا ہے اور صبح واپس آتا۔ پھر ایک دن نوید نے جاتے وقت اسے دروازے پر روک لیا تھا۔

"آج پورے چاند کی رات ہے آج میں آپ کو چاند دکھاؤں گی۔"

سچ — ! ریڈی نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور پھر چھوڑ دیا۔

"ہم نے چاند دیکھ لیا۔"

"ہشت ..." وہ شرما گئی اور جب ریڈی کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو پپا نے بھی اس چاند کو دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک ایسے ہی غیر مذہب کے لڑکے نے ان کے باپ کا سکون لوٹ لیا تھا۔ پھر پپا کو اپنی ماں کی محبت نہ ملی۔ ان کے باپ نے زندگی بھر ایک ایسی عورت کا پیچھا کیا جس کی روح ان کی نہ بن سکی۔

"بس اب آج کے بعد ریڈی اس گھر میں نہ آئے۔ سنا تم نے نوید بی بی؟" انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تمہاری دادی عصمت جاہ کی پوتی تھیں۔ اسلئے وہ اپنے بال سیاہ لئے بیٹھی رہیں۔ مگر تم — تم اس بے بس بوڑھے کی اولاد ہو بیٹیا۔ تمہارے لئے وقت اپنی رفتار نہیں روکے گا۔"

مگر وقت پھر بھی تھم گیا تھا۔ نوید کا ایک پاؤں کمرے سے باہر تھا اور دوسرا اندر — اور دور بیٹھی بڑی دادی کی جھلکتی ہوئی نظریں دیکھ رہی تھیں کہ نوید اب کہاں قدم رکھے گی! لیکن وہ ساکت تھی۔ پپا سوچ رہے تھے کہ اس گھر میں ریڈی کیوں آتا تھا! نوید کے تو بہت سے دوست ہوں گے مگر کسی کو کیا حق ہے کہ ان کے اور ان کی ماں کے جھگڑے طے کرائے۔ ان کی دوائیں تو وہ خریدے۔ اور وہ خود حیران تھے کہ انہوں نے ریڈی سے پانچ ہزار قرض کیوں لیا۔ ہر دن وقت اماں کا کھانے پر انتظار کیوں کرتے رہے انہوں نے اپنی ماں اور بیٹے کے زخم رو رو کر اسے کیوں سنائے۔

دروازے باہر کون کھڑا ہے!

نوید نے کروٹ بدلی۔ اس بچارے کو بھی رات نے کہاں آلیا۔ بعض وقت ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ آدمی پورب کی اور سفر کرنے نکلے اور پچھم کی اور پہنچ جائے۔ ایسے راہ بھولنے والے مسافروں کی بہت سی کہانیاں دادی کو یاد ہیں۔ یہ مسافر میلوں دور سے کسی خوبصورت لڑکی کی خوشبو سونگھ لیتے ہیں۔ ان کے حسن کا چراغ مسافر کو کھینچے لئے جاتا ہے۔ اس جھونپڑے میں ایک اندھے باپ کا وجود مسافر کی راہیں روشن کر دیتا ہے۔ اور صبح جب وہ اپنے ملبند ارادوں کو ایڑ لگا کر آگے بڑھتا ہے تو لڑکی کی یاد زادِ راہ بن جاتی ہے۔ آگے بڑھ کر نئی رات! اور نئے گھاٹ کا پانی مسافر کے منہ کا مزا بدل دیتے ہیں۔ راتیں تو آیا ہی کرتی ہیں اور دور جنگل میں جلتے ہوئے چراغ مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر بلاتے ہیں۔

دادی بھی خوب ہیں ——— خود ہی یہ کہانیاں سناتی ہیں اور خود ہی انہیں بھول جانے کی ہدایت کرتی ہیں۔

باہر زور شور کی بارش ہو رہی تھی۔ بجلیاں آکاش پر لڑھکتی پھر رہی ہیں۔ اور تیز ہوائیں ہر چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔

بستر پر لیٹے لیٹے نوید نے دیکھا کہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کے جھرنے بھی بہنے لگے تھے۔ شاید دادی کی خوفناک کہانیاں اسے یاد آ رہی تھیں۔ یا پھر شاید دوسرے کمرے سے ہما کی آواز نے اسے رولا دیا۔

ہما میڈیکل کالج کے ایک پروگرام کی زور شور سے تیاریاں کر رہی تھی۔ محض اس پروگرام کی خاطر اس بار وہ میٹرک کی اسٹڈی بھی چھوڑے بیٹھی تھی۔ اور شام سے گنگنائے جا رہی تھی۔

ایک چنبیلی کے منڈوے تلے
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے

"ہشت ——— کیا بکواس لگا رکھی ہے ———! اس نے اٹھ کر ہما کو ڈانٹ دیا۔ ادھر سے دادی نے کہا۔

"ادئی کیا منحوس گانا گا رہی ہو بی بی"

"میں جہاں گانے بیٹھی اور سب نے ڈانٹ دیا۔ جاؤ اب کبھی نہیں گاؤں گی" ہما چھوٹے بچوں کی طرح مچل اٹھی۔

"ابھی گانے کو کون اجاڑ صورت منع کر رہا ہے بی بی۔ مگر ایسے بڑے گیت نکو گایا کرو۔ بڑے بڈھے لوگاں بولتے تھے جو بات ہر وقت زبان سے نکالو وہ ہو کر رہتی ہے"

یہ سنکر نوید جلدی سے بستر سے اٹھ بیٹھی۔

"اور آپ جو ہر وقت راہ بھٹکنے والے مسافروں کی کہانیاں سناتی ہیں ۔۔۔ !" ہما کو کٹ حجتی کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

"تو پھر وہی ہوانا ۔۔۔" دادی نے اطمینان سے پان لگاتے ہیں کہا ۔۔ "مسافر راستہ بھول گئے"

"کیا ۔۔۔ !" یہ دادی بھی اب سٹھیا گئی ہیں۔ نوید چونک پڑی۔

"کیوں بھولتے مسافر راستہ ۔ اب تو شہزادوں کے پاس دس دس موٹریں ہیں۔ کوئی سمنٹ کی سڑکوں پہ بھی راہ بھولتا ہے۔۔۔ ؟ ہما کو بڑبڑانے کی عادت تھی۔

"ہے ہے ہے"۔۔۔ دادی کی بے ساختہ ہنسی گونج اٹھی۔

اور نوید نے ایک بار پھر سوچا کہ دادی اپنی یہ جوان ہنسی، سیاہ بال، آنکھوں کی چمک اور مسّی لگے مضبوط دانت، ہر چیز کس کے انتظار میں لئے بیٹھی ہیں!

دادی کی اس بے تکلف ہنسی نے ہی ان کی دونوں پوتیوں کو ان کے بہت پاس کر دیا تھا۔

"کیوں کیا سمنٹ کی سڑکیں کسی کو بھٹکنے سے روک لیتی ہیں! دادی نے پان منہ میں رکھ کر کہا اور نوید جھنجھلا گئی۔

"اللہ دادی، اب آپ ہی چپ رہیے نا"

اس وقت دادی کی شکر بھری باتوں میں اسے کونین کی تلخی لگ رہی تھی۔ ادھر منع کرنے کے باوجود ہما پھر گنگنائے جا رہی تھی۔

میکدے کی دراروں نے دیکھا انہیں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں

مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے۔
ایک چنبیلی کے منڈوے تلے۔

نوید پھر اپنے بستر پر آبیٹھی اور اپنا کمرہ یوں دیکھنے لگی جیسے آج پہلی بار اس اجنبی جگہ آئی ہو۔ دروازے کے قریب ہینگر پر ایک انسان کا ڈھانچہ تیز ہوا میں کانپ رہا تھا اور اسکے نیچے الماری میں اور میز پر، جہاں اس کی ڈاکٹری کا سامان رکھا تھا۔ وہیں ایک خوبصورت سا پران کالسی کا مجسمہ بھی رکھا تھا۔ یہ مجسمہ بھی اور بہت سے نادر سامان کی طرح دادی کے جہیز کا تھا۔ ان چیزوں کو جب ایک ایک کر کے نیلام کرنا پڑا تھا۔ تو نوید اس مجسمے کو اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ یہ ایک عورت کی شبیہ تھی جو رسیوں میں جکڑی گردن موڑے بیٹھی تھی۔

اس کی نزاکتوں کو نوید نے گھنٹوں پرکھا تھا اور لوگوں کو اسکی خوبیوں سے واقف کرایا تھا۔ مگر آج پہلی بار اسنے محسوس کیا کہ اس عورت کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی بے بسی ہے جیسے اسکی بے چین آنکھیں راہ تکتے تکتے پتھرا گئی ہوں۔

یہ کون مصور ہے جس نے ہر جگہ عورت کی آنکھوں میں انتظار کو جاوداں بنا دیا ہے۔

اسنے شال اٹھا کر پھینک دی اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔

چارہ گر یہ بتا تیری زنبیل میں
نسخہ کیمیائے محبت بھی ہے

ہما نے کان لگا کر سنا ـــ تو بھلا کہاں تو اپیا مجھے ایسی فضول نظم گانے سے منع کر رہی تھیں یا اب خود چارہ گر کی زنبیل میں کوئی نسخہ تلاش کیا جا رہا ہے!

ہما نے دونوں ہاتھوں میں ٹھوڑی ٹکا کر سوچا۔

ان دو چار مہینوں میں یہ گھر کتنا بدل گیا ہے۔ اب نہ تو رات کو ریڈیو کی محفلیں جمتیں، نہ نوید کی ہنسی سنائی دیتی، نہ دادی اپنی کہانی کا کوئی مزے دار حصہ سناتی تھیں۔ پپا بھی اب ہر آنے والے کو کاٹ کھانے نہ دوڑتے تھے۔

دادی تو جیسے اب اپنی کہانی کا آخری باب سنا کر محفل سے اجازت لے چکی تھیں۔

جب سے انہوں نے ریڈی کے گھر میں نہ آنے کی بات سنی تھی وہ نوید سے کبھی کبھی پھرتیں جس وقت انہوں نے نوید کی زرد رنگت، لرزتے ہونٹ اور جھلملاتی آنکھیں دیکھی تھیں وہ صبح سے دوپہر تک گم سم بیٹھی رہی تھیں۔ ہونہہ، یہ آج کل کی چھوکریاں۔ انہوں نے سوچا یوں سمجھتی ہیں جیسے انہوں نے پڑھ لکھ کر بڑا تیر مار لیا ہے۔ ہزار بار کہا کہ عورت تو ہر زمانے میں عورت ہی رہے گی۔ میں نے اس لڑکی کو کتنے قصے سنائے۔ اپنی زندگی کا ہر ہولناک حادثہ سنا ڈالا مگر اسے میرے سیاہ بالوں اور چمکتی آنکھوں سے ذرا ڈر نہ لگا۔

کون جانے سچ یا جھوٹ۔ عورتیں اگر ہوائی جہاز بھی اڑانے لگیں پھر بھی نہیں بہرحال زمین پر ہی آنا پڑتا ہے۔ عورتیں بھلا اڑ کر کہاں جائیں گی؟ یہ چھوکری بھی اٹھی تھی۔ ڈاکٹری پڑھ آئی۔ جیسے ہر دکھ کی دوا ڈھونڈ لائی ہو۔ اسکی سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے پیروں کو کون فالج مار گیا ہے۔ وہ آج تک حیران ہے کہ میرے بال سفید کیوں نہیں ہوتے۔ اب پتہ چلے گا جب وقت نہ آگے بڑھے گا نہ پیچھے ہٹے گا۔ ساری زندگی عالم برزخ میں گزر جائے گی۔ پھر وہ چیخیں مار مار کے رونے لگیں۔ نوید ہاسپٹل جا چکی تھی۔ ہما اور بیپا کے ساتھ گھر کے سب نوکر بھی ان کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ہما سخت حیران تھی۔ اسنے آج تک دادی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے تھے۔ مگر آج وہ یوں تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں جیسے سارے جسم میں سوئیاں چبھو رہی ہوں۔

دادی کی ایسی حالت دیکھ کر وہ خود بھی رونے لگی۔ "دادی —— دادی آپ کو کیا ہوا۔ —— بتائیے آپ کیوں رو رہی ہیں —— !" وہ دادی سے چمٹ گئی۔ مگر بیپا نے اسے ہٹا دیا۔ "سب لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ آج امی حضرت کو اپنے دل کی بھڑاس نکال لینے دو۔" وہ ہما کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلے اور جاتے جاتے کمرہ بند کرتے گئے۔ ہما کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔ یہ بیپا کیسے کٹھور دل ہیں۔ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ دادی کو کیا تکلیف ہے!

شام کو اسنے جھانک کر دیکھا۔

دادی شاید سو چکی تھیں۔ دروازے کی طرف سے کروٹ لئے چپ چاپ مسہری پر لیٹی تھیں۔

"دادی" اسنے گھبرا کے پکارا۔

اور دادی نے پلٹ کر اسے دیکھا تو ہما آنکھیں ملنے لگی۔ جیسے آج برسوں کے بعد دادی کو دیکھا ہو۔ اور ان اَن گنت برسوں میں دادی کے چہرے کی رنگت میلی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی جیسے وہ بوڑھی ہو کر اس دنیا کے ہنگاموں سے تھک چکی ہوں۔ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر ہما لپٹ گئی۔

"دادی آپ کو کیا تکلیف تھی۔ آج آپ کیوں رو رہی تھیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا ــــ"

"کیوں ــــ؟" دادی نے اسکے آنسو پونچھے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"کہیں آپ کے بال سفید نہ ہو جائیں"، ہما چھوٹی بچیوں کی طرح ان کے کاندھے سے چمٹی بیٹھی تھی۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہو گی بیٹی۔ میرے بال سفید ہو جائیں گے تو پھر رونا کس بات کا رہے گا!

شام کو گھر میں پھر بڑی دھوم مچی۔ بیلے نے جلد بازی کی حد کر دی۔ غور تو جیسے ادھار کھائے بیٹھے تھے، نوید کو راشد علی خاں کے گھر لے جانے پر۔ اور پھر راشد علی خاں بھی کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں۔ جیسے ہی انکے سسرے کی آنکھیں بند ہوئیں اور انہوں نے ایک لاکھ کی جائیداد پر قبضہ کیا تو ایک پڑھی لکھی بیوی کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اپنی اس کنجوس سڑی لیسی بیوی کے لئے دوائیں لاتے لاتے تھک گئے تھے۔ اور پھر وہ ایم۔ اے پاس (اپنے خاندان میں انہوں نے پہلی بار ایم اے کیا تھا۔ اس لئے اپنے آپ کو بقراط سمجھ کر ایک اونچے مینار پر جا کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں سے دنیا کی جاہل مخلوق پر انہیں بے حد ترس آتا تھا) اس پر مستزاد انہوں نے ایک بار جانے کس دھن میں غالب پر ایک مضمون لکھ ڈالا تھا "غالب اور ان کا فلسفۂ حیات" یہ مضمون دوبارہ ایک ہفت روزہ میں یوں شائع ہوا "غالب اور ان کا دور" اور تیسری بار ایک ادبی مجلس میں یوں پڑھا گیا "غالب اور میں"۔ اس طرح مقامی ادبی حلقوں میں وہ اچھے خاصے ماہرین غالب میں

شمار کئے جاتے تھے۔ چنانچہ اسم نویسی کا جو کاغذ آیا تو اس میں سنہرے حروف سے دولہا کی یہ قابلیت بھی نمایاں طور پر لکھی ہوئی تھی۔ دادی نے گھنٹوں اس کاغذ کو پڑھا اور ہر بار دولہا کے ادیب ہونے والی بات پر ناک بھوں چڑھائی۔ سپا کی نظریں تو بس ایک لاکھ کی جائیداد پر سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔

"ہماری بیٹی بھی تو تین چار سو کما لیتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اماں حضت بڑی خوشگوار زندگی ہو گی نوید کی۔ اب کونسی کسر رہ جائے گی۔ سب کچھ مل جائے گا اسے۔"

"سب کچھ ــــ!" دادی نے چونک کر اپنے سفید بالوں والے بیٹے کو دیکھا کہ وہ بالکل سٹھیا گیا ہے۔ چھی، انہوں نے بھی کس گدھے کو جنم دیا تھا! کم بخت اتنی سی بات بھی نہیں جانتا کہ عورت کو کیا دیا جاتا ہے اور کیا لیا جاتا ہے۔ پھر انہوں نے خوف زدہ نظروں سے اپنے بیٹے کے اس انگریزی فیشن والے گھر کو دیکھا جہاں لمبی لمبی خندقوں جیسے کمرے ڈربے جیسے بن گئے تھے۔ اب وہ سارے مضبوط ستون ٹوٹ کر گر چکے تھے۔ اب وہاں کوئی ستون اتنا مضبوط نہ تھا کہ جسے پکڑ کر نوید اپنی دادی کی طرح رک سکے۔

پھر یہ ہوا کہ کہاں تو دادی ہر وقت لڑکیوں کو جلد اٹھلانے پر شور مچایا کرتی تھیں یا شام کو دولہا والے لڑکی دیکھنے آئے تو ذراسی بات پر بھڑک کر سب کو واپس لوٹا دیا۔ بیا خوب جھنجلائے پیر پٹکے۔ اماں حضت کو سب کچھ کہہ ڈالا مگر وہ یہی کہتی رہیں۔ ان عورتوں نے نوید کو چاروں طرف سے تو الٹ پلٹ کر دیکھ ڈالا پھر یہ ضد کیوں تھی کہ وہ چل کر بھی دکھائے ــــ! واہ یہ بھی کوئی شرط ہوئی۔ اور کبھی کیا پتہ کہ عین وقت پر بھی نوید کے پیروں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اپنے دولہا کے ساتھ بھی چل سکے ــــ!

خیر شجاعت حسین نے سوچا کہ آئندہ اس سٹھیائی ہوئی بڑھیا کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہئے ورنہ نوید کسی دن ریڈی کے ساتھ غائب ہو جائے گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی پڑھی لکھی بیٹی اپنی دادی کی طرح سر پر ننگی تلوار دیکھ کر بھی کسی کو قبول نہ کرے گی۔ اور ایک دن وہ بھی صادق کی طرح انہیں جواب دینے کو کھڑی ہو جائے گی۔ اس لئے جب راشد کا پیغام آیا تھا تو وہ نوید کی صورت دیکھ کر کانپنے لگے تھے۔ سخت حیران تھے کہ نوید احتجاج کیوں نہیں کرتی۔ اس گھر سے

چلے جانے کی دھمکی کیوں نہیں دیتی! وہ ہمیشہ سے اپنے باپ کا حکم سر جھکا کر سنتی آئی ہے۔
شاید اسی لئے وہ ہر وقت اپنی دونوں لڑکیوں پر چلا چلا کر یہ احساس جگائے ہوئے تھے کہ وہ ایسے
ویسے باپ نہیں ہیں۔ ان کی مرضی اور حکم بھی کسی پر چل سکتا ہے۔ اسی لئے وہ نوید کو چھوٹی چھوٹی
باتوں پر ٹوکتے تھے۔ وہ ساری نہ پہنے۔ ہاسٹل کے کسی فنکشن میں شریک نہ ہو۔ کالج سے آ کر ان
کا کھانا خود پکائے۔ کسی لڑکے سے میل جول نہ بڑھائے۔ نوید کو ان ساری باتوں پر عمل کرنا بہت
اچھا لگتا تھا۔ صادق کے پہنچائے ہوئے زخموں کو مندمل کرنے کے لئے وہ چاہتی تھی کہ پپا اسے
مرنے کا حکم دیں اور وہ مر جائے۔ اسکے ہونٹ سدا کھلے رہتے۔ اس کی جھنکاروں والی ہنسی
کسی وقت نہ تھمتی۔ پھر جب ریڈی آنے لگا اور پپا کے پاس فرماں بردار بیٹے کی طرح بیٹھا
ان کے دکھ سنتا تھا تو وہ سمجھی کہ اب یہ دونوں ہمیشہ یوں ہی سر جوڑے بیٹھے رہیں گے، مگر
اچانک ریڈی کے قرض کے بوجھ تلے دب کر پپا اچھل پڑے۔

یہ ہندو لڑکا اس قرض کے سود میں ان سے کیا کیا وصول کرنا چاہتا ہے ——! اسی
لئے جب انہوں نے ریڈی کو گھر میں آنے سے منع کیا تو یوں ہی کہہ دیا جیسے وہ نوید کو لپ اسٹک
لگانے سے منع کر رہے ہوں۔ مگر نوید کی خاموشی سے وہ گھبرائے جا رہے تھے۔ وہ چائے لے کر
کمرے میں آتی تھی تو یوں لگتا جیسے انہیں اپنا فیصلہ سنانے آئی ہو اور وہ ہر بار اپنے
آپ کو تیار کرتے کہ کس طرح ڈانٹیں گے، دھمکیاں دینگے، اور آخر میں ہار جائیں گے۔
ایک پڑھی لکھی لڑکی کے آگے ایک مقروض بے بس باپ کی حیثیت ہی کیا ہے! اور پھر بقول
ان کی اماں حضرت کے انہوں نے اپنے گھر کی روایت کے مطابق پندرھویں برس نوید کو
کیوں نہ بیاہ دیا۔ اب وہ زندگی بھر تو ان کے لئے مارفیا کے انجکشن لئے نہ کھڑی رہے گی۔ اب
ایک نہ ایک دن تو انہیں اس خبر کو سننا ہی ہے ——!

رات برف کی طرح پگھل رہی تھی اور دادی کی رگوں میں خون جمتا جا رہا تھا۔ بڑھاپے کا سرد
خون جس میں مدافعت کی قوت بالکل نہیں ہوتی۔ تیز ہوائیں زرد پتوں کو زمین پر گرا رہی تھیں

اور دادی سوچ رہی تھیں کہ ایک ایسا ہی تیز جھونکا مجھے کیوں نہیں اکھاڑ پھینکتا! کھڑکی سے باہر ٹھٹھری ہوئی چاندنی گم سم تھی۔ ہما کے لگائے ہوئے گلاب اور ہولی ہوکس کے پھولوں نے گردنیں جھکالی تھیں۔ ان کا بیٹا اپنے ہوش و حواس سے کوسوں دور تھا۔ نوید چلاتے چلاتے اور روتے روتے اب تھک کر دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ یوں جیسے اس میں حرکت ہی نہ ہو۔ جیسے وہ دیوار میں سما جانا چاہتی ہے۔ سما جائے گی۔ آج پانچ مہینے کے بعد ریڈی پھر آیا تھا اور اپنی مخصوص کرسی پر مخصوص انداز میں بیٹھا پیر ہلا رہا تھا۔ بار بار سگریٹ کا گل جھاڑ کر وہ ادھر ادھر دیکھتا۔ سر پر ہاتھ پھیرتا۔ عینک ٹھیک کرتا اور پھر جیسے اپنے آپ سے کہتا۔

"دس ہزار ——— کیا اب ہما کے علاوہ گھر میں دس ہزار کی مالیت والی کوئی چیز نہیں رہی تھی ———!"

اس کے سوال پر سب نے اپنی اپنی قیمت کا اندازہ لگایا۔ شجاعت حسین ایک لاکھ کے مقروض تھے۔ سودا الگ رہا۔ اب ان کی اپنی کون سی چیز بچی!

نوید سوچ رہی تھی کہ ہما کی بجائے صادق اسے بیچنے نکلتا تو کوئی نہ خریدتا۔ لوگ تو کلیاں خریدتے ہیں۔ باسی پھول کون اٹھاتا پھرے۔! اور دادی ——— دادی سوچ رہی تھیں کہ دس ہزار کی تو وہ ہیرے کی بالیاں ہیں جو ان کے کانوں میں پڑی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ تاب ٹھیک کہتا تھا کہ ان ہیروں کا آخر مصرف ہی کیا ہے! اور ان کا احمق بیٹا سمجھتا تھا کہ اس کی ہیرا سی بیٹیاں بڑے بڑے گھروں میں جائیں گی ——— لو آج اس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ لو آج پھر ریڈی بچارا آ بیٹھا ——— ان سارے نازک مزاج عقلمندوں کو ہیرا چاٹ کر ہی مرنا ہے۔ چاہے افلاطون کی صورت تاب ہو یا بقراط کا دماغ رکھنے والا ریڈی۔

——— ارے احمقو ——— تم صرف اس لئے ہو کہ ہیروں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے۔

آخر ریڈی کو اپنے اخبار میں ایک تہلکہ خیز خبر دینا پڑی۔ منٹ بھر میں صادق ساری دنیا کی نیوز ایجنسیوں میں گونج اٹھا۔ اپنی بہن کو دس ہزار میں رہن رکھنے والے نوجوان کا فوٹو کئی اخباروں نے شائع کیا اور ریڈی بھاگتا ہوا آیا ——— "ہما کہاں ہے ———؟"

ریڈی کو پھر اپنے گھر میں دیکھ کر شجاعت حسین چونک پڑے مگر بڑے ضبط کے ساتھ بولے

"صادق کے ساتھ "ہوشربا" گئی ہے۔"

"نہیں وہ کلکتے کے ایک سیٹھ کے ہاں رہن پڑی ہے۔ صادق نے اسے ایک ہفتے کے لئے دس ہزار میں رہن رکھا تھا۔ مگر روپیے کر جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا تو جانے اسے کیا ہوا کر اس نے ہگلی میں چھلانگ لگادی۔ ابھی تک اسکی لاش نہیں مل سکی۔"

ریڈی کہتے کہتے مڑا تو نوید چیخ مار کے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے دھڑام سے گر پڑی۔ مگر ریڈی کی باہوں نے اسے گرنے نہ دیا۔ شجاعت حسین بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یوں جیسے اب کبھی نہ اٹھیں گے۔

اسکے بعد جب ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا تو کمرے میں بیٹھے ہوئے سب لوگ پتھر بن چکے تھے۔ دادی بڑے غور سے اپنے مفلوج پیروں کو دیکھ رہی تھیں جیسے انہیں ابھی ابھی ان کے بیکار ہو جانے کی اطلاع ملی ہو۔ شجاعت حسین دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے۔ شاید وہ خواب میں اپنے آپ کو ایک آزاد چڑیا کی طرح ہر طرف اڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ یا کلکتے کے کسی بنگلے میں سے بلند ہونے والی چیخیں سُن رہے تھے۔ نوید کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں گالوں پر سے ہوکر اسکے سفید ٹھنڈے ہاتھوں پر گر رہی تھیں اور وہ اس مجسمے کو گھور رہی تھی جس میں رسیوں سے جکڑی ہوئی عورت کی آنکھوں میں انتظار منجمد ہو گیا تھا۔

"دس ہزار ــــــ! دس ہزار کہاں سے آئیں گے ــــــ! وہ پاگلوں کی طرح چلا اٹھی۔

"مگر دس ہزار کا کیا ہوگا!" یہ بات ریڈی نے نوید سے نہ کہی تو دادی نے پوچھ لی۔

ارے پگلی اب وہ جہاں ہے ٹھیک ہے۔ آگے کیسے بڑھے گی ـــــ! ہر لڑکی کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب وہ اپنے محور پر پہنچ جاتی ہے۔ رُک جاتی ہے۔ اسے وقت کا لمحہ پتھر بنا دیتا ہے۔ اب وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بیٹا بھی وہاں چلی گئی جسکے لئے وہ پیدا ہوئی تھی جسکے لئے اس نے اپنی آنکھوں میں جادو جگانا سیکھا تھا۔ سب عورتوں کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ چاہے وہ دس ہزار میں بکیں یا دس پیسوں میں۔

ایک بار پھر شجاعت حسین بھول گئے کہ وہ ریڈی ہندو ہے اور ایک ایسے ہی ہندو لڑکے نے

ـ کے باپ کا سکون چھین لیا تھا۔ کیونکہ اس وقت دس ہزار دے کر ریڈی نے انکی گردن بلائی تھی۔ اور دس ہزار روپے اتنی بڑی سچائی ہیں کہ ان کی چکا چوند میں پپا کا کمزور حافظہ ہر ت بھول گیا۔

پھر سب ہما کو لینے ایروڈروم یوں گئے جیسے وہ کوئی بہت بڑی ڈگری لے کر واپس رہی ہو۔ جب تک ریڈی اسے لانے نہیں گیا تھا پپا ہما کے لئے بے چین تھے مگر جب ایروڈروم پر کھڑے تھے تو ان کا جی چاہ رہا تھا کہ ہوائی جہاز کسی پہاڑ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ ہما نے بھی بنگلی میں گر کے خودکشی کر لی ہو۔ کوئی حادثہ ہو مگر ہما اب گھر تک نہ آئے۔

ان کے پاس کھڑی ہوئی نوید آسمان کو تک رہی تھی۔ جیسے آج سے پہلے اسے کبھی آسمان ۔۔ دور نہ لگا تھا۔ مارچ کی گرم دوپہر میں وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کہیں ہما اس صدمے سے ل نہ ہو گئی ہو۔ اب اسے کیسے بہلاؤں گی ـــ وہ کہاں جائے گی کیا کرے گی!

پھر ہما پلین کی سیڑھیوں پر نمودار ہوئی۔ پھر وہ نوید سے چمٹ گئی۔ نوید کی ناک میں ۔ انوکھی سی نکھی خوشبو بس گئی۔ ہما کے چہرے کی چمک اسکی رنگین ساری کا اجالا اور ہما کے ہرے کے سکون نے اسے ڈرا دیا۔ پاگل پن میں لوگ اتنے حسین کیسے ہو جاتے ہیں! ہما کی لعوں میں کیسا انجانا سا کیف چھایا ہوا تھا۔ جیسے ست رنگے خوابوں سے وہ ابھی جاگی ہو۔

راستے میں وہ حسبِ عادت اپیا سے چمٹ گئی۔

"اپیا، مجھے جلد واپس کر دینا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"وہ ـــ ! وہ کون ـــ ؟" نوید نے آنسوؤں کی جھالر تلے سے اسے دیکھا۔

"وہی صادق بھائی کے دوست۔"

نوید سمجھ گئی کہ صادق نے اسے سجا بنا کر حوالے کیا ہوگا۔ وہ ہما کی اس کمزوری سے واقف ناکہ وہ دلہن بننے کے ارمان میں جی رہی ہے۔ ممکن تھا کہ ہما روپیٹ لیتی تو صادق خودکشی کرتا!

گھر آ کے وہ سب سے پہلے دادی کے قدموں میں جا گری۔ دادی نے اسے دیکھا تو

اچھل پڑیں۔ انہوں نے ٹھوڑی اٹھا کر ہما کو دیکھا اور دیکھتی رہیں۔ پھر یوں چھوڑ دیا جیسے۔ دہکتا ہوا انگارہ چھو لیا ہو۔ ہما سہاگنوں کی طرح کھلی جا رہی تھی۔ اسنے ہنس ہنس کر نوید کو بتایا کہ خریدنے والے کے ہاتھ وہ جسم کے ساتھ اپنی روح بھی بیچ آئی ہے۔ اب وہ ایک ہفتے سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہرے گی۔

"قسم اللہ کی اپیا، وہ تو سیکر بنا ساری رات جاگیں گے۔"

"جب تک میں نہ کھلاؤں کھانا ہی نہیں کھاتے۔"

"ذرا دیکھنا گیٹ پر پوسٹ مین تو نہیں ہے۔!"

مگر ایک مہینے بعد بھی پوسٹ مین نہ آیا تو وہ رو دتی پھرتی۔ نوید بھی سامان والے کمرے میں گھسی آنسو بہائے جاتی۔ اپنا دکھ تو اسکے سامنے سے چلنے کہاں غائب ہو چکا تھا اب تو اپنی بہن کی جوان لاش دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ دادی کے بالوں پہ اچانک سنہری دھوپ ڈول رہی تھی۔ اور وہ ہر وقت ہما کو تکے جاتیں۔

"اپیا، اپیا۔ انہیں مچھلی کے کباب بہت پسند ہیں۔"

"ذرا یہ تو بتا دو کہ ان کی پینے کی عادت کیسے چھڑاؤں۔ پی کر وہ بہت بہکنے لگتے ہیں۔ ایک دن تو مجھ سے ایسی باتیں کرنے لگے کہ میں رو پڑی۔"

اور پھر وہ روتی رہی۔ دادی کی بجائے اب ہما دن بھر کھڑکی سے باہر تکے جاتی۔ ایک دن غصہ میں ببا نے کھڑکی بند کر کے اس سے کہا۔

"ان کے دس ہزار روپے ہم نے واپس کر دیئے ہیں۔ اب تجھے یہاں سے کوئی لے کر نہیں جا سکتا۔ جا اپنے پلنگ پر لیٹ کر سو جا۔"

ہما نے یہ بات سنی تو دھم سے پلنگ پر جا لیٹی۔ پھر اٹھ کر چاروں طرف کوئی چیز ڈھونڈنے لگی۔ پھر اٹھ کر جلدی جلدی کپڑے بدلے اور میک اپ کر کے کہیں جانے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو ـــــ؟" نوید نے ہاتھ پکڑ کے اسے روک لیا۔

"ابھی آئی۔ سڑک میں میرے دس ہزار روپے گر گئے ہیں۔ ذرا نکال لاؤں۔" وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔" جانتی ہو اپیا، دس ہزار روپے کتنے ہوتے ہیں ـــ! بہت ـــ بہت

— ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں — ذرا گن کر تو بتا دو — میں شرط لگا سکتی ہوں کہ دس ہزار روپے کوئی نہیں گن سکتا —"

وہ بکے جاتی۔ یا پھر بڑی سنجیدگی سے گانا گانے لگتی:

چارہ گر یہ تو بتا تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے۔
کچھ مداوے درد الفت بھی ہے۔

محلے میں اس واقعہ نے بڑی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ نوید باہر نکلتی تو لوگ گھیر کے سما کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیتے۔ گھر میں ہر وقت نئی نئی صورتیں نظر آتیں۔ دادی سب کو جواب دیتے دیتے اپنے جاتیں۔ سما کا قصہ سنکر اب راشد میاں نے بھی اپنی بیمار بیوی کی تیمار داری بہتر سمجھی۔ غوثو میاں سے جب بھی شجاعت حسین نے اس موضوع پر بات کرنا چاہی وہ ٹال گئے۔ — "ابھی جلدی کیا ہے بھائی صاحب، پہلے آپ ریڈی صاحب کا قرض تو ادا کر دیجئے۔"

مگر جب صادق کے قرض خواہوں نے شجاعت حسین کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو پھر غوثو میاں ہی کام آئے۔ وہ وہ ایک ہفتے ہی میں بمبئی کے ایک سیٹھ کو ڈھونڈ لائے۔ چمڑے کے بیوپار میں اسنے اپنی تینوں بیویوں کے لئے تین بلڈنگیں بنا دی تھیں۔ اور اب شجاعت حسین کو پچیس ہزار دینے کے بعد نوید کے لئے بھی ایک بلڈنگ بنانے کو تیار تھا۔

جانے یہ خبر نوید تک پہنچی یا نہیں! مگر جون کی ایک تپتی دوپہر کو دادی نے کروٹ بدلی تو چونک پڑیں۔ انکے سامنے کوئی کھڑا تھا۔ ایک لمبا چوڑا مرد یوں جھکا ہوا تھا جیسے اپنی شکست تسلیم کر چکا ہو۔ جیسے وہ خود یہاں نہیں آیا بلکہ تیز و تند ہوائیں کسی تنکے کے بکھرے ہوئے ٹمبر کی طرح اسے یہاں پھینک گئی ہیں۔

دادی چونک پڑیں — ساٹھ برس کے بعد ان کے بدن میں پھر وہی اذیت ناک اور لذت بخش جھرجھری دوڑ گئی جو صرف کنواری لڑکیوں کا حصہ ہے۔ ان کی صحت مند روشن آنکھوں نے پہلے لمحے میں پہچان لیا کہ وہ ریڈی ہے۔ مگر ان کے دل نے نہیں مانا۔ ریڈی کی اتنی

مجال کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ یوں ان کے کمرے میں چلا آئے۔ یوں شکستہ دل اور اداس صورت لئے کھڑا ہو جیسے آج پچاس برس ہو وہ ان کے چہرے پر چمکتی ہوئی جوت دیکھنے آیا ہے۔

"آپ نے ایک کہانی سنائی تھی کہ نغمہ جاوداں ہے۔ اپنا سفر نہیں روک سکتا۔ مگر کوئی اس ابھرتے ہوئے نغمے کو شوٹ کردے تو ـــ تو ـــ

"تو وہ پری مر جائے گی جس کی جان اس نغمے کے سروں میں چھپی ہوئی تھی۔" دادی نے بڑے رسان سے کہا۔

"پھر اس لاش کو دفنایا نہیں جائے گا۔ حنوط کی ہوئی ممی کی طرح لوگ اسے تعجب سے دیکھا کریں گے۔"

"بس ـــ!" ریڈی نے بڑی دیر تک دادی کا انتظار کر کے کہا۔ "کیا اسکے آگے آپ کی کہانی ختم ہو جاتی ہے! میں تو چاہتا تھا کہ آپ سے پھر وہی کہانی سنوں۔ وہی نغمے کے سفر کی داستان۔ آپ یقین رکھئے میں نوید کی قیمت جیب میں ڈال کر آیا ہوں۔"

دادی کی پلکوں پر جانے کا ہے کا بوجھ آپڑا کہ وہ نظریں نہ اٹھا سکیں۔ انہیں ایسا لگا کہ ایکبار پھر تاب اپنے سوال کا جواب لینے آیا ہے اور وہ چوبیس برس کی نوید بنی تھر تھر کانپ رہی ہیں۔

پھر انہوں نے منہ پھیرے بغیر ہاتھ کے اشارے سے کہا "جاؤ ـــ اس وقت چلے جاؤ۔ مجھے سوچنے دو کہ آج کون تاریخ ہے ـــ آخر تم کب تک میرے سر پہ سوار رہو گے ـــ!"

"آج تاب پھر آیا تھا۔" شام کو نوید الماری میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی تو دادی نے کہا۔

"تاب ـــ!" نوید کے ہاتھ سے دوربین چھوٹ گئی۔

"ہاں!" دادی نے بات جاری رکھی ـــ "وہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ کسی عورت کے پیروں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی مرضی سے اٹھ سکیں۔"

"ہاں، اٹھارویں صدی میں تو یہی ہوا کرتا تھا۔" نوید نے دوربین اٹھاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

"اور بیسویں صدی میں ـــ!" دادی نے گردن اٹھا کر پوچھا۔

"بیسویں صدی میں ـــ" نوید نے دوربین آنکھوں سے لگا کر کھڑکی کے باہر دیکھا، پھر اطمینان سے بولی۔
"اللہ آسمان کتنا وسیع ہے۔ ذرا دیکھیے تو دادی اس کی کوئی اُور چھور نظر ہی نہیں آتی۔"
دادی نے بڑے غور سے نوید کو دیکھا اور مان گئیں کہ بیسویں صدی ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔
سب حیران تھے کہ ممّی کے سیٹھ والی خبر نے نوید پر کوئی اثر ہی نہیں کیا۔ اور تو اور ہر وقت کھوئی رہنے والی بیّا بھی اب چونک پڑی۔
"اچھا تم آج ہی ریڈی کے ساتھ کہیں چلی جاؤ۔ میں ریڈی بھیّا کو فون کر رہی ہوں کہ ابّا کو لے کر کہیں چلے جاؤ۔"
"کہاں ـــ؟" نوید نے حیرانی سے پوچھا
"کہیں بھی ـــ" بیّا بولی ـــ "تم گھبرائی کیوں ہو ریڈی تو تمہاری قیمت بھی پپا کو دے رہا ہے۔"
"کیا ـــ؟ کیا ریڈی بھی پچیس ہزار جیب میں ڈال کر اس بازار میں آیا ہے ـــ؟"
وہ دُوربین اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑی جس میں آسمان کی وسعتیں سمٹی ہوئی تھیں اس کے پیر بے سہارا سے ہو گئے اور وہ فرش پر گر کے زار زار رونے لگی۔ اس کا بھیگا ہوا چہرہ مٹی میں اٹ گیا۔ پھر بڑے دکھ سے اسنے منہ اوپر اٹھایا۔
میں پپا کو پچیس ہزار نہیں دلوا سکوں گی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا سسکیاں بھرنے لگی۔
دادی اور بیّا نے بڑی حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ یہ سر پھری لڑکی آخر کیا چاہتی ہے!
"تم بیاہ نہیں کرو گی تو کیا میری طرح تم بھی اس ڈیوڑھی میں اپنی لاش سڑواؤ گی ـــ!"
دادی کو بڑا غصہ آ رہا تھا۔
"لاش کیوں سڑے گی ـــ!" نوید نے گردن اٹھا کر پوچھا۔
"جو عورتیں خودکشی کرتی ہیں انہیں کوئی نہیں دفناتا۔ مجھے دیکھو ابھی تک بے گور و کفن

پڑی ہوں۔"

نوید چپ ہو گئی۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میں تعفن نہیں پھیلاؤں گی۔ میں اپنی لاش اٹھا کر ڈیسیکشن ہال لئے جا رہی ہوں۔"

"کہاں ـــ!" دادی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"میں امریکہ جاؤں گی آپ کے فالج پر ریسرچ کرنے۔"

"اس سے کیا ہو گا ـــ" دادی نے مایوسی سے منہ پھیر لیا۔

"کچھ نہ ہو۔ لوگ مرنے کے لئے زہر پیتے ہیں میں جینے کے لئے زہر پیوں گی۔ ان عورتوں کا علاج کر دوں گی جن کا مرض کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"مگر ذرا ریڈی کے بارے میں تو سوچو ـــ" ہم نے بھی کچھ کہنا چاہا۔

"اسکی جیب میں پچیس ہزار ہیں۔ پھر کیا پرواہ ہے ـــ!" وہ اطمینان سے اٹھ کر الماری میں کوئی اور چیز ڈھونڈنے لگی۔

دادی کا منہ کھلا ہوا تھا۔ انہیں بالکل یاد نہ رہا کہ ان کے پیر مفلوج ہیں وہ آپ ہی آپ اٹھ کر نوید کے پاس گئیں اور اس کی ٹھوڑی اٹھا کر سوچنے لگیں کہ دراصل کھوٹ تو خود ان میں تھی۔ حضرت مولانا ٹھیک فرماتے تھے کہ عشقِ حقیقی تک پہنچنے میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب مغنی اپنا ساز چھوڑ دیتا ہے مگر نغمے کا سفر نہیں رکتا۔ جب وہ نوید کے پاس سے ہٹ کر اپنی مسہری پر آئیں تو اچانک انہیں محسوس ہوا کہ نوید کی زندگی سے ایک لمحہ انہیں مل گیا ہے ـــ وہ کیا کریں ـــ اس انمول موتی کو کس قیمت پر بیچیں ـــ؟

چندن کی چتا

جمیلہ ہاشمی

پچھلی راتوں کا چاند بادلوں کے جھروکوں سے جھانکتا ہوا بھاگتا جاتا ہے اور ہوا میں پانی کی بوندوں کی جھنکار سی ہے درختوں پر نکلی نئی کونپلوں کی باس پھولوں کی سوگندھ کے ساتھ ملی میرے آس پاس ڈول رہی ہے۔ دور باغ کے کسی کونے میں کوئل رہ رہ کر یوں بولتی ہے جیسے میرے من میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھتی ہیں۔ نیچی دیوار سے پرلی طرف میرے بھیا کے پوتوں میں سے کوئی جاگ اٹھا ہے اور بیتاری کے چلائے جاتا ہے۔ میں چونک کر اٹھتی ہوں یہ کہیں میری پدمنی تو نہیں مگر پدمنی کہاں۔ جب بھی گھر میں کوئی بچہ روتا ہے رات کو ڈر کر چیختا ہے ماں کو پکارتا ہے۔ مجھے پدمنی یاد آتی ہے پدمنی تو اب یوں لگتا ہے پچھلے جنم کی میری بیٹی تھی۔ اس جنم میں آنکھ کھول کر مجھے وہی یاد آتی ہے اور اسکے ساتھ سارے پرانے دکھ یوں جاگ اٹھتے ہیں جیسے برسات کے چھینٹوں سے سوکھی کھیتیاں ہری ہو جاتی ہیں۔ میں کانوں میں انگلیاں دیتی ہوں۔ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرتی ہوں۔ بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلتے چاند کو دیکھتی ہوں۔ اندھیرے میں بھگوان کا دھیان کرتی ہوں۔ مگر من بڑا ہٹیلا ہے بالک کی طرح اُسے جیسے جیسے روکو ویسے ویسے مچلتا ہے۔ بھلا اس سے کون پوچھے پرانے دنوں میں کیا رکھا ہے؟

میرے پاس سوئی مالتی نے بھی کروٹ بدلی ہے ابھی وہ کہے گی "ماں جی پوجا کا سمے تو ہو گیا ہے پھر میں یادوں کے بوجھ تلے دبی بھاری قدموں سے اٹھوں گی اور اشنان کروں گی باس سے مہکتے پھولوں کو تھال میں سجاؤں گی اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں کو چوموں گی جبکہ میرا من اس ساری پوجا میں نہیں ہو گا۔ میرے بھیگے بالوں سے گرتے قطرے میرے پیچھے دیئے کی روشنی میں ستاروں کی جوت کی طرح لگیں گے اور میں رام کے اس مندر میں یوں گر جاؤں گی جیسے کوئی مہاتما سمادھی لگائے زمانوں سے بیٹھا ہو۔ مالتی ست رام جپتی ہر ایک کو بتاتی ہے کہ میں پوجا میں رات دن کیسے

مگن رہتی ہوں دل کی باتیں دوسروں کو کہاں معلوم ہو پاتی ہیں۔

میں اوم کے اس مندر میں پیپل کی سوگند سے گھری بھین گالی ہر سے اُن پرانے دنوں میں جا بستی ہوں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے جب بیتا سمے کبھی لوٹ کر نہیں آسکتا تو بھلا من ایسی بیکار کی آشاؤں میں کیوں الجھا رہتا ہے، بھگوان جو شکتی دیتا ہے دکھوں کو سہنے کی طاقت دیتا ہے شانتی کیوں نہیں دے سکتا۔ کبھی کوئی مہاتما ادھر آ نکلتے ہیں تو پجاری جی ان سے میرا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ مجھے آشیرباد دیتے آئے ہوئے سادھو مہاتما لوگ سے میں آج تک یہ نہیں پوچھ پائی کہ تم لوگ جو مکتی کا پرچار کرتے ہو یہ بیکار کی باتیں رہنے کیوں نہیں دیتے مجھے مکتی کی آشا نہیں ہے۔ گیلی لکڑی کی طرح میں سدا سلگتی رہی ہوں اور انت تک میں یونہی سلگتی رہوں گی۔ میرا من پاتال کی طرح گہرا ہے اس کی اتھاہ نہ مجھے ملی ہے اور نہ تمہیں ملے گی۔ یہ بھلا کسی تہ سے بھر سکے گا۔ میں ناستک نہیں ہوں پر تمہارے بول مجھے تسلی نہیں دے سکتے۔ لوگ کہتے ہیں وقت بڑے بڑے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ پر میرے ننگے زخموں پر تو کوئی شے بھی مرہم نہ بن سکی۔

مالتی جانتی ہے میرے بنا کہے جانتی ہے کہ مجھے مکتی کی آشا نہیں پر زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ کبھی کبھی جب راتوں کو اندھیکار گہرا ہو جاتا ہے اور اسے بھی نیند نہیں آتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور آپ ہی آپ کہنے لگتی ہے "کیوں ماں جی پوجا سے بھگوان نہ ملے پرشانتی تو ملتی ہے" اور میں یہ بات سنکر چُپ رہتی ہوں۔ میں اسے کیا کہوں کہ کچھ بھی نہیں مل پاتا۔ کبھی بھی نہیں مل سکتا۔ آدمی کے حصے میں صرف سلگنا آیا ہے۔

دھرتی کی طرح میں نے پدمنی کو جنم دیا تھا اور بھگوان نے جب مجھ سے اسے بھی لے لیا۔ اسے زندگی ہی میں مجھ سے الگ کر دیا تو میں اور کس شے کی آشا کروں۔ پجاری جی کی باتیں سنکر اوم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

ندی کا دھارا اسی طرح رواں ہے' وہ پتھر بھی اسی طرح ہے صرف میں بدل گئی ہوں چیزوں کے مقابلے میں آدمی کی زندگی کتنی کم ہوتی ہے۔ پیپل کا درخت ویسے ہی ندی پر جھکا ہوا ہے جیسے ان گنت صدیوں پہلے جھکا ہوا تھا۔ بیتا وقت مجھے تو اتنا ہی لمبا لگتا ہے جیسے اس کے اور میرے درمیان صدیاں ہوں زمانے ہوں اور کتنے ہی جنم ہوں۔ یہ جنموں پہلے کی بات لگتی ہے جب شام کے سائے ندی کی لہروں میں رنگ بکھر بہہ رہے تھے میں کھیتوں سے آتے ہوئے راہ میں تھک کر پتھر پر ٹک کر بیٹھ گئی تھی اور تھکن کو

دھونے کے لئے پاؤں پانی میں ڈال لئے تھے۔ ساتھ کی سکھیاں آگے نکل گئیں اور مجھے آواز یں دیتے دیتے سرکنڈوں کے بنے ہوئے راہ سے دوسری طرف چھپ گئیں مجھے ان کی باتوں اور قہقہوں کی گونج دُور تک سنائی دیتی رہی پھر بسنتی نے زور سے کہا "ہم جا رہی ہیں تو اکیلی کہیں گم نہ ہو جائیو۔"

بسنتی کو کیا معلوم تھا گم ہونے کے لئے اکیلے ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

پھر پُل کے پار سے شام کے دھندلکے میں ایک سوار آیا اور اسنے مجھ سے پوچھا تھا کیا "شام نگر" کو راستہ یہیں سے مڑتا ہے؟ وہ پیپل کے پتوں کے بھیگے ہوئے گہرے سائے اور ندی کے رنگین پانی کے مقابلے میں مجھ سے بہت اونچا اور دور ایک دیو سا لگ رہا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اسکی پلکوں پر دھول کی سفیدی بڑی بھلی لگتی تھی وہ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا اور اس کی کیسری پگڑی سے اسکے کان ڈھنپے ہوئے تھے اسکے کانوں میں لٹکے بالے بات کرتے میں ہل رہے تھے۔

میں نے کہا تھا پل کے پار والے شام نگر ہی جاؤ گے یا اِدھر والے "شام نگر" میں اور ہاتھ اٹھا کر دُور اٹھتے نیلے دھوئیں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرے بھیگے ہاتھ سے بوندیں میری بانہہ پر پھیلتی جا رہی تھیں اور ایک عجیب بے چینی میری جان کے ساتھ لپٹتی جا رہی تھی۔

اسنے سر اٹھا کر پہلے پل کے اس پار والے شام نگر کو دیکھا تھا پھر میرے اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں دوسرے شام نگر کی طرف اس راہ پر جہاں میری سکھیاں ہنسی گاتی چلی گئی تھیں اور جہاں سے اٹھتے نیلے دھوئیں کی دھاریاں ہولے ہولے آکاش سے اترتے اندھیرے کی نیلاہٹ میں گم ہو رہی تھیں اسنے ایک لمحہ بھر پور نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اور پھر بنا کچھ کہے اپنا گھوڑا اسی راہ پر ڈال دیا تھا جو میرے گاؤں کو جاتی تھی۔

لوگ چارے کے گٹھے اٹھائے اپنے جانوروں کے ساتھ آ رہے تھے اور شام کے سناٹے میں جو درختوں کھیتوں اور دھرتی کے سینے سے اٹھتا ہے۔ گھنٹیوں کی ٹھنٹھناہٹیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ پچھم کی طرف سورج بادلوں کے پیچھے ہاتھ سے پھیلے گولے کی طرح نیچے ہی نیچے ڈھلکتا جاتا تھا اور دوسرے گاؤں کی طرف جاتی عورتیں تیز تیز قدم اٹھائے اپنے بوجھ سنبھالے بھاگتی جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے کھیتوں کی منڈیروں پر گرتے پڑتے بچے روتے جاتے تھے اور

مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اس ایک گھڑی ان سب سے الگ ہوں۔ مجھے کہیں نہیں جانا اور جب شام رات کے گلے ملے گی تو میں بھی اس سرخی کے ساتھ اوپر اٹھ کر گم ہو جاؤں گی۔ پرندوں کی پروں کی تیزی میں سما جاؤں گی۔ میرا خون رگوں میں گرم جلتا ہوا مجھے کسی اور کا بوجھ معلوم پڑتا تھا۔ سکھیاں اور اُن کے بیائے گیت مجھے بہت پرانی کہانی کی طرح لگے جس کا بس ایک آدھ بول ہی بھولا بسرا سا میرے ذہن میں باقی رہا ہو۔ جانے پہچانے راہوں کی دھول مجھے قدموں کے نیچے آج بڑی بیگانی لگ رہی تھی۔ مندر میں شام کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور گاؤں کے دوسرے کنارے میرا گھر مجھے میلوں دُور دکھائی دیتا تھا۔ گائیوں بھینسوں کو ہانکتے ہوئے لڑکے گاتے آتے تھے مجھے وہ آوازیں بھی عجیب لگیں جیسے جاگ کر پہلی بار انہیں سُنا ہو۔ میرے سارے جسم میں ایک کپکپی تھی شاید دیر تک پاؤں ندی میں لٹکائے رہنے کی وجہ سے سردی کی لہریں میری رگوں میں چلنے لگی تھیں۔ شاید میرا من تب پہلی بار جاگا تھا۔ ایسا ہی ہوگا ورنہ جس گاؤں کی دھرتی نے مجھے جنم دیا جو مجھ میں رچی ہوئی تھی وہ بھلا بیگانی کیوں لگتی۔

ماں نے دیکھا تو پھٹکارنے کے لئے کہنے لگی "کیا ابھی تیرے کھیلنے کے دن باقی ہیں جو تو کھیت سے گھر تک آتے آتے جنم لگا دیتی ہے۔ اور گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔"

میں نے ایسی آواز میں جو مجھے کسی اور کی لگی تھی کہا تھا "کیوں ماں آنند پور سے کوئی آیا ہے۔"

ماں نے کہا تھا "یہ سب باتیں پوچھ لینا کام تو پہلے نمٹا لے۔" پھر میرا چھوٹا بھائی رونے لگا اور ماں نے بہت غصے سے میری طرف دیکھ کر کہا "اب کھڑی کھڑی کیا سپنے دیکھ رہی ہے کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ ذرا بھیا کو بہلا لے اتنے میں روٹی ڈال لوں۔"

بھیا کو اٹھا کر میں باہر جانے کے لئے مڑی ہوں تو ماں نے پھر کہا "اری چمپا کیا تیری مت ماری گئی ہے۔ ایسے سمے بھلا کوئی جوان لڑکی باہر نکلتی ہے جا کوٹھڑی میں جا مر۔ گھر کا کام میں خود دیکھ لوں گی۔"

آج جانے کیا بات تھی میں بدل گئی تھی کہ ماں کو غصہ زیادہ تھا۔ بھیا کو لے کر آنگن میں ٹہلتے ہوئے میں نے اپنی رگوں میں آگ سی بہتی پائی جیسے میں راون کا بُت ہوں جسے میلے کے

ن جلایا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا مگر وہاں کوئی چنگاری نہ تھی۔ یہ
آگ کیسی تھی؟

پچھم کی طرف بادلوں میں لگی آگ ہوتے ہوتے ہوا میں گھل گئی اندھیرا آکاش سے نیچے
تر آیا اور کھیلنے والے لڑکوں کی طرح ایک ایک کر کے تارے اپنے گھروں سے نکل کر مانو میدان
یں اکٹھے ہونے لگے۔ میرے کندھے سے لگا لگا بھیا جانے کب کا سو چکا تھا۔

ماں کے پکارنے پر میں نے جب اوپر دیکھا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے نیند میں کسی کو دیکھ
رہی ہوں۔ بھیا کو لٹا کر میں چورسی بیچ آنگن کے کھڑی ہو گئی۔ آج میرے ہاتھ پاؤں میرے
بس میں نہ تھے خیالوں کا دھارا جانے مجھے کہاں بہائے لئے جاتا تھا جیسے میں بھی ایک تنکا ہوں
جو ندی کی لہروں میں آگے ہی آگے پانی کے ساتھ چلا جاتا ہے اور پھر پیپل کی چھاؤں اور ندی
کے رنگین دھارے کے بیچ کھڑا وہ سوار جانے کیوں گھڑی گھڑی میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا
آخر وہ میرا کون تھا؟

پھر شام اور گہری ہو گئی بھیا سو گیا بابا مہمان کے لئے کھانا حویلی ہی میں لے گیا میں اور
ماں گلی کی عورتوں کے ساتھ گاؤں کے باہر چلے۔ میری سہیلیاں ایک دوسرے سے پوچھ
رہی تھیں آج چمپا کے ہاں کون آیا ہے کہ اس کی ماں نے حلوہ پکایا ہے اور دال میں گھی
بھی چھوڑا ہے۔

میں نے کہا آنند پور سے کوئی آیا ہوگا۔ ماں سدا اپنے پیاروں اور مائکے والوں
کے لئے ہی اچھی اچھی چیزیں پکایا کرتی ہے۔ سب میرے سر ہو گئیں "واہ واہ ہمیں جیسے آنند پور
سے آنے والوں کا پتہ نہیں چلتا۔ اری ہوش سے بول کیا آنند پور سے آنے والے حویلی میں
بیٹھے رہتے ہیں۔ اور یہ تیرا آج کیا حال ہے کہ ایک پاؤں یہاں پڑتا ہے اور دوسرا وہاں کیا
تو نے نشہ پی رکھا ہے تجھے معلوم نہیں آج تیرے گھر کیا پکا تھا۔ تیری ماں نے نیا بچھونا نکال
کر دیا ہے۔ اب بتا کھلا وہ کون ہو سکتا ہے پھر وہ سب ناچتی ہوئی میرے گرد گھومتی رہیں اور
مجھے مانو پاگل بنا دیا۔

گاؤں میں اور لڑکیوں کی طرح مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ نئے گہنے ملیں گے آنکھوں

میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں گی اور میرے لہنگے کی گوٹ بھی ریشم کی ہو گی۔ میرے سپنے اس سے آگے کبھی نہیں گئے۔ نیم تلے جب عورتیں مل کر سوت کاتتیں اور لڑکیاں مل کر گیت گاتیں تو میرا انگ انگ ایک عجیب خوشی سے جھوم اٹھتا۔ ان دنوں میری سہیلیاں کہتیں۔

"اری چمپا تجھے کیا ہو گیا ہے تیری آنکھوں میں جوت سی کیا جلنے لگی ہے جیسے ان میں تارے بھر گئے ہوں اور یہ اتنی پھیل کیوں گئی ہیں۔ جیسے سارے جگ کو ڈھانپ لیں گی" ماں بھی مجھ سے بہت پیار سے بولتی کبھی غصہ نہ ہوتی بڑی بوڑھیاں مل کر بیٹھتیں تو کہتیں چڑیوں کی طرح بیٹیوں کے دن بھی بابل کے آنگن میں کم ہوتے ہیں اور بیت جاتے ہیں اور پھر اپنے بیاہ کے اور مائکے کے نقشے بیٹھتیں سالوں پیچھے پرانے دنوں میں پلٹ جاتیں اور یوں ہنستے ہنستے میرے وداع کے دن آ گئے۔

۲

برات آئی ہے تو دھوم مچ گئی اونٹوں کی قطاریں نہر کے پل سے لے کر ہماری حویلی تک تھیں۔ باجوں کے شور اور آدمیوں کی بھیڑ میں لگتا تھا یہ گاؤں اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں ہمارے آنگن میں جمع تھیں اور ڈھولک کی دھپ دھپ راگوں کی ندی پر بہتی تھی۔ گھنگرو باندھے ناچنے والیوں کے پاؤں میں بجلیاں تھیں سنگار کرواتے ہوئے نائن مجھ سے کہتی جاتی تھی" بیٹیا تیرے دھن بھاگ ہیں جو تو ایسے بڑے گھر میں جا رہی ہے ایسا گھر جہاں دودھ دہی کی نہریں بہتی ہیں۔ جہاں کی لونڈیاں باندیاں بھی ریشم پہنتی ہیں۔ ارے تیرے جیسے بھاگ تو گاؤں میں کسی کے بھی نہیں ہیں تو ایسی بھاگ وتی ہے وہاں جا کر ہمیں نہ بھول جانا۔ اور جانے کیا کچھ کہتی نائن میرے بالوں میں موتی پرو رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ ریشم کے ڈھیروں میں میں دب کر کھو جاؤں گی میرا سانس گھٹ جائے گا دودھ دہی کی نہروں میں یوں بہہ جاؤں گی کہ مجھے کنارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔ اور پھر ساری رونق اور شور کے اوپر مجھے وہ آنکھیں یاد آئیں جنہوں نے مجھے یوں دیکھا تھا کہ میرا دل ڈول گیا تھا اور میرے گیلے ہاتھ سے جو شام نگر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اٹھا تھا پانی کی بوندیں میری بانہہ پر ایسے بہہ رہی تھیں کہ میری جان

کو ایک عجیب بے چینی سی لپٹتی جا رہی تھی۔ نا تن کا گرایا ہوا سنگار چھین بن رہا تھا اور کاجل میری آنکھوں میں ریت کے ذروں کی طرح لگتا تھا۔ میرا من جانے کیوں اس ساری خوشی سے الگ اکیلا تھا اور بہت اُداس تھا۔ میں بے حد گم سم بیٹھی تھی اور میری سکھیاں مجھے چھیڑ رہی تھیں۔ جانے کیوں، ویسے ہی بیکار کی ایک آس کی طرح میرا جی چاہ رہا تھا کوئی محبت سے اس سجیلے کا ذکر کرے اور کہے کہ تیرا دولہا ایسا ہے۔

ماں کو میں نے دو ایک بار اپنے پاس سے گذر کر اندر کوٹھری میں جاتے دیکھا تھا میلے کپڑوں میں بھی اس کا چہرہ جگ مگ کر رہا تھا اور جب کسی سے بات کرتی تو لگتا تھا ابھی اس کے گلے لگ کر مارے خوشی کے ناچنے لگے گی۔ اندر باہر عورتیں اور آنندپور سے آئی ہوئی برادری کی لڑکیاں پاؤں میں جھانجھنیں چھنکاتی یوں ہی بھاگ دوڑ رہی تھیں جیسے سب سے زیادہ کام تو بس انہیں کے ذمہ ہو۔ بھیگی ہوئی سہانی رُت تھی اور سردی میرے جسم پر یوں لگتی تھی جیسے کوئی انجانا ہاتھ مجھے تسلی دے رہا ہو اور ہوا جب کھلے دروازے سے آتی تو جان پڑتا جیسے گھبراہٹ میں مجھے تسلی دے رہی ہو۔ میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی اور عجیب سپنا میرے سامنے تصویروں کی طرح گھوم رہا تھا جس میں میری سہیلیوں کی جھانجھنوں کی جھنکار بھی تھی۔ ڈھولک کے ساتھ گائے ہوئے گیت بھی تھے۔ برات کے ساتھ آئے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بھی تھی۔ جیسے راس لیلا رچانے والوں کی ٹولی میں گوپیاں کنہیا ہوں۔ اور میں رادھا تھی اور یہ سارے شور کا دھارا میرے سامنے بہہ رہا تھا اور میں اس سے الگ تھی۔ ہم دونوں تھے بھی اور کوئی دوسرا تھا محبت سے اونچا میری پہنچ سے دُور مگر میرے بالکل قریب جیسے میری جان کا ایک حصہ ہو۔ جیسے میرے انگوں کی ساری دُکھن نکل کر اسکے قدموں میں لوٹ رہی ہو میری جان اسکے پاؤں میں ہو۔ میں ایک ریشم کا کپڑا ہوں جس پر اگر وہ چاہے تو اپنا پاؤں دھر دے۔ میں ایک کنول کا سفید پھول ہوں اگر چاہے تو اپنے سانس سے اس میں خوشبو بھر دے۔ میرے قریب کھڑے ہوئے اسنے میرے کندھے پر ہاتھ دھرا ہے تو سُن سُن کر کے میری جان یوں نکل گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ میں نہ رادھا ہوں۔ اور نہ کوئی اور دھرتی کا ایک ذرہ ہوں جو اگر اسکے پاؤں تلے آجائے تو اس کی مان اور شان بڑھ جائے آنگن

میں جانے کیسا شور ہونے لگا تھا یا میرا سپنا ہی ایسا تھا کہ مجھے لگا کسی نے میرے پاس کھڑے ہوئے جوان کے سر پر زور سے کوئی شے ماری ہے۔ چمک سے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور میں چیخ مار کر گر پڑی۔

میری سہیلیاں میرے گرد اکٹھی تھیں اور کہہ رہی تھیں "چمپا اری چمپا ہوش میں آ پھیرے ہونے والے ہیں۔ اور تو یوں چیخ رہی ہے یہ کیا بدشگونی ہے۔ اگر بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہے تو دو گھڑی کو کمر سیدھی کر لے۔"

میری آنکھوں سے آنسو ساون کی جل دھارا کی طرح بہہ رہے تھے اور میرے پرانوں میں جان نہیں تھی۔ سارا کیا ہوا سنگار خراب ہو گیا۔ اور نائن ہاتھ ملتی ہوئی پھر سے پٹاری کھول کر بیٹھی۔ مگر میرا اپنا آپ میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چاہتی تھی کہ سنبھل کر بیٹھوں پر سنبھل نہ پاتی تھی۔ پھر آنکھوں میں آنسو بھرے ماں آئی اور کہنے لگی "چمپا مجھے کیا ہے بیٹی کیا تجھے بیاہ کی خوشی نہیں ہے میں تو بہت خوش ہوں کہ تیرے بھاگ پرماتما نے اچھے بنائے ہیں اور تو ہے کہ روئے جاتی ہے۔ لڑکیاں تو اس دن کے انتظار میں رہتی ہیں اور اب جب کہ میرے دوار پر یہ دن کھڑا ہے تو گھبرا رہی ہے۔ اری پگلی تو سسرال کے لئے تھوڑا جا رہی ہے بس دو چار دن میں لوٹ آئے گی اور پھر تیرے جیسا دولہا تو بھگوان ہر کسی کو دے۔ نراش کیوں ہوتی ہے دیکھ تو سہی سارے گاؤں سے اچھا تو تیرا گھر ہو گا۔"

باہر سے کسی نے پکارا ہے تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اتنے میں شور مچ گیا کہ سسرال والے آ گئے ہیں۔ لڑکی باہر آئے تو پھیرے ہوں۔ میرے ننھیال کی عورتیں اور برادری کی لڑکیاں مجھے پکڑ کر باہر لائیں۔ میں کانپ رہی تھی۔ جیسے سردی بہت زیادہ ہو۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ مندر میں سویرے کی پوجا کے گھنٹے بج رہے تھے اور رات کی جاگی ہوئی عورتیں ڈھولک بہت تیزی سے بجا رہی تھیں۔

سرکنڈوں سے بنے چھپر میں رنگین تاگوں سے بنے لٹو چاروں طرف سے میرے سر پہ سایہ کئے تھے۔ اور گھی کے دیوں کی روشنی میں ہون کنڈ کی آگ بڑی پوتر لگ رہی تھی۔ لپکتی ہوئی جیسے باقی ہر شے کو اپنے میں کھینچ لے گی۔ پھولوں کے سہروں میں سے جھانک کر میں نے دیکھا تھا اس کا

چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ آنسو روکے جانے کیسے بیٹھی تھی بھیا اس کی گود میں لدا بیٹھا تھا اور لوگوں کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میلے میں آئے ہوؤں کو دیکھ رہا ہو اس کی روروکر تھکی ہوئی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں پھر وہ انہیں کھولے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دور پہ میرے آنند پور والے ماما اور دلی دیس سے آئے ہوئے چاچا سر جھکائے بیٹھے تھے۔ پھر پھولوں کی لڑیاں کسی عورت نے برابر کر دیں تو سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

پھیرے کرتے ہوئے میں نے سوچا تھا جانے یہ کون ہے جو مجھے کسی دوسرے گاؤں سے وداع کرانے آیا ہے میرے دل میں کھلبلی سی مچی تھی اور میں چاہتی تھی کم از کم گھونگھٹ اور پھولوں کا یہ بوجھ ہٹا کر ایک بار اس چہرے کو تو دیکھ لوں۔ اور آج مجھے معلوم ہے چہروں میں تو کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ کتنے بھولے دکھائی دیتے ہیں ؟

پنڈت جی اشلوک پڑھ کر آگ پر جانے کیا کچھ ڈال رہے تھے کہ باس سے میں بے سدھ ہوئی جاتی تھی۔ آج کتنے زمانوں کے بعد بھی وہ باس مجھے انوکھی اور الگ سی میرے ذہن کے ایک کونے سے جہاں بھولی بسری یادوں کے ساتھ پڑی ہے آیا کرتی ہے۔ ساگری کی سوگند۔ چلتے میں میرے لہنگے کی گوٹ میرے آگے آگے بجلی کی طرح کوند رہی تھی اور پیچھے سے کھلی چولی میں اتنے کپڑوں میں لپٹی ہونے کے باوجود مجھے لگتا تھا میں ننگی ہو جاؤں گی۔

بیٹھی ہوں تو یوں تھکی ہوئی تھی جیسے جنموں کا سفر کر کے آئی ہوں اور لگتا تھا گر جاؤں گی یہ سارے لوگ جو میرے آس پاس بیٹھے تھے جانے کون تھے اور وہ جو میرے قریب بیٹھا تھا وہ جانے کون تھا۔ میرے ساتھ کیا بیتنے والا تھا۔ پھر ہون کنڈ کو ہٹا کر مجھے اور اسے جواب میرا بھگوان تھا آمنے سامنے بٹھا دیا گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے میرا ہاتھ کبھی اٹھایا جاتا تھا اور کبھی رکھ دیا جاتا۔ میری آنکھیں تھکن کے مارے بند ہوئی جاتی تھیں جب نائن نے کہا تھا کر بی بی آنکھیں کھول کر اپنے دولہا کو تو دیکھ۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے کو دیکھنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں کھل نہ سکیں۔ ساری رسمیں ہو چکی تھیں۔ سورج نکلنے والا تھا۔ جب سرکنڈوں کی اس کوٹھری میں سے سب کو نکال کر میری سکھیوں نے مجھے اسکے ساتھ بند کر دیا تھا جو میرا پتی تھا۔

گھی کے دیئے کی لَو مجھے بجھی ہوئی لگی اور پھولوں کی باس گھٹن سے بیہوش ہوتی جان پڑی۔ جب کسی نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا ہے۔ بھگوان جانتا تھا میں کچھ دیکھنا نہ چاہتی تھی مجھے صرف سننے کا انتظار تھا۔ بیگانے ہاتھوں کا جو میری طرف بڑھیں گے اور لاج کے مارے میں دوہری ہو جاؤں گی۔ اور اس انتظار میں جیسے زمانے بیت گئے۔ دیئے کی لو بھڑکی اور بجھ گئی اور اندھیرے میں پلنگ کی دوسری طرف بیٹھنے کی آواز آئی۔ ہولے ہولے میرے انگ ڈھیلے پڑ گئے شاید میں انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔

آج تک یہی انتظار ہے جو میرے گرد باقی ہے۔ اور جو کچھ باقی دنوں میری زندگی میں ہوا ہے اس نے بھی اس انتظار کرنے کے جادو کو نہیں توڑا۔ میں نے دوار دوار بھیک مانگی ہے۔ پر بھکشا کے نام پر کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ جانے کتنی آنکھوں میں میں نے جھانکا ہے۔ جانے کتنے ہاتھوں کو میں نے چھوا ہے۔ پر میرے شریر میں وہ اینٹھن ویسی ہی ہے۔ وہ تناؤ جو اس صبح کو دیئے کے بجھنے کے بعد سے اب تک میری رگوں میں خون کے ساتھ موجود ہے بھگوان کیا یہی بیاہ تھا؟

ڈولی اٹھی ہے تو میں ڈھنگ سے بیٹھ نہ سکتی تھی۔ نہر کے پل سے لے کر دریا کے گھاٹ تک اونٹوں کی قطاریں تھیں جن کی گھنٹیوں سے لگتا تھا سارا جہان مجھے وداع کرانے آیا ہے۔ ماں کے رونے کی آواز سب سے الگ اونچی تھی۔ نائن میرے کپڑوں کو ٹھیک کرتی ڈولی میں بیٹھی ہچکولے کھاتی میرے ساتھ آن لگی تھی۔ بابا اور بھیا اور وہ سارے جن کے درمیان میں نے آج تک کا وقت گزارا تھا کہاں تھے۔ وہ بیگانہ آدمی جو آج صبح میرے رنگین پلنگ کی پائنتی بیٹھا رہا تھا کیسا ہوگا۔ دریا کے گھاٹ تک گاؤں کی عورتیں جو گیت گاتی آئیں تھیں وہ میری سمجھ میں نہیں آپاتے تھے جیسے کسی اور ہی بول میں ہوں۔ مجھے لگتا تھا میری ارتھی اٹھ رہی ہے۔ میں نے برے خیالوں کو سر جھٹک کر دور کرنا چاہا۔ اور نائن سے کہا کہ میرا دم گھٹتا ہے ذرا سا پردہ تو سرکا دے۔

دریا میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ کشتی کو رنگوں تاگوں اور ریشمی پھندنوں سے سجایا گیا تھا جب چپو چلتے تو گھنگروں کی جھنکار بڑی مدھر لگتی۔ مجھے پھر لگا میں رادھا ہوں جو پرائے دیس میں اپنے

کرشن کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں پر یہ جو میرے پاس بیٹھا تھا کون تھا۔ گم سم اور خاموش جیسے اس پر کوئی جادو کر دیا گیا ہو۔ ندیا پر کی ٹھنڈی ہوا آ کر میرے چہرے پر لٹکے سہرے کو ہلا رہی تھی اور بیٹی بھولدار کی طرح میرے جسم پر پھیلتی تھی پر میری رگیں جیسے سخت پڑ گئی ہوں پتھر کی طرح اس ٹھنڈ کو قبول کرنے سے انکار کر رہی تھیں۔ جیسے میں مورتی بن گئی ہوں جس پر پانی کی پھوار صرف اوپر کی سطح کو ہی بھگو سکتی ہے۔ آج تک کسی ٹھنڈ نے میرے انتر کو ٹھنڈا نہیں کیا۔ میں تو اپنا نرک اپنے ساتھ لئے پھرتی ہوں میرا نرک جس میں ہر کام کا آخر تھکن اور نیمتقن ہوا ہے۔ مجھے آج تک کسی نے سکون کی اس میٹھی نیند نہیں سلایا جو اس سرکنڈوں کی کوٹھری میں رنگین پایوں والے پلنگ پر سونے سے پہلے میری تھی۔

پھر میرا گاؤں پیچھے چھوٹ گیا اور ناؤ آگے بڑھ آئی۔ دریا کا دھارا وقت کی طرح جہاں جی چاہے بہا کرلے جاتا ہے ملاح زور لگا رہے تھے اور گیت گا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں پانی تھا اور دل چاہتا تھا یہ لہریں مجھے اپنے میں چھپا لیں دوسرے کنارے پر آموں کے بور کی خوشبو نے میرا سواگت کیا اور سایوں والے ٹھنڈے راہ پر میں اس گاؤں کی طرف چلی جو اب میرا دیس بننے والا تھا جس کی مٹی میں میرے جسم کو ملنا تھا جو پرماتما نے میرے لئے بنائی تھی۔

ڈولی کے آگے آگے چلنے والا سوار بانکا چھبیلا تھا پہاڑ کی طرح ڈٹ کر بیٹھا ہوا۔ لوگوں سے ہنس ہنس کر بولتا جاتا تھا۔ نائن نے پردہ سرکا کر کہا بی بی باہر تو جھانک دیکھ تو سہی کتنا سندر نگر ہے۔ درختوں کی اوٹ سے پرے کھیتوں پر سے ہوا اناج کی خوشبو لا رہی تھی۔ پرنتو بار بار میرے ہونٹوں پر آکر لگتی تھی۔ اور سانس لینے میں ناک دکھ رہی تھی اس لئے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ میں تو آپ مہکاری ہوئی تھی۔

۳

میں نے جب آئینے میں جھانکا ہے تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تو یہ میں تھی میں جو چمپا تھی اور جو پرسوں تک کھیتوں میں گھومتی ندی میں تیرتی اور آنگن میں اتنے اونچے پینگ چڑھاتی تھی کہ میری سکھیاں بس بس کہنے لگتیں۔ یہ میں تھی چمپا جس کو ماں نے کبھی اچھا کپڑا

پہننے کو نہیں دیا۔ تہوار کو بھی جسے کبھی ریشم دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ شام نگر کی وہ لڑکی اب گزوں ریشم میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور بالوں میں پروئے موتی چہرے کے مقابلے میں ماند تھے۔ آنکھوں میں آکاش کے سارے ستاروں کی جوت تھی اور کاجل کی لکیریں دھڑکتی ہوئی رگوں کی طرح آنکھوں میں پکڑ دھکڑ کر رہی تھیں۔ پاؤں ہلاتی تو بچھوے بج اٹھتے اور ہاتھ ہلاتے تو گھنگروؤں والے کنگن ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ ماتھے پر لٹکے ٹیکے میں جڑے ہیروں سے روشنی نکلتی تھی اور جو عورت گھونگھٹ الٹ کر دیکھتی حیران ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔ ہولے ہولے دن کھسکتا رہا اور شام کی طرف جاتا رہا۔ اور پھر نرم سی ہوا چلنے لگی۔

اس رات جانے کتنے پرانے اور پہلے خواب میرے من کی دیواروں سے آ آ کر ٹکرائے ہیں اور میں نے کیا کیا سوچا۔ پھر تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا چاند نکلا۔ رنگین پایوں والے پلنگ کے چاروں طرف پھولوں کی چادروں کی مہکار تھی اور گھی کے دیئے جل رہے تھے باریک بادلے کے دوپٹے میں سے میرا شنگار جانے کیسا لگ رہا ہوگا۔ میں اپنے ہاتھوں کو دیکھتی تھی اپنے پاؤں کو دیکھتی تھی کیا یہ میں ہی تھی کہ گھاٹ سے یہاں تک آنے میں کتنے ہی جنم پار کر گئی تھی۔ یہ جادو کا کیسا دیس تھا۔ اپنے جسم کی پاگل کرنے والی باس سے میں آپ ہی بیہوش ہوئی جاتی تھی۔ بھگوان۔

پھر اس آنگن کی طرف آنے والے راہ پر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور میری رگیں اسی طرح پتھر ہو گئیں۔

۴

میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ تو یہ ہے کہ جس کو مجھے بھگوان بنا کر پوجنا تھا اس نے مجھے دیوی سمجھ کر پوجا۔ میں چاہتی تھی بچپن سے سوچتی آئی تھی جانے کون میرا دولہا ہوگا۔ میں کیسے کیسے اس کی سیوا کروں گی۔ پر میرے من کی پوجا میرے من میں رہی۔ میرے دل کے بند کبھی کھل نہ سکے۔ میں اس بیدی سے نیچے اتر نہ سکی جس پر میرے اپنے بھگوان نے مجھے بٹھا دیا تھا۔ اس رات بھی میرا گھونگھٹ اٹھا ہے تو میں منتظر رہی ہوں مگر اس نے کہا "چمپا تم تو دیوی ہو دیوی ہو

سے بھی زیادہ سندر اور سندرتا میں شکتی ہے پھر اسنے جھک کر میرے پاؤں چھو لئے اور انہیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کی اس بھول نے میری ساری زندگی کو برباد کر دیا ہے بعد میں جو کچھ بھی ہوا ہے میں نے اس اپمان سے اترنے کے لئے جو جتن کئے ہیں سب بیکار گئے ہیں صرف اس ایک لمحے کی غلطی نے میرے سر کو گناہوں سے جھکا دیا ہے۔ پر پھر بھی مجھے جو چاہئے تھا وہ میں نہ پا سکی۔ تم مندر میں جاؤ اور تم دیوتا کے سامنے ماتھا ٹیکو اور تم یہ دیکھو کہ تم آپ درانی ہو اور آپ ہی دیوتا تو تمہارا من کیا کہے گا۔ میں نے اپنا کیسا کیسا سر مارا۔ ہر کہ اور کسی کو نہیں تو کم از کم مالتی کو ہی سمجھا سکوں کہ قصور میرا نہیں ہے پر مالتی ملنے تو:

میں نے کتنی بار کہا ہے مالتی میں تو پجارن تھی۔

اور مالتی کہتی ہے ماں جی تم سے بڑھ کر بھاگوان کون ہوگا جسے ایسا پتی ملا ہے جو پوجتا ہو جو دیوی سمجھتا ہو۔ ارے ماں جی ہر کسی کے ایسے بھاگ کہاں؟

میں مالتی کو کیسے بتاؤں کہ میں نے کیا چاہا تھا۔ اور مجھے کیا ملا۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی غصہ ور ہو کہ میں اسکے خوف سے کانپتی پھروں۔ میں نے چاہا تھا میرا پتی مجھے عورت سمجھے اور عورت کی کمزوریاں تو بہت ہوتی ہیں۔ جنہیں پجاری معاف نہیں کرتا پر پتی بھول سکتا ہے۔ ہمارا گھر سورگ نہ بن سکا۔ وہ مندر کا بڑا پجاری تھا اور اس نے آپ دیوی بنا کر میری پوجا شروع کر دی۔ اسکی عاجزی دیکھ کر میرا جی چاہتا اسکے سر پر زور سے ٹھوکر ماروں۔ جب وہ میرے پاؤں اپنی آنکھوں سے ملتا تو میں یوں پتھر کی طرح پڑی رہتی جیسے سچ مچ میں دیوی ہوں۔ اوہ بھگوان کیسی کیسی یادیں آج پرے باندھے چلی آتی ہیں۔

جب میں اسکے لئے آپ کھانا بناتی تو وہ کہتا چھپا نہیں یہ تمہارا کام نہیں ہے تم میری دیوی ہو کر یہ سب کچھ کر کے مجھے اپرادھی بنا رہی ہو۔ تم تو صرف اس لئے بنائی گئی ہو کہ تمہاری پوجا کی جائے۔ میرے چاروں طرف ریشم کے ڈھیر ہوتے۔ سونے اور موتیوں کے گہنوں سے میرے صندوق بھرے تھے باندیوں کی کمی نہ تھی۔ پر ہر رات سپنے میں میں اپنے مائکے گھر جاتی جہاں کی راہوں کی دھول بھی اب مجھ تک نہ پہنچ سکتی تھی اور پھر کسی نہ کسی طرح ندی کنارے پیپل کے سائے میں دھڑکتے دل کے ساتھ میں اس سوار کا انتظار کرتی۔ کیا وہ کھوجتا کھوجتا

مجھ تک آنکلے گا۔

میری آنکھوں میں جلی جوت ماند پڑ گئی۔ اور دکھ پھیکے دن ایک کے بعد ایک یوں گزرنے لگے جیسے گھسٹ رہے ہوں۔ میرے گالوں کی لالی اور میرے ہاتھوں کا لوچ جیسے گذرے دنوں کی بات ہو۔ میں سنگھار کرتی تو بھی نہ کروں تو بھی اسنے مجھے جس آسن پر بٹھایا تھا اس سے اتارنا اسکے بس کی بات نہ تھی۔ میری رگیں جسم میں یوں جمنے لگیں جیسے میں برف کے پہاڑوں میں دب گئی ہوں جب پدمنی پیدا ہوئی ہے تو چند دنوں میرا دل اس سے بہل گیا ہے پر پھر وہی سستی اور وہی بیزاری میرے گرد آ گئی اور پدمنی بھی اس ٹھنڈ کو جو میری رگوں میں تھی گرم نہ کر سکی۔

جب پدمنی نے پاؤں چلنا شروع کیا ہے اور توتلی باتیں بھی کرنے لگی ہے تو ایک ہی سوچ نے میرے من کو گھیرا۔ کہیں اسے بھی ایسا دیوتا نہ مل جائے جو اس کی پوجا کرے۔ اس کا باپ اسے پدماولی کہتا تھا اور جب جھک کر اسے پیار کرتا تو اس کی آنکھیں غرور سے جھک جاتیں۔ پدمنی آنگن میں ایک رنگین چڑیا کی طرح پھدکتی پھرتی اور اسکے پیچھے پاندیوں کی قطار ہوتی۔ میں بڑے پلنگ پر جو دالان میں پڑا رہتا لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر دیکھتی مگر میرا دل بجھا سا رہتا گرمیوں کی دوپہروں کو جب پدمنی اپنے بابا کے ساتھ سوئی ہوتی اور رنگین پنکھے ریشمی ڈوریوں کے ساتھ بندھے بے آواز ہمارے سروں پر ہلائے جاتے تو میں دالان سے باہر درختوں کو دیکھتی جن پر نئے پتے چمکتے ہوتے اور نئی کونپلیں پھوٹی پڑتیں۔ ہر شئے پر بہار آتی ہے مجھ پر جانے کب بہار آئے گی پر مجھے خود معلوم نہ ہو پاتا تھا کہ میں کس شئے کے انتظار میں ہوں۔ کون اس ہر آہٹ پر مجھے چونکا دیتی ہے۔ اس بیکاری سے اکتا کر میں نے زور شور سے گھر کو سنوارنا اور ہر کام میں حصہ لینا شروع کیا۔ رسوئی سے لیکر باہر تک سب لوگ چونک اٹھے۔ پدما کے بابا نے مجھے کہا بھی "بھلا تمہیں یہ سب کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے کام تو ہوتے رہتے ہیں تم اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہی ہو۔

انہی دنوں دریا کے پاس گھاٹ سے ذرا ہٹ کر ایک جوگی نے اپنا ڈیرہ لگایا۔ اور لوگ مندر کو چھوڑ کر ان کے درشنوں کے لئے الٹے پڑتے تھے۔ ایک میلا سا رات دن گھد

پر لگا رہتا۔ روز باندیاں آتیں اور کہتیں ماں جی سادھو مہاتما تو جس کی طرف نظر بھر کے دیکھتے ہیں اسی کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مہاتما نے آج یوں کر دیا آج ایسا کر دیا۔ نت نئے قصے سنتے سنتے میرے جی میں بھی ترنگ اٹھی اور میں نے اپنی تمارا کو جو ابھی کنواری تھی اور مجھ سے بہت چھوٹی تھی ساتھ لے کر مہاتما کے درشنوں کو جانے کا ارادہ کیا۔ جاتے جاتے چوکھٹ کے اندر ایک دم رک کر میں نے سوچا بھگوان نے مجھے سب کچھ دیا ہے دولت ہے چاہنے والا پتی ہے رونق کے لئے بچے ہیں خدمت کے لئے باندیاں ہیں۔ میری تو کوئی ایسی آس نہیں جو مجھے پریشان کرے گی۔ بھلا میں کیا لینے مہاتما کے پاس جا رہی ہوں۔ پیچھے سے آتی ہوئی دسنتی نے کہا "بھابی جلد چلو دیر ہو گئی ہے لوٹ کر بھی تو آنا ہے۔ بھیا کو پتہ چل گیا تو ناراض ہوں گے" اور میں بنا یہ سوچے کہ مجھے کسی شے کی آشا نہیں کوئی شے لینی نہیں چل پڑی۔

لوگ گھاٹ پر کشتیوں کے پاس اور گھاس والی زمین پر بیٹھے تھے جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے اور میلے کا سا سماں تھا۔ عورتیں اور بچے جوان اور بوڑھے سبھی تھے دل میں آشائیں لے پرارتھنا کرتے آنکھیں بند کئے پربھو سے لو لگائے بھگتا مانگنے والے۔ مجھے ان سب کو دیکھ کر ہنسی بھی آئی کیا مہاتما ان سب کے دلوں کا حال جانتے ہیں کیا ان سب کو وہ دے سکیں گے جو انہیں چاہئے ہو گا۔ بھگوان تو ہر کسی کو وہ دے نہیں پاتا جو انہیں چاہئے یہ مہاتما اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کہ ہر ایک کی آس پہنچائیں گے۔" مجھے یونہی ہنسی آئی۔ جوگی مہاراج کے آسن کے آس پاس لوگ رام نام مالا جپ رہے تھے اور ہولے ہولے بولتے تھے آدمی سر جھکائے بیٹھے تھے ایک دنیا تھی بھیڑ تھی جیسے لوگ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

عورتوں اور باندیوں کے ایک جمگھٹے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو انہوں نے آدمیوں کو پرے ہٹا دیا۔ ہم نے چادریں اپنے ماتھے تک نیچی کر رکھی تھیں اور باندیوں نے بھی منہ چھپائے ہوئے تھے۔

مہاتما نے میری طرف دیکھا تو کہا دیوی تم میرے اور پاس آ جاؤ تو میں تم سے بات کروں۔ میرا دل یونہی دھک دھک کر رہا تھا اور مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ

گئی تھی۔ جب گھونگھٹ ہٹا کر نیچی نظریں کئے میں مہاتما کے سامنے بیٹھی ہوں تو انہوں نے کہا "آنکھیں اوپر اٹھاؤ۔"

میری نگاہیں جانے کیوں جھکی جاتی تھیں اور آنکھیں اٹھائے نہ اٹھتی تھیں۔ لگتا تھا صدیاں بیت گئی ہیں اور ان نظروں کے سامنے میں بھسم ہو جاؤں گی پھر آپ ہی آپ میرا ڈر دور ہو گیا اور میں نے اوپر دیکھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میرے انتر میں ٹٹول رہے ہوں۔

پھر بہت آہستہ کہنے لگے تمہاری آنکھوں میں اتنی تنہائی ہے اور زمانوں کا دکھ ہے۔ پر تم دُکھی نہیں ہو دیوی تم صرف زندگی سے نراش ہو۔ تم نے در بدر دیکھا ہے پر تباہ کرنے والے دیوتا کا چہرہ نہیں دیکھا۔ تم نے بہت آرام کر لیا ہے۔ تمہارے من میں جوت جلے گی اور ضرور جلے گی۔ پر یہ تمہیں اور تمہارے پتی کو تمہاری بیٹی کو تم سے جدا کر دے گی۔ یہ روشنی تم سے بہت کچھ چھڑا دے گی۔ تم نے آرام کے بہت دن گذار لئے ہیں اب تمہارے لئے جلنے کے دن آئے ہیں۔ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ آنے والی گھڑی ٹل جائے مگر ہونے والی باتیں ہو کر رہتی ہیں۔ جو نصیب میں بدا ہو وہ ضرور ہوتا ہے ڈرنا بیکار ہے تم نے اب تک سکھ بھوگ لئے ہیں اب تم کشٹ اٹھاؤ گی۔ ہر آدمی جو پیدا ہوتا ہے اس کے ماتھے کا لکھا اس دنیا میں پورا ہو جاتا ہے جاؤ میں تمہیں آشیرباد دیتا ہوں کہ طوفان تمہارے سر پر سے جلد گذر جائے۔" پھر انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

دستنی کو دیکھا تو کہنے لگے "تم کتنا ہو میں تمہیں کیا کہوں اگر سال سے پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہو گئے تو تم سکھ شانتی سے رہو گی نہیں تو ایک روگ اپنی جان کے ساتھ لے جاؤ گی۔ تم جو چاہو گی تمہیں وہ کبھی نہ مل سکے گا۔ آدمی ایسی دھرتی سے بنا ہے کہ وہ ان ساری چیزوں پر جو اسے مل جاتی ہیں کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اندھیرے میں جھانکنے کی کوشش کرتا وہ کئی بیگانی چیزوں سے ٹکرا جاتا ہے جب تک ٹھوکر نہ کھائے وہ سنبھل نہیں سکتا۔" اس نے سر جھکایا تو انہوں نے اسے آشیرباد دی اور دیر تک اس کے سر پہ ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے رہے۔

راہ میں وسنتی گھڑی گھڑی میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی تھی "بھابی ہم بیکار میں آئے اب یہ وہم میرے جی میں جڑ پکڑ لیں گے۔ نصیب کی باتیں پوچھنا بیکار ہوتا ہے بھگوان نہ کرے مجھے کوئی روگ لگے۔" وہ چپ ہو گئی تو باندیاں کہنے لگیں "دیکھو تو سہی اوپر سے مہاتما ہنستا ہے اور دل میں کتنا کرودھ بھرا ہے اچھا ہوا ہم نے کچھ نہ پوچھا ورنہ جانے کیا کیا بتاتا"۔ میں نے کہا! وسنتی مہاتما نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس کا بُرا مانا جائے۔ یہ اُن کا کہا تو نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو انہیں کیسے پتہ چلتا کہ تم کنواری ہو۔ اور پھر ہم تو اندھیرے میں تھے۔

پھر ہم سرکنڈوں کی راہ سے جو گاؤں کے باہر سے ہمارے گھر تک جاتا تھا تیز چلنے لگے۔ سرکنڈوں کے ریشمی بور ہمارے سروں پہ لگتے تھے اور سرسر کرتی ہوا اکیلی اکیلی بین کرتی ہوئی بھاگی جاتی تھی۔ گاؤں کے باہر جھونپڑیوں میں دیئے ٹمٹما رہے تھے اور جب ہم شمشان کے پاس سے گزرے ہیں تو بڑے بڑے پر پھیلا کر چمگادڑیں تیز تیز ہمارے آگے پیچھے اڑنے لگیں۔ اور ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی زور زور سے ہنس رہا ہو اور کٹورہ بجا کر گھنگرو پہنے ناچ رہا ہو۔ میں خاموش تھی اور سب سے آگے تھی پر وسنتی سہم سہم کر میرے کندھے سے لگتی تھی اور کہتی تھی "بھابی ہم اس راہ سے کیوں آئیں بھلا شام کے وقت بھی کوئی اس طرف سے نکلتا ہے۔ بوڑھی باندی جو سب سے پیچھے آتی ہوئی ہانپ رہی تھی اس کی بات سنکر کہنے لگی" بی بی جو نصیب میں لکھا ہے ہوتا وہی ہے وہم کرنا اور ڈرنا بیکار ہے بالکل بیکار۔

پھاگن ختم ہو رہا تھا جب ہمارے گاؤں میں اشنان کا میلا لگا ہے۔ دھرتی جیسے نیا روپ دھار کر روشنی سے نہا کر نکلی تھی۔ نرم ہوا چلتی اور نیلے آسمان پر آکاش پہ چاند تاروں کے جھرمٹ میں بہت بھلا لگتا پرندوں کے پروں میں نیا رنگ تھا اور ان کی آوازیں یوں تازہ تھیں جیسے پہلی بار انہوں نے بولنا سیکھا ہو۔ کھیت دُور دُور تک ہریالی سے لہلہاتے تھے اور ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیں دوہری ہو جاتیں۔ میں جب کھڑکی کھول کر باغ سے پرے دیکھتی تو مجھے لگتا اس زمین کو اور ان درختوں کو جنموں سے دیکھتی آئی ہوں اور پھر بھی پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ آموں پہ بور تھا جس کی باس سے نیند سی آنے لگتی اور بڑے سہانے

سپنے دکھائی دیتے۔ میں کھڑی کھڑی جانے کیا سوچا کرتی تھی۔ سفید بگلوں کی قطاریں میرے سر پر سے اڑتی جاتیں، اور آکاش کا نیلا سورج کی روشنی میں بڑا گہرا ہو جاتا۔ جیسے کسی سہاگن کا دوپٹہ ہو۔ میرا دل ہلکا تھا اور بہت سالوں سے جو خوشی میں نے نہیں دیکھی تھی وہ جانے میرے گرد تھی۔ میری رگوں کی اینٹھن کم تھی اور مجھے مہاتما کے لفظ رہ رہ کر یاد آتے تھے۔

آئینہ سامنے رکھے میں پہروں سنگھار کرتی اور اپنی آنکھوں میں دیکھتی کہ تنہائی کہاں ہے۔ میری سکھیاں تو کہا کرتی تھیں کہ ان آنکھوں میں مانو ستارے کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ ارے یہ سوئی ہوئی دھرتی کی طرح ہیں۔ مجھے کون جگائے گا؟

پوجا میں میرا من آج کی طرح کبھی بھی نہیں لگا۔ شانتی کی آشا میں نے آج کی طرح کبھی نہیں کی۔ اور میرے نصیب میں نہ شانتی ہے اور نہ مکتی۔ پر اس بھاگن میں ایک سندر جالی سیڑھیوں کو دھوتی اور دیوتا پر پھول چڑھا کر پرارتھنا کرنا چاہتی۔ مجھے کیا چاہیئے تھا۔ بھگوان تو تو من کی ڈھکی چھپی آشاؤں کو جانتا ہے۔ انتریامی مجھے کس شے کی چنتا تھی؟ اور من ہی من میں ہنستی کہ میں بھلا کیا مانگنے آئی ہوں۔ اس آسن پر کیوں جھکی ہوں ان قدموں کی دھول کیوں ماتھے پر چڑھاؤں گی مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیئے تھا۔ اشنان میلے میں جا کر پانی میں جھلکتے اپنے بدن کو میں نے پہلی بار دیکھا ہے جیسے بلور میں ترشا ہوا ہو۔ بھلا مٹی کا یہ رنگ کیسے اچھا لگتا تھا اور پھر بھی اس رنگ کے لئے میرے پتی دیو میری پوجا کرتے تھے۔

عورتیں مجھے ملتیں تو کہتیں بھگوان تمہاری طرح سب کا نصیب کرے۔ تم بھاگونتی ہو۔ ہماری لڑکیوں کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ اور میں یہ نہ کہہ پاتی کہ میں تو مورتی ہوں میری رگوں میں گرمی نہیں میرے دل میں کسی شے کو پانے کی آشا نہیں چنتا نہیں۔ مجھے خود بھی نہیں پتا کہ میں کیا ہوں پھر تم لوگ کیوں مجھ سے اشیرباد مانگو؟ گیتوں کے بول میرے دل میں گونجتے رہتے۔ میرا کے بھجن پڑھتے ہوئے میں سوچتی میں کیوں رادھا نہ ہوئی۔ آج سے زمانوں پہلے بھگوان نے مجھے کیوں نہ پیار کیا۔ اور پھر برہا کے گیت سنتے میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آ جاتے مجھے کس کا دکھ تھا میں کیوں برہن تھی؟ پدمنی کو سینے سے لگا کر یوں کھینچتی کہ وہ چیخ اٹھتی اور وسنتی کام کرتے کرتے سر اٹھا کر کہتی "بھابی آج کل تم اتنی سندر کیوں لگتی ہو مانو چمپا کی نئی کھلی کلی ہو۔ میں گھبرا کر پدمنی

کو چھوڑ دیتی۔ وسنتی کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھتیں اور میں شرما کر اپنے دالان میں چھپ جاتی۔

پر وسنتی وہاں پر بھی میرا پیچھا کرتی اور کہتی "اچھا بھیا کو تو آ لینے دو دیکھو تو سہی کیسا کیسا تمہیں پریشان کرتی ہوں" اسکے بھیا کے نام پر یوں لگتا جیسے کسی نے زور سے میرے سر پر کوئی چیز مار دی ہو۔ میری رگوں میں خون ٹھنڈا پانی بن جاتا اور میں کہتی "وسنتی کبھی کوئی کام کی بات کیا کر بھلا تجھے کیا ملے گا مجھے پریشان کر کے اور پھر نراش سی ہو کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی اور باغ میں اتر لی چڑیوں کو ڈال ڈال پر پھدکتی ہوئی دیکھا کرتی اور سوچتی آدمی ایسا کیوں ہے کہ کسی شے سے بھی بنا خوش نہیں ہو پاتا؟

وسنتی کی بوا بھی اشنان میلے کے لئے اپنے گاؤں سے آئیں ان کے ساتھ ان کی بہوئیں بیٹیاں اور بیٹے پوتے تھے۔ دو چار سال بیماری کی وجہ سے ان میں سے کوئی آ نہ سکا تھا اور اب کہ جب بوا چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو سبھی کو لے کر مندر چڑھاوا چڑھانے آئیں گھر میں عجیب گہما گہمی اور رونق ہو گئی۔ میرے بیاہ پر آئیں تو سب کے گھر بچے ہونے کی وجہ سے بہت جلد لوٹ گئی تھی۔ ان سب سالوں ان کے بیٹے آتے تو باہر ہی سے پلٹ جاتے رہے۔ میری ساس ہوتیں تو خیر اور بات تھی۔ میری ماں بھی بھیا کو بیکر آئی تھی اور میری موسی کا بیٹا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ گھر میں اتنا منگل تھا اور دن رات ایسی بھیڑ رہتی کہ میرا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ وسنتی کی بوا اور میری ماں مندر سے لوٹ کر آئیں تو پہروں بیٹھی جانے کہاں کہاں کی باتیں کیا کرتیں۔ میرے پتی اُن دنوں گھر میں بہت ہی کم کم آپاتے۔ اتنے اپنوں کی وجہ سے انہیں میری اُداسی کی کوئی ایسی چنتا نہ تھی۔ بھیا ان پانچ چھ سالوں میں بڑا ہو گیا تھا اور جب چمپا کہتا تو لگتا کسی اور کو پکار رہا ہو۔ پدمنی اسکے کندھے سے نہ اترتی۔ میری موسی کا بیٹا کہیں پڑھتا تھا اور ماں کے اکیلے ہونے کی وجہ سے اسکے ساتھ آ گیا تھا۔ وہ بنارس سے چھٹیوں میں آیا تھا اور بہت بانکا تھا مجھے کہتا دیدی تُو تو بڑے گھر کی رانی بن گئی ہے کبھی ہم سے کاہے بولے گی۔ اور میں اسکے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہتی۔ باقی لوگ بہت کم اندر آتے۔ باہر میلہ تھا اور اتنی رونق تھی کہ اندر آنے کی فرصت کسے تھی۔

ایک دن لوا کے سب سے چھوٹے پوتے کی طبیعت بگڑ گئی تو بہو اداس ہو گئی اور بچہ پکار
پکار کر بابا بابا کہتا رہا تو لوا نے کہا چمپا اگر تجھے برا نہ لگے تو منے کے بابا کو گھر میں بلا لوں۔ بچہ
کب سے پکار رہا ہے اور نہیں بہلتا۔

میں نے کہا بھلا اس میں کوئی پوچھنے کی بات ہے لوا ہم دوسرے دالان میں ہو جائیں۔ گے
ہمارے لئے کوئی بیگانہ تو نہیں بس اتنے دنوں نہ ملنے کی وجہ سے ذرا جھجک سی ہے بھر و ستی اور
میں دوسرے دالان میں چلے گئے اور یوں میں نے بانکے بہاری کو دیکھا۔

اسکے کانوں میں بالے ہلکورے لے رہے تھے اور وہ آنکھیں جھکائے تیز تیز قدموں سے
آنگن کو پار کر رہا تھا۔ پھر مجھے لگا یہ سب لوگ یہ سارا زمانہ یہ رشتے جھوٹے اور بیکار ہے
میں جیسے پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں اور میرے سر اٹھے ہوئے ہاتھ کی سیدھ میں وہ دیکھ رہا ہے
پھر اسنے آہستہ سے سر پھیر کر ایک لمحہ کو میری آنکھوں میں جھانکا ہے اور جب میرا سینا
... تو وہ بچے پر جھکا پوچھ رہا تھا "کیوں ارجن منے مجھے کیوں پکارتے ہو بابا۔ سب لے کر چلو
... مٹھائی کھاؤ گے۔ بچہ اسکے گلے کے ساتھ لگ کر زور سے رونے لگا۔ اور میں نے بسنتی
... نے کو اس زور سے دبایا ہے کہ اسنے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "جانی تہیں
... ہے تمہارا رنگ پیلا کیوں پڑتا جاتا ہے۔ تم اچھی طرح سے تو ہو۔"

... میں کانٹے پھیلے ہیں جیسے زمانوں سے پیاسی ہوں اور زبان منہ میں دکھ
... ہو گئی تھی میں نے سر ہلا کر کہا میرا جی اچھا نہیں بسنتی مجھے پانی لا کر دو۔ اور میری صورت
... بسنتی گھبرا گئی ہو گئی اور پانی لے آئی۔ جنم جنم کے پیاسے کبھی پیاس بجھا سکے ہیں۔

... بہاری بچے کو گلے سے لگائے باہر چلا گیا۔ شام کا نیلا دھندلکا چاروں طرف تھا۔
... سے چل رہی تھی اور سردی تھی میں نے پلنگ پہ لیٹے لیٹے سوچا رات کتنی ... ہانی اور سندر
... رول بھری اور سورگ کی اپسراؤں کی طرح نازک کامنی سی۔ پردوں میں اپنا چہرہ چھپائے
... چھنکاتی جانے کتنے من لبھائے گی۔ جانے کتنے لوگ اپنی پیاس بجھائیں گے کتنے لوگ
... ادٹ میں اپنے ہردے کی پیڑا اور من کی کھن ایک دوسرے سے کہیں گے؟ اور وہ
... ایک نیلی دھند میں لپٹی میں بے سدھ سی پڑی رہی میرا جاگا ہوا من نئے پیدا ہوئے

بچے کی طرح اپنی حالت پر آپ ہی حیران تھا۔ میں کچھ سوچنا چاہتی تھی اور سوچ نہ سکتی تھی۔ ساری آوازیں مجھے اپنے سے دُور باہر کہیں اور گھومتی لگتی تھیں۔ دو ایک بار وسنتی نے مجھے کھانے کے لئے کہا تو میں نے اُسے کہہ دیا میرا جی اچھا نہیں ہے اسنے کہا کیا بھیا کو بلاؤں تو مجھے یوں لگا جیسے بھیا جانے کون ہو بھلا اُسے مجھ تک بلانے سے میرا جی کیسے اچھا ہو سکتا ہے۔
ارجن کی حالت بگڑ گئی۔ اس شام سردی میں باہر سے جاتے ہوئے بانکے بہاری نے خیال نہیں کیا تھا اور اسے بخار آیا ہے تو وہ بیہوش ہو گیا۔ میں سب سے الگ تھلگ اپنے کمرے سے باغ میں اُتر جاتی اور سیر طیبوں پر بیٹھی تالاب کے کنارے پہروں پانی میں جھانکتی رہتی۔ بیہوش سی شہد کی مکھی کی طرح جو زیادہ خوشبو میں بس درخت کے گرد چکر لگاتی رہے اور اسے بھول جائے کہ وہ شہد لینے کے لئے آئی ہے بھونرے کی طرح جو پھول تک پہنچ کر بس کھو جائے اور اپنا منہ بیٹھا کئے تکتا چلا جائے۔ اور یہ میرا جسم ایک نئے سانس سے بسا ہوا اتنا بیگانہ لگتا تھا کہ گھبرا کر میں اپنے ہاتھوں کو تکتی تھی۔ ایک نام پپیہے کے بول کی طرح میرے دل میں چکر لگاتا تھا بانکے بہاری بانکے بہاری چڑیاں ڈال ڈال پھُدک پھُدک کر یہی نام لیتی تھیں پتے ہوا سے ہلتے تھے تو یہی نام کہتے تھے ہوا جب درختوں میں سے گزرتی تو یہی آواز آتی تھی اور پھر چمپا چمپا جانے کون پکارتا تھا؟
میلا ختم ہو گیا تھا پر ارجن کی بہت کمزور تھا تو کچھ دنوں اور رُک کر اپنے باقی بچّوں سمیت چلی گئیں صرف بانکے بہاری اور اس کی بیوی رُکے رہے۔ وسنتی کا بھیا میری طرف دیکھ کر سوچنے لگتا تھا اسے کیا ہو گیا ہے وہ میرے پاس بیٹھا رہتا اور میں اس سے بات نہ کرتی۔ جب وہ کچھ کہتا تو یوں چونک کر اس کی طرف دیکھتی جیسے جانے وہ کون ہو اور مجھ سے اُسے کیا کہنا ہو۔ میرے پاس کیوں بیٹھا ہو۔ پھر اسنے سوچا میں بس یونہی اداس ہوں اور ماں کے جانے کے بعد گھبرا گئی ہوں۔ تب پہلی بار اپنے رسم ورواج کھول کر اسنے کہا۔
"چمپا اگر تم جانا چاہو تو تھوڑے دنوں کے لئے مائکے ہو آؤ۔ تمہارا رنگ یوں پیلا پڑتا جا رہا ہے جیسے کوئی بڑا دکھ اندر ہی اندر تمہیں کھائے جا رہا ہو۔ مجھے کیوں نہیں بتاتی ہو۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہارا دکھ دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔" اور پہلی بار میں نے جانا کہ

یہ سب کیا دھرا اُسی کا ہے اگر وہ اپنی اچھی صورت کے ساتھ دبتا بنتا تو۔ یہ لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟ مجھے اس پر بڑا ترس آیا وہ میرے لئے آپ اتنا دکھی ہو رہا تھا۔ وہ میرے لئے ایسی ساری باتیں کرنا چاہتا تھا جو اُن کے خاندان میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں میں پدمنی کو بھی بھول گئی دستنی کو بھی بھول گئی۔

جب بانکے بہاری نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے وہ شام بادلوں کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی اور بارش سے بھیگی ہوئی تھی میں پشینے میں لپٹی تکئے سے ٹیک لگائے اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اور باقی سب لوگ ارجن کے پاس تھے۔ دستنی بھی اپنے کمرے میں باندیوں کے ساتھ کہانی کہہ رہی تھی۔ بجلی جب چمکتی ہو گی تو بچہ ڈرتا ہوگا۔ ارجن کے رونے کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میرے پتی ابھی مندر سے لوٹ کر نہیں آئے تھے میرا خیال تھا جیسے پوجا ابھی ختم نہیں ہوئی ہو گی۔ میں آگ کے شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو لوہے کو بھی سرخ کئے دیتے تھے اور لوہا مانو پگھل رہا تھا ان کے ساتھ بہنے والا تھا۔ دئیے کی لو بڑی مدھم تھی اور آگ کا عکس میرے چہرے پر پڑ رہا تھا مجھے اپنی آنکھیں جلتی ہوئی لگتی تھیں۔

کسی نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا بھابی کیا گھر میں امرت دھارا ہوگا۔ ارجن روئے جاتا ہے۔ جب میں نے منہ پھیر کر دیکھا ہے تو بانکے بہاری تھا۔

باہر ہوا ایک بین کرنے والی آواز سے چل رہی تھی۔ اور کھڑکی میں سے جو بادل مجھے دکھائی دے رہے تھے وہ آگ کے رنگ کے تھے آکاش پگھل کر اُن میں ملتا ہوا لگتا تھا۔ سورج اب ڈوب رہا تھا۔ یہ پہلی گھڑی تھی کہ ہم دونوں اکیلے ملے تھے۔ میں اٹھنا چاہتی تھی اور اٹھ نہ سکی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی۔ اُس نے گھبرا کر پھر کہا "بھابی منا رو رہا ہے اگر امرت دھارا ہو تو دے دو۔"

دوسروں کے سامنے ہم نے آج تک کوئی بات نہ کی تھی میرا کیسا کیسا جی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولے کچھ تو کہے اور آج جب ہم آمنے سامنے تھے تو سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیا بات کر سکتی ہوں۔ جانے اُسنے ندی کنارے بیٹھی اُس رنگین شام والی لڑکی کو پہچانا بھی تھا کہ نہیں؟

تنے میں ارجن بہت زور سے چیخا اور بانکے بہاری بھاگ کر میرے جواب کا انتظار کئے بنا کمرے سے باہر نکل گیا مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج جنموں کے بعد ہم اکیلے ایک دوسرے کے سامنے ہوئے تھے اور آج اُسی گھڑی وہ میری پرواہ کئے بنا جب کہ میں اپنا دل اسکے قدموں میں ڈالنے والی تھی بھاگ کر چلا گیا تھا جیسے اور دنیا وہ بچہ وہ بیوی اس کے لئے سب کچھ ہوں اور میں جس نے زمانوں اُس کا انتظار کیا تھا اس کی کچھ نہ تھی۔ من جب تو کبھی باتوں سے دکھی ہونے لگتا ہے تو اُسے کون سمجھا سکتا ہے۔ مورکھ من! میری آنکھیں دکھ کے آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں روتے روتے تکئے کے سہارے گر گئی۔ میرے لئے کوئی امید نہ تھی۔ بانکے بہاری کو میرے دل کی ذرہ برابر بھی خبر نہ تھی میرا پتی اندر آیا ہے تو میں بے سُدھ پڑی تھی اس نے مجھے پکارا مجھے ہلایا اور جب وہ گھبرا گیا تو اسنے وسنتی کو آوازیں دیں۔

میں ایک روگی کی طرح بستر سے لگ گئی اور دیئے کی بتی کی طرح گھٹنے لگی ہوا اور بانکے بہاری دونوں میرے پاس آکر بیٹھے رہتے۔ تارا بڑے پیار سے میرے ہاتھوں کو دباتی اور مجھے کہتی بھابی تمہیں کیا ہے تم روز بروز گھلتی کیوں جا رہی ہو۔ بانکے بہاری کہتا " جب ہم آئے تھے بھابی تو آپ اچھی بھلی تھیں اب اتنے تھوڑے دنوں میں آپ کی صورت بدل گئی ہے۔"

تارا اتنی سندر تھی جیسے چاند ہو۔ بالکل دیوی کی سی موہنی اسکے چہرے پر تھی جب ہنستی تو میرا دل چاہتا اُسے اپنے دل کے ساتھ لگالوں۔ بانکے بہاری اسکی صورت کو دیکھ کر جیتا تھا۔ باہر سے آتا تو تارا تارا پکارتا ہوا۔ یوں ایسا اوچھا بھی نہ تھا۔ مگر تارا میں اس کی خوشی تھی۔ جیسے چاند اور چکور ہو۔ میں لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتی اور میری آس ٹوٹ جاتی۔ کیا ہی اچھا ہو یہ دونوں چلے جائیں تو!

پھر میری بیماری لمبی ہوتی گئی اور وہ دونوں چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ تارا مجھ سے مل کر جا چکی تھی اور اب کمرے میں سے سامان باہر بھجوا رہی تھی۔ بانکے بہاری جب مجھ سے وداع ہونے آیا ہے تو میں دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھی اور رو رو کر میری آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہچکیوں سے میرا جسم ہل رہا تھا۔ جب اس کے بلانے پر بھی میں نہ بولی تو اس نے مجھے ہلا کر کہا۔

"بھابی۔ بھابی۔ آخر آپ کو کیا ہے۔ کیا آپ کا جی بہت ماندہ ہے۔ میرا جسم اس کے ہاتھ کے نیچے پگھل کر پانی بن گیا۔ جیسے وہ سورج تھا اور میں ایک قطرہ۔ جیسے وہ آگ ہو اور میں چنگاری۔

دکھ میں آنند ملا تھا میں نے دیوار کی طرف منہ کئے کئے اپنے کندھے پر پڑے اسکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو کانپ رہا تھا اور رگوں کی ساری زندگی کی آگ زندگی کی ساری تمنا میری انگلیوں میں سما گئی تھی۔ اس کا ہاتھ میرے جلتے ہوئے ہاتھ کے نیچے ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اور یوں زمانے بیت گئے۔

بیساکھ آگیا تھا جب میں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئی ہوں۔ فصلیں کٹ گئی تھیں اور دور دور تک سنہرے ڈھیر کھیتوں میں تھے۔ ہوائیں دیوانوں کی طرح درختوں میں ناچتی ہوئی چلتیں اور مندر میں چڑھاوے چڑھانے والوں کی بھیڑ رہتی۔ ڈھول بجتے رہتے اور لوگ مست ہو کر دیوی ماں کی استتی گاتے۔ میں ان ساری آوازوں کو سنتی جو اپنی گہری گونج کے باوجود صرف میرے کانوں سے ٹکرا سکتیں تھیں۔ اندر میرا من یوں تھا جیسا جاگ کر پورے ہوش میں نہ آیا ہو۔ کسنتی کہتی بھابی یہ تمہاری صورت ایسے کیوں ہے جیسے آدمی سپنا دیکھ رہا ہو۔ تم کوئی سپنے دیکھتی ہو جبکہ میرا بھیا بھی تمہارے پاس ہے مجھے یوں لگتا ہے مانو تم ایک پری ہو جو ہمارے گھر جانے کیسے آگئی ہو اور جب تمہیں وقت ملا تم پنکھ پھیلا کر اڑ جاؤ گی" پھر ہم دونوں مل کر ہنسنے لگتے اور بدقسمتی بھی کھیلتی ہوئی کہیں سے آکر ہمارے ساتھ مل کر یونہی ہنستی خوشی روشنی ہے جو ایک سے دوسرے چہرے پر پھیلتی ہے جیسے دیئے روشن ہو جائیں۔

وقت ایک ایسے جنگل کی طرح میرے سامنے پھیلا تھا جس میں سے نکلنے کا راستہ میری آنکھیں ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں اور پا نہ سکی ہوں۔ بانکے تمہاری میرے دل کا حال جانتا تھا پر اس سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے میری کوئی پرواہ نہ ہو میں صرف اسکی بھابی ہوں اس کے بھائی "چندر شیکھر" کی بیوی۔

دن لمبے ہوتے جاتے تھے اور روئی کے ساتھ سفید روئی کے گالوں کی طرح چھوٹے چھوٹے بادلوں کے قافلے میرے سر کے اوپر سے گزرتے رہتے۔ ایسی دوپہر میں جب نیند آنے لگتی ہے

رہٹ کی آواز میں ساری دنیا کے ساز بجتے اور میرا دل چاہتا پر لگا کر اڑ جاؤں۔

مہاتما نے کہا تھا تمہارے من میں جوت جلے گی۔ مگر یہ جوت کیسی تھی کہ اسکی روشنی نہ اندر تھی نہ باہر جو کسی تک بھی پہنچ نہ پاتی تھی آموں کے بور کی خوشبو مدھم پڑتی جاتی تھی اور باغ میں کوئلیں شور مچاتی رہتیں۔ سویرے میرے سپنے انہی کے بولنے سے ٹوٹتے۔ میں اپنے سینے کو پکڑ کر بیٹھ جاتی دل باہر نکلنے لگتا۔ کوئل جلانے اتنے دکھ سے کیوں روتی ہے؟

"چندر شیکھر" اگر کبھی بانکے بہاری کا نام لیتا تو میرا دل یونہی دھڑکنے لگتا۔ سارا جہان اسی دھڑکن کی تال پہ مجھے ناچتا اور کانپتا لگتا تھا اور پھر سب سے زیادہ ڈر مجھے اس بات کا تھا اگر "چندر" کو معلوم ہو گیا تو کیا ہو گا اس کی دیوانی چاہت کا کیا بنے گا۔ وہ کیا کہے گا پتا ستر دل نے مجھے اس کی پتنی بنایا تھا اور میں ایک پتی ورتا عورت نہ تھی۔ میں شروع سے ایسی نہ تھی۔ پھر ایسے ہی ان گنت دکھ میری جان کو روگ بن کر آن لگتے۔ دریا کے گھاٹ پر مندر کی سیڑھیوں پر بولتے اور چلتے لوگوں سے ملتے برادری کی عورتوں میں مل کر بیٹھتے اشنان اور پوجا کے سمے میں ایک ایسے چور کی طرح بھی محسوس کو کسی گھڑی بھی اپنے راز کے کھل جانے کی فکر ہو۔ دیوی کے سامنے میں جانے سے ڈرتی دیوی ماں تو دلوں کا حال جانتی ہے اور دیوی ماں یہ بھی جانتی ہے کہ میں نے بانکے بہاری کے لئے اپنا آپ تج دیا ہے۔ میں پھر بانکے بہاری کو کب دیکھوں گی؟

وسنتی باتیں کرتے ہوئے کہتی تارا بھابی کتنی سندر ہے مانو چاندنی ہو۔ جب ایسے چہروں کو دیکھو تو دنیا بڑی پیاری لگنے لگتی ہے جی چاہتا ہے بس جئے چلے جائیں اور پھر بھیا بہاری ہے کتنا اونچا اور سندر ہے دیوتا لگتا ہے۔ میرے بھیا سے بھی نکلتا قد ہے۔ تو اکے سارے بیٹوں میں سے وہی سب سے بانکا ہے۔ جب میں بہت چھوٹی سی تھی اور ماں زندہ تھی تو ہمارے بابا کے پاس رہا کرتا تھا۔ پھر ماں اور بابا دونوں چلے گئے اور تو اب بوڑھی ہو گئی ہیں کم کم ہی آتی ہیں اُن دنوں ہمارے گھر میں کتنی رونق ہوا کرتی تھی۔ اب تو مجھے بہاری بھیا کے سامنے آتے لاج آتی ہے ان دنوں وہ مجھے اٹھا کر گھوما کرتے تھے اور میں ان کو کتنا تنگ کرتی تھی۔ بھابی تب یہ مندر اور گھاٹ اور یہ گاؤں بہت آباد تھا۔"

مجھے ہر اُس شے سے جو بانکے بہاری چھو چکا تھا لگاؤ تھا پھر وسنتی سے کیوں نہ ہوتا۔ وسنتی یونہی

بڑی پیاری لڑکی تھی پھر اتنے بڑے گھر میں ہم دو لوں ہی تو تھے۔

پوربی ہوا چلتی تو میری کھڑکی کے کھلے پٹ یوں بجتے جیسے دو بچھڑی روحیں آپس میں گلے مل رہی ہوں۔ میں بار د کھول دیتی اور میرا جی چاہتا ہوا کی یہ ساری شوخی اور تیزی اپنے میں بھر لوں۔ اور ان ساری خواہشوں اور خیالوں کے اوپر میرے کان ان قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار رہتے جن میں میرا دل تھا۔ ساری دنیا وہی تھی کہ ایک دل کے بدلنے سے سب کچھ اور ہو گیا تھا۔ پھر گرمیاں آئیں اور سنساتی ہوئی دوپہروں کے ساتھ گزر گئیں۔ برساتیں ہوئیں اور برہا کی ماری کا دل ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ برکھا اور بادلوں کے گھنیرے میں رنگوں اور درختوں کی ہریالی میں میا نرک کی اس آگ میں جلتی رہی جس سے مجھے کبھی چھٹکارا ملنے والا نہیں تھا۔

جب وسنتی کی منگنی ہوئی ہے تو اور لوگوں کے ساتھ بانکے بہاری بھی آیا۔

گھر عورتوں سے بھرا تھا اور بہت بھیڑ تھی۔ گاتی ہوئی عورتیں سنگار خوشبوئیں اور پھر سکڑی سمٹی دالان کے ایک کونے میں گاؤں کی لڑکیوں اور برادری کی ماسیوں اور چاچیوں سے گھری وسنتی بیٹھی تھی۔ "چندر شیکھر" نے اس سے پہلے اس بات کا مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جب کیا ہے تو مجھے ہوش کہاں ہوگا کہ میں یہ کہہ سکوں کہ وسنتی سے پوچھ لیا جائے بھلا کسی نے کبھی لڑکیوں سے بھی پوچھا ہے کہ تمہاری مرضی کیا ہوتی ہے؟

رسم ختم ہوئی ہے تو بھیڑ ہوتے ہوتے چھٹ گئی۔ میری حالت یہ تھی کہ منزل سامنے تھی اور میں وہاں تک پہنچ نہ سکتی تھی اور میں بہت اداس تھی۔ پرانی بیماری پھر سے مجھے آتی جان پڑی۔ میں سارا سارا دن دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی رہتی اور اس ہاتھ کی منتظر رہتی جو میرے کندھے پر پڑے گا اور میرے ہاتھ کی گرفت کے نیچے ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میری رگوں کی وہ اینٹھن پانی بن کر بہے گی اور میرا سارا وجود اسکے قدموں میں ہوگا جسے شاید ان سب کی ضرورت بھی نہ تھی۔

بہاری کی اور میری دوسری ملاقات بالکل اچانک ہوئی۔ وسنتی پوجا کے لئے مندر گئی ہوئی تھی اور میں اپنے کمرے میں رنگوں کی پٹاری میں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی شاید وسنتی نے کچھ کہا ہوگا کہ وہ باہر کھنکارا اور پھر دالان کو پار کر کے دروازے کے بیچ میں کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ جہاں تھے وہیں کے وہیں رک گئے اور ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گئے۔

اسنے دوبارہ کھانس کر اپنا گلا صاف کیا اور کہنے لگا "بھابی میں وداع لینے آیا ہوں۔ آج اپنے گاؤں جاؤں گا تارا کو کیا کہوں وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔
میرے کانوں میں اس کی آواز میٹھے مدھر راگ کی طرح پڑ رہی تھی جو مجھے سلا ہی تو دیگا۔
اسنے پھر کہا میں نے سوچا بھیّا سے وداع لینے سے پہلے تم سے وداع ہو لوں۔ تم بیمار تھیں جب ماں گئی ہیں تمہارا بھی بہت پوچھ رہی تھیں جس دن سے میں آیا ہوں اس بھیڑ بھڑکے میں تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟
مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ اس سے کہتی بیٹھ تو جاؤ۔ وہ وہیں دہلیز پر کھڑا تھا اور باقی ساری دُنیا کے اور میرے درمیان تھا۔ اور پھر بھی مجھ سے بہت دُور تھا۔
میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا۔ صرف ایک اندھا بے نام زور تھا جو یہ کہہ رہا تھا اگر اب کے بھی بہاری سے کچھ کہہ نہ سکیں وہ کچھ سُن نہ سکا تو ساری عمر روتی رہو گی۔ ہر روز دستی کی منگنی تو نہیں ہو گی۔ روز تو پھول نہیں کھلیں گے۔ یہ رُت سدا تو نہیں رہے گی۔
ہوتے ہوتے میں نے اپنی پوری طاقتیں لگا کر آنکھیں اوپر اٹھائیں اسکی طرف دیکھا وہ ایک جادو کئے ہوئے انسان کی طرح وہیں دہلیز میں کھڑا تھا اور میری طرف دیکھتا جاتا تھا میری ان نگاہوں نے مجھے کتنا ننگا کر دیا تھا اور پھر ان آنکھوں کی حیرت وہ بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں جیسے تصویر میں بھگوان کرشن کی ہوتی ہیں۔
پھر وہ مڑا اور اس سے پہلے کہ میں اُسے کچھ کہہ سکتی لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پار کر کے باہر چلا گیا۔
میں نے منہ کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور رنگوں کی پٹاری پر گر کر زور زور سے سسکنے لگی بھگوان یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ کیا چاہت کا یہی مطلب ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے قدموں میں گرا دیا۔ عورت کی شان اس کا مان پو تر تا۔ ہائے مجھے لاج نہ آئی جانے بہاری کیا کہتا ہو گا۔ اب تو شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ ورنہ وہ یوں بھاگ کیوں جاتا۔ اسے مجھ سے سخت نفرت تھی۔ بھگوان اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں یوں تڑپ رہی تھی جیسے مجھے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔

جاگتی ہوئی دستی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی اسکے پیچھے باندیوں کی قطار تھی سامنے پریشان چہروں کے درمیان میرا من میرے ہاتھ سے چھوٹتا جاتا تھا۔ شرم اور بے عزتی کے خیال سے میرا جسم پانی ہوا جاتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ بھگوان یہ کیسی جوت تھی جو میرے من کو کبھی روشن نہ کر سکے گی۔ بھگوان کیا تو دیا نہیں کر سکتا۔

پدمنی رو رہی تھی اور میں چاہتی تھی کہ اپنے ایسے جسم میں تھوک دوں اُس گھڑی پر ہزار پھٹکار جب میں پیدا ہوئی ہوں خاندان کا نام لاج اور شرم۔ ارے میں کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ ایسی عورت کے لئے تو موت سے زیادہ کوئی بہتر شے نہیں۔

سارا دن گزر گیا شام آگئی "شیکھر" میرا دل بہلاتا رہا وید جی نے طاقت کی کئی دوائیں دیں۔

۵

رات قریب آئی تو مجھ میں نئی طاقت آگئی۔ پدمنی کہانی سنکر سو گئی۔ میں نے "شیکھر" سے کہا میرا جی چاہتا ہے مندر جاؤں۔ وہ حیران ہو کر بولا "ویسے تمہارا جب جی چاہے تم ضرور جاؤ۔ مگر رات اندھیری ہے تمہیں ڈر نہیں لگے گا کہو تو میں ساتھ چلوں۔" اور میں نے بڑے پیار سے اس سے کہا "تم بھی بس ایسے ہی ہو مندر کونسا ایسی دوری پر ہے اور پھر جہاں دیوی ماں ہو وہاں ڈرنے کی کیا بات ہو گی تم سارا دن کے تھکے ہوئے آرام سے سو جاؤ۔ میں کسی کو بھی نہیں لے جانا چاہتی میں آج تن اور من لگا کر پرارتھنا کرنا چاہتی ہوں تاکہ یہ جو روز روز مجھے بیماریاں آگھیرتی ہیں ان سے چھٹکارا ملے۔ تم پریشان ہوتے ہو تو میں اور بھی پریشان ہوتی ہوں۔" اور پھر میں نے جھک کر اسکے ماتھے کو چوم لیا۔

بہت دنوں کے بعد میں نے اتنا دل لگا کر اور پیار سے اس سے بات کی تھی اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ پھر میں نے پدمنی کو پیار کیا اور جاتے ہوئے "شیکھر" کے پاؤں اپنی آنکھوں سے لگائے وہ اٹھ بیٹھا اور بولا چمپا آج تمہیں کیا ہو گیا ہے لگتا تم بہت نراش ہو مجھے تو بتاؤ کیا بات ہے۔ تم یوں کیوں کر رہی ہو مانو آخری بار ہو۔ نصیب میں جو بدا ہے وہی ہو گا۔ پر جب

لب میں زندہ ہوں تم مر نہیں سکتیں تمہیں کیا ہے۔ ضرور جاؤ اور دیوی ماں کے قدموں میں بیٹھ کر جی بھر کر پرارتھنا کرو۔ بھگوان جانتا ہے میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی آس یہی ہے۔ تم تو میرے ہردے کی روشنی ہو۔ تم میری پدمنی کی ماں ہو تم میری ساری دنیا ہو۔"

اس رات میں نے پور پور سنگھار کیا تھا۔ اپنا سب سے بڑھیا جوڑا نکال کر پہنا تھا۔ زیوروں سے لدی آخری بار جیب دے کی لو میں میں نے آئینہ دیکھا ہے تو میں خود حیران تھی۔ میں تو مرنے جا رہی تھی۔ شرم کے بوجھ تلے دبی میں تو آخری گھڑی دیوی کے قدموں میں جان دینا چاہتی تھی۔ اور یہ سنگار کیسا تھا جیسے میں بہاری کو ملنے جا رہی ہوں۔ بہاری کا نام سویرے کے بعد اب میرے من میں آیا تھا جیسے کوئی رات کا مسافر سب سے آخر میں آئے اور دوار کھٹکھٹا کر تھکا ہارا اندر گھستے ہی سو جائے۔ پھر اس نام کے تال اور سُر پر جیسے میرے قدم ناچتے ہوئے آگے بڑھے۔ تھال میں دیئے جلائے او پھول رکھے میں اکیلی مندر کی طرف چلی۔ پلو میں بندھی زہر کی پڑیا کو رہ رہ کر میں ٹٹول رہی تھی۔

میرا دل کہتا تھا تم ایسی دلہن بنی ہو جو پہلی بار اپنے پریتم سے ملنے جا رہی ہو۔ تم رادھا ہو جو اندھیرے میں اپنے کرشن سے ملو گی۔ تم رنگنی ہو جسے چرانے وہ آپ آئے گا۔ اور مرنے والے کی طرح نہیں زندگی میں پہلی بار داخل ہونے والوں کی طرح میرے قدم ہلکے اٹھ رہے تھے۔ ساری دنیا مجھے اپنے گرد ناچتی لگتی تھی۔ ہوا میں ایسی سنسناہٹ تھی جو خوشی کا گیت سا ہو۔ ہے بھگوان کیا بہاری چلا گیا تھا ــــ بہاری۔ بہاری۔ بے وقت کوئل جانے کیوں بول رہی تھی؟

مندر میں دیا مُند مُند جل رہا تھا۔ میں نے تھال رکھ دیا اور پھول دیوی کے چرنوں پر چڑھا دیئے۔ اتنے دیئے جلنے سے روشنی زیادہ ہو گئی تھی۔ دیوی ماں مجھ سے اونچی تھی اور اندھیرے سے مل روشنی میں مجھے اس سے ڈر بھی لگتا تھا پر ڈر کس بات کا تھا۔ یہ میری زندگی کی آخری رات تھی۔ میں اُن چرنوں پر جھکی دیوی ماں سے زندگی کی نہیں موت کی بھکشا مانگ رہی تھی۔ دیوی اگر پریم کرنا اگر کسی کی آشا کرنا اتنا ہی بڑا ہے تو میں جینا نہیں چاہتی ہر دن میرے لئے مصیبت تھا۔ اور ہر گھڑی میرے لئے عذاب۔ ایسے انسان کی طرح جس کی جان بس ہونٹوں پر اٹکی ہو۔ دیوی ماں

لوگ تجھ سے جینے کی بھکشا مانگتے ہیں میں تجھ سے موت کی دکشنا لینے آئی ہوں۔

دیوی ماں مجھے طاقت دے۔ دیوی ماں مجھے شکتی دے۔

اُس گھڑی مجھے ماں یاد نہیں آئی۔ مجھے کندھے پر اٹھانے والے بابا یاد نہ آئے۔ پلّو پکڑ کر پیچھے بھاگنے اور چھپا چھپی کھیلنے والا بھیّا یاد نہ آیا۔ سکھیاں اور سہیلیاں نہیں۔ پدمنی اور "شیکھر" کوئی بھی تو میرے ذہن میں نہ تھا۔ بس ایک خیال تھا کہ آج میری آنکھوں میں میرے تن کی بھوک کو ہر آدمی نے جان کر بھی مجھے دھتکار دیا ہے اور سوائے مرنے کے میرے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ موت میرے سارے دکھوں کا انت تھی۔ میرے سارے کشٹ دور ہو رہے تھے تو مہاتما نے یہی کہا تھا کہ میرا پتی اور میری پدمنی مجھ سے بچھڑ جائیں گے۔ پتہ نہیں اب میں کہاں اور کس صورت میں جنم لوں۔ مجھے مکتی کبھی نہیں ملے گی — دیوی ماں مجھے شکتی دے۔ میں جینا نہیں چاہتی مجھے ہمت دے۔

پھر میں نے اٹھ کر دیئے بجھا دیئے۔ باہر چاند کی روشنی تھی جو بڑے دروازے کی دہلیز پار کر کے اندر آنا چاہتی تھی۔ پر ایسی رات جب موت اندر ہو اور یم کے دوت دوار میں کھڑے ہوں۔ چاندنی بھی اچھوت کی طرح باہر بھٹکتی رہی۔

دیوی ماں کے چرن چھو کر میں نے پلو کے اس کونے کو ہاتھ میں پکڑا جس میں زہر تھا۔ پھر میں نے ایسی آواز میں جو مندر میں گونج گئی۔ کہا "دیوی ماں تو گواہ ہے میں لاج شرم اور پونترتا کے لئے مر رہی ہوں۔ تا کہ میرے من کو ایسی بیماریاں نہ لگیں جو پتی ورتا استری کی سہاگ سے باہر ہوں۔ بھگوان تو میرے اس بلیدان کو سویکار کرے۔ میری انگلیاں ہولے ہولے گرہیں کھول رہی تھیں اور میں دیوی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھی تھی۔ دیوی کے قدموں کے پاس صرف ایک دیا جل رہا تھا۔ پڑیا کو کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ گئے۔ میں نے سوچا باہر کتنی نرم چاندنی ہے اور ہوا ہے۔ اور ساری دنیا جو مجھے پیاری تھی وہ نظارے جو مجھے سہانے لگتے تھے وہ سب اس ایک پڑیا کے بدلے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ پھر بُوا کو پتہ چلے گا اور پھر بہاری اور تارا آئیں گے اور کہیں گے چھپا بھابی نہیں رہی اور شاید بہاری کو دکھ ہو۔ شاید بہاری میرے لئے ایک آدھ آنسو بہائے۔ زندگی بڑی پیاری چیز ہے۔ میری انگلیاں پڑیا پر بہت بے جان سی

تھیں اور کاغذ کھوے نہیں کھل رہا تھا۔ جب میں نے پڑیا کھول لی ہے اور منہ اونچا کر کے اُسے اپنے حلق میں گرانے لگی ہوں تو کسی نے ہاتھ مار کر زہر گرا دیا اور پھر دیا بھی بجھ گیا۔

میں سسک رہی تھی اور میرے من میں دیوالی ہو رہی تھی۔ اس چوڑے سینے میں سمانے کے لئے میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے ہونٹ میری باہیں اور یہاں تک کہ میرا دل بھی پگھل کر اس گرم دھارے میں مل گیا جو زندگی تھا۔ دیوی ماں نے مجھے دکشنایوں دی تھی کہ مجھے میرا اپنا آپ بھی لوٹا دیا اور وہ بھی جس کی مجھے آشا تھی۔ شرم لاج اور گھونگھٹ جانے کہاں تھے۔

یک مدھر سپنے میں دیکھی صورت کی طرح کوئی کہہ رہا تھا سولا سنگار کئے تم موت سے ملنے کہاں جا سکتی تھیں۔ موت میں کب اتنا بل ہے کہ سندرتا کو جیت سکے۔ یہ سپنوں کی سی رات ہے اس رات میں بھگوان ملتا ہے۔ بھگوان جو آپ پریم ہے جو آپ سندرتا ہے۔

میں کب تک تمہارا انتظار کرتا۔ چمپا میں کب تک ... ری راہ دیکھتا۔

جب میں گھر لوٹی ہوں تو آکاش پر اندھیرا اجالے میں ملنا چاہتا تھا۔ سوئے ہوئے کھیت شانتی ہی شانتی صبح کا تارا شانتی تھا اور میرا مسلا ہوا سنگار میری مسکی ہوئی چولی میرے گھنیرے اور کھلے بال میری چوری کی نشانی تھے۔ ہر طرف شانتی تھی۔ تو دھنیہ ہے دیوی ماں۔ تیرا مندر پریم کا مندر ہے

ارے اب ان بوڑھی رگوں میں کیا رہا ہے۔ اب دیوی سے کچھ بھی مانگوں تو کبھی نہیں ملے گا۔ میں نے تو سب کچھ مانگ لیا تھا اس ایک رات میں اسنے مجھ پر ہر شے کی بارش کر دی تھی۔ اُس برکھا میں نہا کر میرے بدن سے سارا میل میرے من سے ساری گھٹن اور میرے انگوں کی ساری پیڑا ڈھل گئی تھی۔ میں پریم رنگ میں رنگی ہوئی اتنی پوتر تھی جیسے ابھی پیدا ہوئی ہوں۔

۶

وہ جیون جو اس رات کے بعد سے مجھے ملا ہے اس پر سوائے بہاری کے کسی کا ادھیکار نہ تھا وہ جیون اسنے بچایا تھا۔ دیوی ماں کے سامنے موت کے ہاتھوں سے یہ جیون اس نے چھینا تھا۔ یہ اس کی شکتی تھی جس سے یم کے دوت بھی شکست کھا کر لوٹ گئے تھے اور بھگوان جانتا ہے اس رات کے بعد سے میں نے سوائے بہاری کے کسی کو اپنا نہیں سمجھا اگر دیوی چاہتی تو مجھے شنبھو کو لوٹا سکتی

تھی۔ اگر دیوی کی آشا ہوتی تو۔ یہ جو اندھیرے میں ہے اُسے سوائے بھگوان کے کون جانتا ہے۔ میں اور تم اور ہمارا تمہارا سب اندھیرے میں ہیں زندگی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرے کا سفر ہے۔

جب میں نے آئینہ دیکھا ہے تو دیکھتی رہ گئی۔ اور پھر میں نے گھبرا کر آئینہ پرے پھینک دیا۔ کپڑے بدل کر پدمنی کے پاس آئی ہوں تو وہ جاگ رہی تھی اسنے اپنی بانہیں اوپر اٹھا دیں اور میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "شیکھر" سویرے کی پوجا کے لئے مندر جا چکا تھا۔ میری آنکھوں میں سپنوں اور پریم کے رنگ ملے تھے دستی نے دیکھا تو کہنے لگی "بھابی تم تو رات ہی رات میں بدل گئی ہو مانو تمہیں نیا جیون مل گیا ہو۔ کل تک تم اتنی پیلی تھیں کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا اور آج تو تم نئے کھلے پھول کی طرح ہو۔ پھر اسنے جھک کر میرے کندھے سے اپنی ناک لگا دی اور کہنے لگی "ارے یہ نئی باس تم میں کہاں سے آئی ہے تم تو مہک رہی ہو"۔ میں نے اسے کہا "ہٹ تجھے تو ہر گھڑی مذاق سوجھتا ہے بھلا نئی مہک مجھ میں کہاں سے آئی۔ نہا کر آئی ہوں اس لئے۔

دستی نے سر ہلا کر کہا "نہیں بھگوان کی سوگند اٹھوا لو۔ تم تو یوں نکھری ہو مانو ساگر میں سے نہا کر نکلی اندر کے دربار کی اپسرا ہو۔ ارے بھابی تمہاری آنکھوں میں یہ گلابی ڈورے کیسے ہیں۔ پھر وہ خوشی سے تالیاں بجا کر میرے گرد ناچتی رہی اور میں شرم سے لال ہو گئی۔

دوپہر کو "شیکھر" آیا تو کہنے لگا "چمپا تم تو اتنی سندر جان پڑتی ہو مانو دیوی ہو یہ ایک رات میں تم کتنا بدل گئی ہو۔ تمہاری ساری بیماری کیسے دُور ہو گئی ہے؟ میں کہتا ہوں تم روز رات مندر میں پوجا کرنے جایا کرو تو دیوی ماں تم پر بہت ہی کرپا کریں۔ میں کتنا خوش ہوں کتنا خوش"۔ اور اسنے چاہا کہ میرا ہاتھ پکڑے مگر میں پہلو بچا کر ایک طرف ہو گئی اور پدمنی کو بازوؤں میں لے کر پیار کرنے لگی۔

پدمنی بھی میری اس اچانک تبدیلی سے بہت حیران ہو گئی۔ ایک وہ دن تھے کہ میں پہروں دیوار کی طرف منہ لئے لیٹی رہتی اور کسی سے بولتی نہ تھی اب میرا دل ایک دم دنیا کے اتنے پیار سے بھر گیا تھا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے پریم دل کو بھی خیالوں کو بھی گہرائی دیتا ہے۔ میں آج تک کے اپنے اتھلے پن سے شرمندہ ہو رہی تھی مجھے "شیکھر" کے پریم اور اس پیڑا کا جو اسکے پردے میں ہوتی ہو گی پہلی بار احساس ہوا بھوکے پیٹ آدمی کو صرف روٹی کے سپنے آتے ہیں اور جب ہم انتر

بہار وستی کر دیتا ہے تو باہر بھی ہر شے رنگ اور نور میں ڈوب جاتی ہے۔
میں گھر میں ایک تتلی کی طرح گھومتی پھرتی اپنے نئے پن میں آپ ہی مگن وسنتی کے گلے لگتی۔ بڑے بی کو چومتی۔ "شیکھر" کو میں اتنے احسان کی نگاہوں سے دیکھتی اور باندیوں سے پہلے سے زیادہ پریم سے ملتی۔

ہر رات میرے لئے دیوالی کی رات ہوتی تھی۔ ہر رات مندر میں میرے لئے دن ہوتا تھا۔ اجالے میں ہی دیکھتی کہ بانکے بہاری مندر کے ساتھ والے ایک کمرے میں بیٹھا پوجا پاٹ کرتا یا شاستروں کو پڑھتا۔ "شیکھر" گھر آتا تو کہتا "چمپا بہاری کے لئے کھانا اچھی طرح بھیجا کرو۔ بیچارا دن رات اتنی محنت کرتا ہے کہتا ہے مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔"
وسنتی کہتی۔ بہاری بھیا کبھی گھر میں کیوں نہیں آتے جانے کیوں اتنے بیگانے ہو گئے ہیں، باہر پڑے رہتے ہیں۔ بوا آئیں گی تو شکایت کروں گی کہ انہیں جانے کیا سکھا کر بھیجا ہے کہ ہم سے ملنے نہیں آتے۔ کیوں بھیا تمہیں یاد ہے کیسے بھیا مجھے گودوں میں اٹھا کر گھوما کرتے تھے؟

شیکھر کہتا۔ میں تو کئی بار بہاری کو کہتا ہوں پگلے گھر چل آخر ایسا جتن اور اتنی تپسیا کرنے کا کیا فائدہ۔ ہر کام کے لئے وقت ہوتا ہے۔ تیرا ابھی مہاتما بننے کا وقت نہیں آیا۔
پھر اور باتیں ہونے لگتیں۔

میں بڑی بے تابی سے رات کا انتظار کرتی۔ پہلے پہل تو شیکھر بہت خوش تھا کہ چلو کسی بہانے ہی سہی۔ دیوی ماں کی سنگت میں ہی ہی چمپا کا دل تو بہلا جیسے پہر کی وہ زردی اور بے رونقی تو دور ہوئی۔ ہر ایک سے اچھی طرح سے بولتی ہے گھر کے کاموں میں حصہ لیتی ہے۔ گاؤں والوں سے ملتی ہے اس نئی چمپا کو گھر میں چلتے پھرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا۔ وسنتی سے کہتا "دیکھا دیوی ماں نے تیری بھابی کو کتنا بدل دیا ہے یہ سارا پوجا کا پھل ہے۔" اور پھر دیوی ماں کی استتی گانے لگتا۔

بہاری کہتا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو پر رات میں میری ہو۔ میں رات کو مندر میں دئیے جلاتی سیڑھیاں دھو کر دیوی ماں پر نئے پھول چڑھاتی۔ اور پھر پوجا کرنے کیلئے

بہاری کے قدموں میں جھکتی کہ بہاری میرا دیوتا تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ میں اُسے دیکھ کر جیتی تھی۔ پر کبھی کبھار ایک خیال سوئے ہوئے ناگ کی طرح میرے دل میں سر اٹھاتا، ہو سکتا ہے بہاری کی چاہت دکھی ہو اور میں جو اپنا آپ بیچ کر اسکے قدموں میں آن پڑی ہوں میں جس پر ترس کھا کر اسنے گرے پھول کی طرح مجھے دھول میں سے اٹھایا ہے کیا پتہ وہ کبھی مجھ سے روپ کر واپس تارا کے پاس چلا جائے۔ ان خیالوں کا ڈنک میری خوشی میں ماتو زہر بنکر پھیلتا۔ پر یہ سارے خیال یہ ساری اداسیاں ایک پل کی ہوتیں۔ دوسرے لمحے دریا کی بڑی لہر کی طرح اس مدہوشی کا طوفان مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔

وہ راتیں ہیں جو میرے پاس باقی ہیں انہی راتوں کا تیل ہے کہ میری زندگی کا دیا جلانے کو صدیوں کافی ہوگا۔ بہاری کے بعد اگر میرے پاس سہارے کے لئے ان بیتی راتوں کی یاد بھی نہ ہوتی تو کیا ہوتا جانے کیا ہوتا۔

اندھیرے میں تیز باس والے گلاب کھلتے ہمارے چاروں طرف جھنکار رہتی اور مجھے لگتا ہم پر پھول برستے تھے۔ لوگ کہتے تھے ہم نے مندر کو بھرشٹ کر دیا ہے توّں کو جانے یونہ کس شے میں کھائی دیتی ہے پریم سارے دھرموں سے اتم اور ساری شرموں سے اونچا ہے اسکی پدوی تو اس کا شرم ہے۔ اگر دیوی ماں کو یہ سب برا لگتا تھا تو ہم کو آپ مندر سے نکال سکتی تھی زمانے نے کبھی کس کا ساتھ دیا ہے۔

بہاری کے بازو مجھے ستاروں کا ہنڈولا لگتے تھے اور پھر میں تو ندی کا دھارا تھا جو اسکے قدموں میں بہتا تھا اس کی انگلیاں میری ساری سختیاں ساری کٹھورتا پگھلا دیتیں اور میں یوں بہنے لگتی مانو سورگ میں سے آئی جل دھارا ہوں۔

میں کہتی بہاری ایک دیا ہو تو اچھا رہے اور بہاری کہتا تھا تمہاری آنکھوں کی جوت سے تو سارا جگ روشن ہے تم جو آپ روشنی ہو تمہیں دیوؤں کی کیا ضرورت ہے۔

میں کہتی بہاری اندھیرا دشمن ہے اس سے ہوشیار کیوں نہیں رہتے اندھیرا سیاہ سانپ ہے کہ چپکے سے ڈس لیتا ہے۔

اور بہاری میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کہتا۔ پر اندھیرا کہاں ہے یہ اتنی بڑی

بڑی جوت سے بھری آنکھیں یہ تمہارے بدن سے پھوٹتی کرنیں کیا ان سب کے ہوتے تمہیں اندھیرے سے ڈرنے کی ضرورت ہے کبھی ہم دیوی ماں سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھے رہتے ایک دوسرے میں مگن ایک دوسرے سے لگے ہوئے جیسے ہم میں کوئی دوسرا نہ ہو ہم ایک ہی ہوں اور پھر اندھیکار سے دھڑکتے دل سے ڈرتی میں سوچتی یہ سپنا کسی دن ٹوٹ جائے گا۔ اتنی بہت خوشی کا بوجھ کسی نے کبھی اٹھایا ہے؟ دھرتی اس بوجھ سے پھٹ جائے گی۔ مگر ان سارے وہموں کو میں نے جھٹک کر کبھی بہاری سے ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میں بہت دنوں شیکھر کو دھوکا دینے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

راتوں کو گھر سے میرا یوں مندر میں چلے آنا اور اندھیارے میں رہنا اس کی نظروں سے چھپا نہ رہے گا۔ اور پھر بہاری کا بنا کسی کام کے یہاں رُکے رہنا۔ ہے بھگوان کیا بنے گا مگر چار گھڑی سے زیادہ یہ سوچ مجھے پریشان نہ کرتی۔

میری بدلی ہوئی نگاہیں میری چال جیسے کوئی سپنے میں چل رہا ہو۔ بوڑھی باندیوں کی نظروں سے کب تک چھپی رہتی میں گھر میں ہوتی تو دیکھتی باندیاں وسنتی کو لئے کونوں کھدروں میں چھپی باتیں کر رہی ہوتیں میری طرف دیکھتی ہوئی کئی بار وسنتی میرے پاس یوں آتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو پر پلٹ جاتی۔ مجھے معلوم تھا وہ ان باتوں کا جھوٹ سچ جاننا چاہتی ہوگی جو باندیاں کہتی تھیں پر مجھے دیکھتی کہ اپنے میں مگن گیت گنگناتی ہوئی اس کے جہیز میں دئے جانے والے جوڑوں میں کناری ٹانک رہی ہوں اور بہت ہی مصروفیت سے کسی صندوق کو الٹ پلٹ کر رہی ہوں۔ اناج تُلوا رہی ہوں پدمنی کے ساتھ کھیل رہی ہوں۔ پھر اس کے بھائی کے کپڑوں میں بڑے پریم سے بٹن ٹانک رہی ہوں تو وہ میرے پاس کھڑی ہوئی بڑی محبت سے مجھے دیکھتی رہتی اور پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی "میری بھابی تو سچ مچ اتنی اچھی ہے اور اتنی سندر۔"

اور میں کہتی "کیوں وسنتی کیا تجھے یہ سب جھوٹ لگتا ہے مجھے تو تو اپنی بہنوں کی طرح پیاری لگتی ہے تو تو مجھے پدمنی سے بھی زیادہ پیاری ہے جب تو چلی جائے گی تو پھر جانے میں کیا کروں گی۔ تیرے بنا یہ گھر کتنا سونا ہوگا۔ تیری ہنسی کی جھنکار تیری آواز کی مٹھاس کہاں سننے کو ملے گی۔" بیاہ کی بات پر وہ شرما کر بھاگ جاتی۔

آج لگتا ہے سکھ تو ایک سپنا ہے سپنے میں دیکھے رنگ محل کبھی جاگتے میں دکھائی دئے ہیں؟ وہ سب دنوں جب میں زندگی کے پیالے میں سے خوشی کا آخری گھونٹ تک پی جانا چاہتی تھی۔ جل میں ایک سپنے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ بہاری سپنے میں دکھائی دیا ایک جوان تھا سپنا چاہے کتنا ہی لمبا ہو سالوں پر پھیلتا چلا جائے آخر سپنا ہے وہ جب سونے والے کی آنکھ کھلے گی اور وہ ہوش میں آئے گا تو سپنا ٹوٹ جائے گا۔

جس طرح اور سپنوں کے نصیب میں یہ ہے کہ وہ ٹوٹیں اسی طرح میرے نصیب میں بھی آنکھ کھول کر یہ دیکھنا بدا تھا کہ یہاں نہ بہاری ہے نہ مندر ہے۔ دیوی ماں کی مورتی بڑے دکھ سے اپنی ہنسی چھپائے ہوئے ہے اور بڑے لمبے ختم نہ ہونے والے دن ہیں جن میں کام ہے اور "سیکھر" کی نگاہوں کی بے یقینی ہے۔ میں جب اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھتی تو میری رگوں میں خون کی جگہ برف ہوتی اور وہ جس نے کہا تھا کہ تم اندھیرے کی دلہن ہو کہیں نہ ہوتا۔ مندر میں دئے جلا کر آنکھیں بند کئے سوچتی رہتی ہر آہٹ پر کان دھرے اپنے سارے جسم کو مانو کان بنائے کہ کسی کونے میں سے کوئی نہ اٹھتا کہ اس زہر کو جو ہولے ہولے گھل کر میری رگوں میں پھیل رہا تھا ہاتھ مار کر گرا دے آنکھ بند کئے میری جاگتی آتما بھکاری کی طرح اپنا کرمنڈل اٹھائے ایک کونے میں کھڑی تھی کہ کبھی تو وہ ان راہوں سے گزرے گا۔

میری بھول یہ ہوئی ہے کہ میں نے اپنا وہ پھول جو مجھے اس کے قدموں پر سو بکار کرنا چاہئے تھا بچا کر رکھ چھوڑا تھا کہ اس کے ماتھے پر کے تاج میں سجاؤں گی۔ اس کے سر تک میرے ہاتھ پہنچ نہ سکے اور میرا پھول میرے ہاتھ سے گر کر دھول میں مل گیا۔ آج تک اس مٹی میں بکھرے پھول دیکھتی ہوں اور افسوس میری نگاہوں سے آنسو بن کر بھی نہیں بہہ سکتا کہ یہ پھول کسی تاج پر نہ لگ سکا۔ میری بھول ہے سب میری بھول ہے اور بھگوان میری بھول کی سزا مجھے کتنی بڑی ملی کہ میرا وہ پیالہ جس میں کبھی امرت تھا زہر سے بھرا ہے اور ہر روز مجھے اس پیالے میں سے گھونٹ گھونٹ پینا پڑتا ہے اگر ایک ہی بار اسکو ختم کر سکتی تھی تو مگر نہیں مجھے یہ سب بھوگنا ہے کہ میں نے زہر بنا جیون اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔ بھدری کے اور میرے درمیان کتنے جنموں کا فاصلہ جس سے آگے اور پیچھے ہونے کی میری مجال نہیں۔

ہر ایک آدمی کے حصے میں کچھ خوشیاں آتی ہیں اور کچھ رنج۔ میں نے اپنے حصے کی خوشیاں ان چند راتوں ہی ختم کردیں۔ پر یہ آج تک سمجھ نہیں آتا۔ ان راتوں میں یہ کیوں لگتا تھا کہ یہ خوشی میری باقی زندگی کے لئے کافی ہے۔ میں اس خوشی کی خاطر کئی نرک بھوگ سکتی ہوں۔ میں سارے سنسار سے مقابلہ کرسکتی ہوں بھلا آج تک سنسار کے مقابلے پر کوئی ڈٹ کر جیت سکا ہے۔ سب ہی گر گئے ہیں اور ہم دونوں بھی گر گئے۔

جب وسنتی کا بیاہ ہوا ہے تو تارا بھی آئی تھی اور لوا کی بہوئیں بھی۔ تارا اس طرح پریم سے مجھ سے ملتی۔ پہلے دنوں کی طرح میرے گرد چکر لگاتی بھابی کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوتی۔ پھر کاموں میں مگن، اگر ان دنوں وہ میری مدد نہ کرتی تو میں شاید بری طرح گر جاتی۔ بہاری کبھی اندر آتا بھی تو بس دو لمحے تارا سے بات کرتا اور چلا جاتا اس کی آواز سن کر میری رگوں میں ٹھنڈک سی بھر جاتی اور گھبراہٹ میں بھی ایسی گم سم ہو جاتی جیسے بیہوش ہوں۔ تارا کہتی بھابی بھلا یہ بوجھ کس طرح برداشت کرسکتی ہے اکیلی پر کرنا کام ہے۔ مہینوں سے کام کر رہی ہے۔ بیمار نہ ہو گی تو کیا ہوگا۔ شیکھر بھاگا ہوا آتا جہاں سے ہوتا وہیں سے بلوایا جاتا۔ مگر میں بہت بیزار ہو جاتی۔ شادی کے کاموں میں لوگوں کی فکر میری وجہ سے اور بڑھ جاتی۔

ماں بھی آئی تھی بھیا اب لگتا تھا گبرو جوان ہے اسے دیکھ کر میرا جی بڑا اداس ہو جاتا کہ میں اس کی بہن ہوں اگر کبھی اسے پتہ چل گیا تو جانے کیا ہو گا۔ اسے کتنا برا لگے گا۔ میں بہاری سے لگ کر اپنے آپ کو دھرتی کا ایک ایسا ٹکڑا سمجھتی تھی جس پر بھگوان نے آپ پاؤں دھرا ہو۔ اور بھیا کو دیکھ کر میرا دل کانپ جاتا۔ صرف اسے دیکھ کر لگتا مندر میں دیوی ماں کے سامنے میں اور بہاری ڈاکوؤں کی طرح شیکھر کے حصے میں سے چرا نے اور بھیا کی عزت میں سیندھ لگاتے رہے ہیں۔ بھیا کو دیکھ کر مجھے کیوں ایسا لگتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت چھوٹا تھا پر میں اس سے ڈرتی کیوں تھی۔

وسنتی وداع ہو گئی تو مجھے گھر ایک دم بہت سونا لگنے لگا۔ مجھے معلوم تھا باندیاں جو باتیں کرتی تھیں صرف وسنتی ہی ان کا منہ بند کرسکتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ دنیا کے اور میرے درمیان ایک حفاظت کی دیوار تھی۔ کمزور سی دُبلی کاسی لڑکی۔ اس نے بہت کچھ سننے پر بھی

کبھی مجھے نہیں کہا تھا۔ سنی سنائی باتوں کو جھوٹ سمجھ کر ٹالا تھا۔ وہ طوفان کے آگے سنہرہ کی طرح تھی۔
ماں نے ایک دن سب سے الگ مجھ سے کہا "چمپا تجھے گھر کے سکھ اور اپنے من کے چین کی ضرورت نہیں تو کم از کم ہماری عزت کا خیال تو کیا کر۔ دنیا کی آنکھیں شنکھر کی طرح بند نہیں بہت کھلی اور تیز ہیں۔ تو نہیں چاہتی کہ میں یا تیرا بھیا اپنا سر اٹھا کر چلیں۔ کیا تو چاہتی ہے کہ اس عمر میں تیرا ابا باڈ ذ کر مر جائے۔ اری چمپا ہوش میں آ۔ اگر تارا کو پتہ چل گیا تو کیا کہے گی۔ تیرا خیال ہے یہ باتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں کوئی تارا کو نہیں بتائے گا تو سوچتی ہے تیرے ڈر سے لوگ تیرا راز چھپا کر رکھیں گے تو یہ تیری بھول ہے۔ بیٹی لوگ تو بھگوان کا راز بھی کہہ دیں۔
میں سر جھکائے سن رہی تھی۔
میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ کہتی گئی "کیا تو سوچتی ہے مندر کو بھرشٹ کر کے تو اور بہاری بچ جائینگے۔ بھگوان کی سوگند تم پر دیوی ماں ضرور غصے ہوگی۔ اری تجھے لاج نہیں آتی تو ہم پر دیا کر آخری عمر میں ہمارے سفید بالوں میں کیوں کالک لگوائے گی۔ پھر تیرے اتنی سندر اور موہنی بیٹی ہے۔ آدمی کیا اپنے لئے ہی جیتا ہے تو میری بیٹی ہو کر ایسی ہوگی۔ تو نے میرا دودھ پی کر اتنا بڑا اپرادھ کیا۔" اور پھر وہ رونے لگی میں اٹھ کر جانے لگی تو اسنے میرا پلو پکڑ لیا اور کہنے لگی "چمپا تو شنکھر سے نہیں ڈرتی تو اپنے بھیا سے ڈر وہ تجھ سے چھوٹا تو ہے پر بہت غصہ ور ہے۔ وہ تجھ سے رو کے نہیں رکے گا اور پھر نہ جانے کیا ہو جائے۔ اری میں تیرے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی بہاری میں ایسے کیا لال لگے ہیں جو تو شنکھر کو چھوڑ کر اسے چاہنے لگی ہے۔ جس پتی نے بھگوان کے سمان تجھے سارے سکھ دیئے تو انہیں تج کر پاپ کے راستے پر کیوں چلنے لگی ہے۔ تجھ پر کس نے جادو کر دیا ہے۔ چمپا تیرا بھیا جب سن پائے گا تو وہ مجھ سے نہیں رکے گا۔ پھر نہ کہنا مجھے خبر نہ کی اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔ پھر اسنے طاق میں رکھی بھگوان کرشن کی مورتی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ بھگوان تو گواہ ہے میں نے اسے سب برا بھلا سمجھایا ہے۔"
اور مجھے لگا جیسے وہ بہاری کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو۔"
ہرتری کی مسکان میرے ہردے میں تیر کی طرح اتر گئی۔ ٹکٹ لگائے بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا بھگوان اور ستیش ناک نے میرے اندر گہرے سمندر میں زور سے پھینک کر

ماری۔ اتنی زور سے کہیں ہل گئی۔ بہت دنوں سے میں نے بہاری کو نہیں دیکھا تھا۔ میں برتن تھی اور راگوں سے گھرے اور کوئل کی کوک سے بھرے اس گھر میں اکیلی تھی۔

باہر بسنت گانے والوں کی ٹولیاں تھیں اور مندر میں پچھلے سال سے بڑھ کر دھوم تھی۔ ہوا میں رنگ اور مہکار تھی۔ مست سادھو ناچنے والے اور بے سدھ ہو کر گر پڑنے والے بھگوان کے بھگتوں کی بھیڑ تھی۔ گھاٹ سے لے کر کھیتوں تک اور راستوں پر آموں کے بور کی باس سے پنچھی اور آدمی سب مست تھے۔ کنواریوں کی چنریوں میں رنگ نکھرے ہوئے ان کے چہروں پر چمکار اور ہنسی کی چھوٹ جیسے کرنوں کا دھارا بہے۔ ماگھی دن رات یاتریوں کو اس پار سے اس پار لاتے اور ان کے گیت پانی کو چھو کر آکاش تک گونجتے ہوئے دھرتی نے نیا روپ بدلا تھا۔ درختوں کی چمکتی ہوئی نئی کونپلیں اور نکھرے ہوئے آکاش کے نیچے کروٹیں لیتی ہوئی زندگی پر ماں کو میں دیکھتی اداس سی جیسے ان چند دنوں میں مرجھا گئی ہو۔ بوا دسنتی کے دوبارہ سسرال جانے کے لئے رکی ہوئی تھی۔ رات آتی تو میں انگاروں پر لوٹتی جانے کب میں بہاری کو دیکھوں گی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیجنا اور اسے کسی جگہ بلوانا میرے لئے ممکن نہ تھا اور مندر کے اندر باہر اتنے لوگ تھے۔

کوئل آموں کے جھنڈ میں بولتی تو میری آنکھوں میں آپ سے آپ آنسو آ جاتے۔ بہاری مجھ سے یوں آنکھیں چرا کر چلتا جیسے کبھی اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ اجالے میں میں ایسے نقطے کی طرح جو دھوپ میں مل گیا ہو اسے دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ تارا کتنی بھاگوان تھی جس کو ایسا دیوتا پتی ملا تھا اور جو اسے چاہتا بھی تھا۔ سورگ سے نکالے ہوئے کی طرح مجھے کسی طرح چین نہ آتا۔ بھیا آ کر بیٹھتا تو میں اس سے بھی دل لگا کر بات نہ کرتی۔

لوگ کہتے ہیں اس لئے اداس ہوں کہ دسنتی اب اس گھر میں نہ ہوگی۔

دسنتی سسرال گھر سے پہلی بار لوٹ کر آئی ہے تو بہت خوش نہ تھی ایسے بھکاری کی طرح جس کو بس پیٹ بھر کر روٹی کھانے کو مل ہو۔ اس کی کاجل سے کٹیلی بنی آنکھوں میں بے رونقی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ جب تک آس ہوتی ہے انسان جئے جاتا ہے۔ پر جب آگے پیچھے کچھ نہ رہے اور جو ہو وہ تمہاری جھولی میں آن پڑے تو؟

دوسروں کے سامنے وہ بہت خوش رہتی۔ تارا بھابی سے گھُس گھُس کر باتیں کرتی، پدمنی سے مل کر پینگ بڑھاتی، اپنے لہریا دوپٹے کو جھنکاتی، وہ مجھے ایسی بہار لگتی جس کی آنکھوں میں ویرانی کا نقش ابھی سے جما ہو اور میں دل ہی دل میں پرارتھنا کرتی بھگوان تو نے اس گھر میں کسی کے لئے شانتی نہیں لکھی۔ کیا ہم اپنی اپنی راہوں سے آپ مکتی کے لئے کھوج کریں۔ بھگوان تو یہ دیا کیوں نہیں کرتا۔ بھگوان!

سب لوگوں سے مل کر ایک رات جب شیکھر کسی کے ہاں پوجا میں گیا ہوا تھا اور تارا بوا اور ماں کے ساتھ باتوں میں مگن تھی وہ میرے پاس آئی اور پہلے چپ چاپ بیٹھی اپنے پلو کو انگلیوں میں مروڑتی رہی اس کے بعد اٹھ کر میرے گلے سے لگ گئی اور ہچکیوں سے مجھے اس کا سانس رُکتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

میں نے کہا وسنتی ارے ہوش میں آ تو رو کیوں رہی ہے ساری دُنیا کی لڑکیاں ماں کے گھر سے وداع ہو کر سسرال جاتی ہیں کیا میں اس گھر میں ایسے نہیں آئی تھی۔

وسنتی نے کہا "بھابی تمہیں وہ گھاٹ والے مہاتما یاد ہیں انہوں نے ٹھیک کہا تھا" اور میں سے کیا بتاتی کہ وہ مہاتما بھلا مجھے بھول سکتے تھے۔

میں نے کہا "ضروری نہیں کہ باغ میں جا کر پہلے ہی وہ سب پھول دکھائی دیں جو ٹوٹ کر جھول میں گرنے والے ہیں"

اور وسنتی نے اپنے آنسو پونچھ کر کہا "کیوں بھابی اس بھیڑ اور شور میں بہار ی بھیا سے تو ملنا ہوا نہ ہوگا؟"

جس پریم کو میں نے سالوں اپنا خون دے کر پالا تھا اس سے انکار کرنا میرے بس کی بات بھی پھر وسنتی تو بہت کچھ جانتی تھی شاید اس سے بھی زیادہ جتنا میں سمجھتی تھی کہ وہ جانتی ہوگی۔

وسنتی پھر کہنے لگی "بھابی تم کسی کو اپنے سے اونچا سمجھ سکی ہو یہ بھی بہت ہے۔ اس جیون میں ہر کسی کو تو یہ خوشی نہیں مل سکتی بھابی۔ اور پھر تم اور بہاری بھیا تو ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہو۔ میں نے جب جب تمہیں دیکھا ہے تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر میرا جی ناچ اٹھا ہے۔ جیسے تم رادھا ہو اور وہ بھگوان کرشن ہو۔ سپنے میں دیکھی سندر مورتیوں کی طرح۔ بھابی ایسی

راتیں ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں ہوتیں۔ میں مر بھی جاؤں تو وہ پہلی رات نہیں بھول سکتی جب تم مندر میں دیوی ماں کے سامنے بہارتی بھیا سے ملی تھی۔

میں نے کہا۔ اس رات تو میں سوچتی تھی مندر میں موت ہے اور میں ہوں۔ تم کہاں تھیں۔

بسنتی نے ہنس کر کہا مندر کا دوار کھلا تھا اور ہر کسی کو تمہاری طرح پوجا کا ادھیکار ہے۔ ہے نا بھابی۔

میرے من میں ایک شک نے زخمی سانپ کی طرح سر اٹھایا۔ کہیں بسنتی بھی بہارتی کے لئے تو وہاں نہ جاتی تھی۔ کیا وہ بھی بہارتی کو پوجتی ہے؟

تم کو معلوم ہے بسنتی میں تو بھگوان سے اپنی پوترتا کے لئے موت کا سہارا مانگنے گئی تھی تمہیں تو سب معلوم ہے بسنتی نے پھر کہا۔ دیکھو بھابی تم یوں کیوں گھبرا رہی ہو کیا پریم اور موت میں کوئی فرق ہے؟ اور پھر تمہیں تو اس رات نئی زندگی ملی تھی۔ دیوی ماں نے تم کو جو کچھ دیا وہ کسی کو کب ملتا ہے۔ اس رات سولہ سنگار لئے باریک ساڑھی میں تمہارا روپ اتنا نکھرا تھا کہ اس سے پہلے میں نے کسی روپ وتی کو ایسا نہیں دیکھا۔ تمہارے ہاتھوں میں لگا رنگ تمہاری آنکھوں میں کاجل کی دھار اور پھر وہ خوشبو جیسے دھرتی کی ساری پوترتا نے عورت کا روپ دھار لیا ہو۔ تمہارے گھنیرے کھلے بال اور تمہارے سفید پاؤں۔ بھابی اس رات تم سر سے پاؤں تک وہ روپ تھیں جو بھگوان کو بھی بس میں کر لے بہارتی بھیا تو پھر بہارتی تھے۔

بسنتی میں نے بڑے دکھ سے کہا اپنا آپ بلیدان کرنا بہت مشکل ہے۔

اور بسنتی نے بڑے دکھ سے کہا۔ بلیدان کرنا تو بہت لوگ جانتے ہیں پر سویکار کسی کسی کا ہی ہو پاتا ہے۔ تمہیں تو دیوتا ملا ہے کس قسمت کی جلنا ہے؟

میں نے کہا جتنا یوں پوچھو جتنا کا ہے کی نہیں۔ تم دیکھتی نہیں ہو بہارتی گھر میں آتے ہیں تو میری طرف دیکھتے ہی نہیں، تارا سے بات کر کے چلے جاتے ہیں اور پھر دو ایک دنوں میں سب لوگ چلے جائیں گے۔ تم بھی اور وہ بھی اور پھر پیچھے دم گھونٹنے والا چپ چاپ کا سناٹا ہوگا۔ اور اس بسنتی رات کے بعد جب لمبی دوپہریں آئیں گی تو یہ سوچ کر میں بہارتی سے بات تک نہ کی کتنا دکھ دے گی۔ جانے پھر کب ملنا ہو اور مل سکیں بھی کہ نہیں؟ بسنتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر

کہا یوں نراشں کیوں ہوتی ہو بھابی دو ایک دن تو تالا یہاں ہے میں کچھ سوچوں گی۔ وہ بہاری کی اور میری آخری ملاقات تھی۔ بھگوان جانتا ہے اس کے بعد وہ صورت میری آنکھوں سے یوں چھپ گئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ سوچتی ہوں تو لگتا ہے ایک سپنا تھا میں نے سوتے میں ساری زندگی کی خوشیاں اور اپنے بھاگ کے سکھ بھوگ لئے کہ جب آنکھ کھلی ہے تو آج تک اندھیرا ہے۔ میں اس اندھیرے میں اکیلی ہوں اور وہ جو کہتا تھا تم اندھیرے کی دلہن ہو دن میں تم شیکھر کی ہو مگر رات میں میری ہو اب کہیں نہیں ہے۔ میں اس سہاگ کی سیج پر اکیلی ہوں اور ہر آہٹ پر چونک کر دیکھتی ہوں کہ شاید وہ اب میرے قریب آئے مگر نہیں وہ چاپ قریب نہیں آتی۔ کوئی نہیں ہے یہ میں ہوں اور یہ اندھیرا ہے آگے اور پیچھے سرسراتا ہوا اور ہر گھڑی ڈستا ہوا اندھیرا۔

اس رات باغ میں نئی گھاس کی میٹھی باس اور پھولوں کی پاگل کر دینے والی تیز سوگند تھی۔ میں وسنتی کے بتائے ہوئے راہ پر ننگے پاؤں جارہی تھی۔ اور آنے والی گھڑی کی بیہوشی مجھ پر ابھی سے چھا رہی تھی آکاش میں چاند ہلکے سفید بادلوں کے پردوں پر سے ابھرتا ڈوبتا جارہا تھا آموں کے جھنڈ میں سے خوشبو نکل کر میرا سواگت کر رہی تھی اور سایوں کا اندھیرا مجھے اندھیرے کے بیچ کا پھیلا ہوا رنگ لگتا تھا ہرا ہرا لہے ہوئے سرسرا رہی تھی اور پتوں پر سے رنگتی لگتی تھی۔ چاندنی بڑی پھیکی تھی اور گھڑی گھڑی اوٹ میں ہو جاتی تھی۔ جیسے مجھے چھپ کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پتلا سا چاند کبھی درختوں کی ٹہنیوں میں اٹک جاتا اور کبھی ذرا سے پتے کے پیچھے گم ہو جاتا۔ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اندھیرا اور چاندنی۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ میں بہاری کو اس سے بعد کبھی نہیں دیکھوں گی تو شاید میں اس سے وہ سب کچھ کہتی جو میں اب ہر گھڑی جی میں دہراتی ہوں۔ تالاب کے کنارے گرے ہوئے درخت کے تنے پر ہم دونوں بیٹھے تھے اور دنیا ہمارے لئے کوئی پرانی کہانی تھی۔ وہ مجھ سے ان سب دنوں کی بیتابی کی باتیں کہہ رہا تھا۔ اتنے مہینوں کے بعد ہم ایک دوسرے میں دو جھرنوں کی طرح مل جانا چاہتے تھے ہمارے سانس بے ترتیب اور ہمارے ہاتھ سُن ہوئے جاتے تھے۔ میرے گھنیرے سیاہ بال ہم دونوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور بھوم

دونوں چپ تھے۔ میں مندر میں گزاری اُس پہلی رات کی طرح آخری رات بھی پگھل کر اس کے خون میں مل جانا چاہتی تھی۔ میرا اپنا وجود کہیں نہیں تھا۔ ہر طرف بانکے بہاری تھا۔ میرا دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا تھا اور میں اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی اسکے قدموں میں مرنا چاہتی تھی یہ بھرپور چاہت یہ خوشی جیسے اسکے بعد کچھ تمنا کرنے کو باقی نہ رہا ہو کچھ کہنے کو اور چنتا کرنے کو باقی نہ رہا ہو، اگر اس گھڑی میرا دل ٹھہر جاتا رُک جاتا اور ہم دو بھونروں کی طرح تالاب کے کنارے گر جاتے تو ہم مجھے کوئی غم نہ تھا۔ مگر موت پریم سے شکست کھا جاتی ہے۔ جہاں پریم ہو وہاں موت کہاں گھس سکتی ہے۔ اور اس رات کے بعد آج تک تمنا کرنے اور کہنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔

جب تالاب کے دوسری طرف بہاری نے قدموں کی چاپ سنی جیسے سوکھے پتوں پہ کوئی چل رہا ہو تو میں نے کہا بہاری تم اتنے دنوں بعد مجھے ملے ہو اگر ان چاپوں کو سننے کے لئے سمے کھوتے رہے تو شاید ہمارے من کو کبھی شانتی نہ ہو گی۔

بہاری نے کہا تھا۔ چمپا اتنی خوشی میں بھی کیوں بھولتی ہو کہ دُنیا کا وار سخت ہوتا ہے۔ میں نے کہا میں تمہارے جیسے دیوتا کے سائے ہوں تمہارے بازو قلعے سے زیادہ مضبوط ہیں مجھے کسی شے کا ڈر نہیں کسی بات کی چنتا نہیں۔

اور پھر وہ امرت زہر بن گیا۔ وہ گھڑی گزر گئی اور اس کا سایہ اندھیکار بنکر آج تک میرے سہاگ کے لکھے کو چھپائے ہوئے ہے۔

ماں جب جانے لگی ہے تو اسنے مجھے کہا چمپا تجھے اپنے سہاگ اور گھر کی نہیں تو اسکی تو چنتا ہونے چاہیے جس کے لئے تو نے لاج شرم سب چھوڑ دی ہے۔ چمپا میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ دُنیا سے ڈرتے رہنا اچھا ہوتا ہے۔ بہت آگے اور اندھیرے میں بڑھنے والے جب ایک بار ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں تو سنبھل نہیں سکتے۔

میں نے ذرا غصے سے کہا "تم کیا کہتی ہو ماں میں نے ایسا کیا پاپ کیا ہے؟

ماں اپنے ہاتھ ملنے لگی اور بولی "چمپا اب تیری بربادی اور اجڑنے میں کوئی وقت باقی نہیں اری پاپن تجھے اس گھر پر بھی دیا نہیں آتی۔ میری کوکھ کو آگ لگ جاتی اور میں تجھے پیدا ہی نہ کرتی تو اچھا تھا۔ تجھے خیال تھا کہ باغ میں اس درخت کے تنے پر بیٹھے تجھے کسی نے

نہیں دیکھا۔"

"بھماں" اور ماں نے کہا بس میں اور زیادہ کیا سنوں گی۔ بھیا نے تجھے دیکھا ہے۔ اسے اس کا کیا حال ہوا اس کی خبر ہے۔

تب مجھے لگا میں نے بھیا کو دو تین دن سے کہیں نہیں دیکھا۔ وسنتی بھی چلی گئی تھی۔ بہارتی اس سے اگلے دن ہی تارا اور بُوا کے ساتھ جا چکا تھا۔ پھر ماں بھی چلی گئی اور میں ڈری کانپتی پھول میں رہنے والی راجکماری کی طرح کسی روشنی کی راہ دیکھتی رہی کسی آس کا سہارا لینے کے لئے۔ جانے اب بہارتی سے کب ملنا ہو۔ میرے دامن میں بندھے موتی کھل کر سب بکھر چکے تھے۔

۷

شیکھر اس دن دیوانوں کی طرح دالانوں میں گھومتا پھرتا تھا اور اپنے بال نوچتا تھا جس دن لو کے ہاں سے سویرے سویرے آدمی آیا ہے۔ میں گُم سُم بیٹھی تھی اور مجھے سوجھ نہیں رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ دالان میں تیز دھوپ میں سے اٹھا کر جب باندیوں نے مجھے اندر کمرے میں لٹایا ہے اور ٹھنڈے پانی سے بھگو کر پنکھا جھلا ہے تو میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتی تھی سب چپکے چپکے سُبکتے ہوئے اور اداس تھے اور مجھے بھول چکا تھا کہ شیکھر سویرے سے جا چکا ہے اور بہارتی کی گردن کسی نے تیز چھری سے کاٹ دی ہے وہ گردن جس پر سے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی وہ شان سے اونچی اٹھی ہوئی اور سر جو غرور سے نہیں یونہی دیوتاؤں کی طرح سیاہ بالوں کے تاج سے اتنا سندر لگتا تھا۔ اس سر کو انہوں نے الگ کر دیا تھا جو سر میرے کندھوں پر ٹِکا رہتا تھا۔ میں دائیں بائیں دیکھتی اور کہتی "بہارتی نہیں ہے" اور دیکھنے والی ماما نیاں افسوس سے کہتیں بہو کا دماغ چل گیا ہے۔

وسنتی جب شملہ کو آئی ہے تو اس کا رنگ یوں زرد تھا جیسے اسکے کندھوں پر کسی مری ہوئی عورت کا چہرہ لٹکا دیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی "بھابی لیگی بن کر کیا تم افسوس زیادہ کر سکتی ہو۔ تمہاری انہی باتوں نے تو بہارتی بھیا کی جان لی ہے اور اب دنیا کو تماشا دکھا رہی ہو۔ تمہارا پریم گہرا نہیں ہے تم صرف پریم کا سکھ جانتی ہو۔ اس کی پیڑا سے واقف نہیں ہو۔ تم نے جس

تنے کو چاہے بل سے صندسے پالیا ہے اس لئے تم نراش ہونا نہیں جانتیں "

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی گئی یہ وہی وسنتی تھی جو میرے سامنے بچی سے بڑی ہوئی تھی جو مجھے پدمنی کی طرح پیاری تھی اور جو مجھے پریم کرنے اور آس نراس کا سبق دے رہی تھی۔

میں نے کہا وسنتی تم غلط سوچتی ہو میں نے اتنے دنوں نراشش اور دکھ کے ساتھ گزارے ہیں تم نہیں جانتیں۔

وسنتی نے اسی طرح کہا جب آگے کبھی کوئی آس نہ ہو تو تم نراشش ہونا جانو تو میں سمجھوں۔

وہاں کوئی خبر نہ آئی جس کو بھجوایا جاتا وہیں کا ہو رہتا۔ پھر شنکر نے پیغام بھیجا کہ بہاری کی حالت سدھر رہی ہے اور تھوڑی آس ہے شاید وہ تندرست ہو جائے اور چند مہینوں میں ٹھیک ہو جائے۔ وسنتی بھی اپنی سسرال جا چکی تھی۔ گھر کے کاموں سے نمٹ کر میں ایسی راتوں میں جب تیسری چوتھی رات کا چاند باغ پر سے کھسکتا اور پتوں کی اوٹ میں چھپتا تالاب پر آتا تو اس گرے ہوئے درخت کے تنے پر جا بیٹھتی اور بس پانی میں جھانکتی رہتی ان گہرے سایوں کو دیکھتی اور بیٹھی رہتی یہاں تک کہ نرم ہوا چلنے لگتی اور چڑیاں ڈال ڈال پات پات چوں چوں کرتیں، اور سویرے کی سرخی پورب میں سے ابھرتی۔

شنکر واپس آ گیا۔ بہاری کی حالت سنبھل گئی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ کتنا منہ نہیں تنے سندر اور ہنس مکھ بہاری کا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ اسنے اپنے زور کے بل پر بھی کسی کو نہیں دھتکارا۔ اور میں کھیا کا سوچتی جس کو میں نے مہینوں سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کی باتیں میرے کانوں میں اسی طرح سنائی دیتیں اور پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی رہتی۔

پھر سنا بہاری کے ٹھیک ہونے کی خوشی میں تو انے اپنے گاؤں میں بہت بڑی پوجا کروائی ہے۔ ماں کے ہاتھ کھیا کا پیغام ملا کہ تمہارے وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں اگر گئیں تو میں تمہیں بھی کاٹ کر رکھ دوں گا۔

میں اس دن جب ہم سب تیار تھے اور دروازے سے نکلنے والے تھے مجھے اپنا دل یوں ملتا لگا جیسے بس ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل ہی تو جائے گا۔

میری وجہ سے بسنتی بھی رک گئی۔ شیکھر پدمنی کو لے کر چلا گیا۔

پھر ساری باتیں یوں تیز تیز ہوئیں جیسے آندھی چلنے لگے اور میں اُس تیز ہوا کے ساتھ اُڑ کر ہنگم علی ہے تو یہاں پڑی تھی۔

وہ گھر مجھ سے چھوٹ گیا جو میری آشا اور نراشا کا ساتھی تھا اور پدمنی جسے کو میں نے کبھی گھوم کر نہ دیکھا تھا جو سدا میرے پیار کی بھوکی رہی تھی۔

بسنتی کہتی تھی "بھابی تم بھیا کی بات کو کیوں اتنا برا سمجھتی ہو۔ انہیں گھر آنے دو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ آپ سے آپ ہر بات درست ہو جائے گی تم بس تھوڑے دنوں اور رہ سکو تو کیا تمہیں مجھ پہ وشواس نہیں ہے۔" مجھے اس پر وشواس تھا مجھے شیکھر پر بھی وشواس تھا پر مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔

جانے میرے اور بہاری کے راز کو کتنے لوگ جانتے تھے؟

شیکھر میرا پجاری! اور اس نے اپنی مورتی کو اپنے ہاتھوں ہی توڑ دیا۔

اس کی طرح پدمنی کو بھی مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میری صورت کو دیکھتی تو بھروسا رکھتی تھی۔ جب شیکھر کے گھر میں سوتیلی ماں کے ہاتھوں دکھ اٹھا اٹھا کر وہ مری ہے تو مجھے اسکی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔

شمشان میں بیٹھی میں پاگلوں کی طرح اُس راکھ میں پدمنی کی وہ آنکھیں ڈھونڈتی رہی جن کی روشنی اس راکھ میں مل گئی۔ اپنے پاؤں چومنے والے شیکھر اپنے جیون کے ساتھی اپنے پتی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جب چتا کو آگ دکھائی گئی ہے تو جو سفید بالوں اور سفید داڑھی والا بوڑھا کھڑا تھا اور اپنے ہاتھ مل رہا تھا وہ کوئی اور ہوگا۔ جانے کون ہوگا۔ پدمنی کے لئے جب میری آنکھ سے آنسو نہ نکلا تو اسے رونے والا بھلا اور کون ہوتا۔

اور بھیا نے آج تک مجھ سے بات نہ کی۔

پھر سنا ایک سال بعد جب اُسکے زخم چھوٹ گئے تھے اور وہ تارا پر جان دینے لگا تھا، پچھلے پاپوں کا پرائشچت کرنے والا تھا بہاری اچانک مر گیا۔ یوں جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے کوئی نازک پھول شاخ سے نیچے آ رہے۔

میں اُس دن بھی نہیں روئی اور افسوس نہیں کیا۔ بھلا کوئی سپنے میں دیکھی صورتوں کے لئے روتا ہے۔

اس گھڑی سے مجھے اور بہت سی چیزوں کی طرح بھگوان کی دیا پر بھی وشواس نہیں ہے وہ ایک گھڑی دیتا ہے تو دوسرے لمحے چھین بھی لیتا ہے۔ پھر ایسے بھگوان سے کوئی کیا مانگے۔

اور یوں اوم کے آسن پر جھکتے ہوئے میں پرارتھنا کرنا چاہوں بھی تو کچھ مانگ نہیں پاتی۔ میرے ہونٹ ہلا کرتے ہیں پر دل خالی رہتا ہے۔

نجم فضلی

کار سے اتر کر اس نے چاروں طرف مسرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ اسکے قدموں میں سبزہ کا نرم فرش تھا۔ سامنے جامن کے کئی درخت کالی کالی جامنوں سے لدے کھڑے تھے۔ انکے بعد بہت سے بیری کے درخت اپنی لمبی لمبی شاخیں پھیلائے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے جھوم رہے تھے۔ اس سے کچھ پرے کھجور کے بہت سے درخت ایک چھوٹے موٹے جنگل کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ جن میں نارنجی کھجوروں کے بڑے بڑے گچھے لٹک رہے تھے۔ اس باغ کے باہر چاروں طرف ریگستانی کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اپنے ساتھ کھڑی ہوئی اپنی بیٹی سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ اتنا بوڑھا نہیں تھا کہ اسے چلنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی لیکن وہ سائرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ وہ اس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

ایک بڑے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی۔ ساتھ لایا ہوا سامان جمع کر دیا گیا۔ اور اسکے ساتھ آئے ہوئے اس کے بچے بھتیجے ادھر ادھر پھیل گئے۔ باغ میں داخل ہو کر اسنے دیکھا کہ زمین پر ہلکے گلابی رنگ کے سوکھے پتوں کا ایک فرش بچھا ہوا ہے۔ اس فرش پہ آہستہ آہستہ چلنا اسے بہت ہی آرام دہ۔ بہت رومانی معلوم ہوا۔ اوپر دور دور تک پھیلی ہوئی بڑی اور موٹی شاخیں اور ان میں لگے ہوئے ہرے چمکدار ہوا سے ہلتے اور بہت ہلکی آواز پیدا کرتے ہوئے پتے اور نیچے سوکھے پتوں کا نرم فرش۔ زمین پر سوائے ان پتوں کے کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ آ کر دری پر لیٹ گیا۔

باغ تقریباً پانچ چھ ایکڑ زمین پہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لڑکے یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اسے تنہائی پسند ہے اسی لئے وہ اسے سامان کے پاس چھوڑ کر دور نکل گئے تھے۔

سائرہ نے اسٹو جلا کر چائے بنائی۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت اس کے پاپا کو چائے کی ضرورت ہوگی
اس نے اپنا پائپ سلگایا اور سکون سے لیٹا اوپر پھیلے ہوئے درختوں کی شاخوں اور ان کی گنجان
پتیوں کو دیکھنے لگا۔ جن سے سورج کی کرن کہیں کہیں سے ہی گذر پاتی تھی۔ پھر وہ موٹی موٹی
شاخوں سے لٹکتی ہوئی ہوائی جڑوں کو دیکھنے لگا۔ جو جگہ جگہ کافی تعداد میں لٹک رہی تھیں۔
ان جڑیں زمین میں جم گئی تھیں۔ ان میں پتیاں نکل آئی تھیں اور وہ بذاتِ خود درخت بن گئی
تھیں۔ پھر اسے اور غور کرنے پر پتہ چلا کہ آس پاس جو کئی درخت نظر آرہے ہیں وہ دراصل
ایک ہی درخت ہے۔ سب سے پرانے درخت کی ہوائی جڑیں خود درخت بن گئی ہیں۔ وہ پانچ
درخت جو بیچ سے الگ الگ معلوم ہوتے ہیں دراصل ایک ہی درخت ہے۔ انکی شاخیں کہیں ایک
دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑا درخت جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے اس کی عمر
ختم ہو چکی ہے۔ اور یہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ پھر یہ پانچوں درخت الگ الگ ہو جائیں گے۔
پھر ان کی ہوائی جڑیں بڑھیں گی اور ایک ایک کے پانچ پانچ چھ چھ درخت بن جائیں گے۔
۔۔ اسنے سوچا ۔۔۔۔ یہ درخت اس دنیا کی طرح پرانے ہیں اور ان کا نسلی سلسلہ بھی بالکل انسانوں
جیسا ہے۔ پانچ چھ بچوں کے درمیان ان کا باپ ایک دھاگے کی طرح اپنی زندگی تک ان سب
کو ایک ساتھ پروئے رکھتا ہے۔ مگر جب یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا ہے تو سب الگ الگ ہو جاتے
ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ خود ایک دھاگے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہ
سلسلہ ازل سے چلتا آیا ہے اور ابد تک چلتا رہے گا۔

سائرہ نے اسے چائے بنا کر دی۔ خود پی اور تھرماس میں بھر کر رکھ دی۔ اس کے بعد قریب
ہی ایک نیچی لٹکتی ہوئی ہوائی جڑوں کے نچلے سروں کو آپس میں گرہ دے کر اسے جھولے کی شکل
دے لی اور اس پر آہستہ آہستہ جھولنے لگی۔ وہ چونکا۔ کہیں یہ جڑیں ٹوٹ نہ جائیں اور اسکی
بچی کو چوٹ آجائے۔ اسنے اوپر دیکھا اور اطمینان کی سانس لی ۔۔۔ نہیں یہ جڑیں بہت مضبوط
ہیں۔ یہ نہیں ٹوٹیں گی۔ اوپر پہنچ کر انہوں نے بالکل شاخوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

یہ باغ جتنا ہی پرانا ہے اس میں اتنا ہی رومانس ہے۔ اس بے ترتیبی اور ویرانی میں
کتنا حسن ہے۔ اسنے سوچا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسنے اس باغ کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔

یہاں نہیں تو کہیں اور سہی۔ بالکل ایسا ہی۔ ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے خاموش اور پرسکون باغ۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ انسان ہر اچھی چیز کو اُنس کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہر اچھی چیز کو دیکھ کر وہ یہی محسوس کرتا ہے جیسے اس نے اس سے پہلے بھی یہ چیز کہیں دیکھی ہو ــــ اور کہیں نہیں تو خواب میں ہی سہی ــــ حالانکہ اکثر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ مگر اسے محسوس ایسا ہی ہوتا ہے۔

وہ اٹھ کر باغ میں ٹہلنے لگا۔ ایک درخت۔ کتنے درخت۔ کتنی شاخیں کتنے پتے۔ کتنا سایہ۔ ٹھنڈا رومانی اور خواب آگیں سایہ۔ ایک ہی درخت تو تھا مگر معلوم ہوتا تھا جیسے ایک جنگل ہو۔ ایک آدم۔ کتنی بڑی دنیا۔ کتنے انسان۔ مگر سب الگ الگ۔ آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ کوئی ربط نہیں۔ سب منفرد۔ اداس۔ تنہا۔ کہیں سایہ نہیں۔ صرف جلالت کی کڑی دھوپ۔ اور نیچے دھوکہ دیتی ہوئی ــــ جوئے آب کی مانند موجیں مارتی ہوئی اور ہیروں کی طرح جگمگاتی ہوئی ریت ــــ صرف ریت ــــ یہ زندگی ہے ــــ لیکن نہیں یہاں سایہ بھی تو ہے۔ ان درختوں کا گھنا۔ نرم سایہ۔ اس ایک درخت کا جو بہت سے ہیں مگر پھر بھی ایک ہیں۔ تمام شاخیں ایک تنے سے نکلی ہوئی۔ انہیں شاخوں میں ہزاروں لاکھوں۔ ان گنت پتیاں۔ الگ الگ۔ لیکن ایک دوسرے سے کتنی قریب۔ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتی ہوئی ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتی پتیاں۔ اور پھر ان کا خوشگوار سایہ۔ اپنے لئے نہیں۔ دوسروں کے لئے۔ صرف دوسروں کے لئے۔ ان کے لئے گرم دھوپ اور دوسروں کے لئے خوشگوار سایہ۔ یہ بھی تو زندگی ہے۔ یہ بھی تو دنیا ہے۔

یکایک اس کی نظر درخت کے تنے پر کھدی ہوئی کسی تحریر پر پڑی جسے اسنے پہلی نظر میں نظر انداز کر دیا تھا ــــ کچھ لکھا تھا ــــ غلام محمد حسینی۔ سندھی رسم الخط میں کھدا ہوا نام۔ پھر اسنے غور سے دیکھا۔ آس پاس کتنے نام ــــ سندھی میں۔ اُردو میں۔ ہندی میں۔ بنگالی میں۔ انگریزی میں۔ پنجابی میں۔ جانے کون کون سی زبانوں میں ــــ ایک درخت ــــ ایک تنا۔ کتنے انسان ــــ کتنی زبانیں۔ دور دور دیسوں میں بولی جانے والی زبانیں۔ ایک دوسرے کی سمجھ میں نہ آنے والی زبانیں۔ مگر یہاں اس درخت کے تنے پر۔ وقت کے قرطاس پر سب ایک ہیں۔ یہاں آکر

تمام زبانیں ایک دوسرے کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ یہ قرطاس وقت ہے۔ تاریخ کا زریں صفحہ ہے۔

اور قریب سے دیکھنے لگا۔

بنسی دھر۔ شکنتلا۔ گوپال۔ گلشن۔ محمد احمد۔ موہن داس۔ اسلم نیلوفر۔ ندیم صدیقی۔ پٹ بڑ۔ موسیٰ خان رانی۔ روندر سادھنا۔ دوندر گھوش۔ روزی۔ ڈسوزا۔ کلیم اللہ۔ سلویا۔ حمیرہ۔ کلپنا۔ شیریں۔ فلپ فلورا۔ رابرٹ۔ معین الرحمان۔ نواز۔ پربھا شنکر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ناموں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ ہزاروں نام۔ ہزاروں انسان۔ اوپر نیچے۔ دائیں بائیں۔ عبداللہ، اور رام لال۔ ایک ساتھ بغیر کسی تکلف بغیر کسی تفریق کے۔ خدیجہ۔ ہاجرہ۔ بسنتا اور کونیتا۔ پرملا اور پشپا سب ایک ساتھ۔ آس پاس اِدھر اُدھر۔ اور اوپر۔ تاریخ کے صفحات پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کا کوئی مذہب۔ کوئی قومیت کوئی فرقہ نہیں ہوتا۔ تاریخ میں سب ایک ہیں۔ اس کے صفحات سب کے لئے ہیں۔ اسکی آغوش سب کے لئے وا ہے۔

ان ناموں میں نہ جانے کتنے ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ نہ جانے کتنے مر چکے ہوں گے۔ نہ جانے کتنے دور دیس کو چلے گئے ہوں گے۔ اور نہ جانے کتنے ایسے بھی ہوں گے جو کبھی یہاں نہیں آئے۔ مگر ان کے نام یہاں درخت کے تنوں پر کھدے ہیں۔ یہ نام زندہ ہیں۔ یہ تمام نام زندہ رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک یہ درخت قائم ہیں۔ جب تک تاریخ کے یہ صفحات موجود ہیں۔ جب تک لکھنے پڑھنے کا فن زندہ ہے۔

ایک جگہ وہ چونک گیا ۔۔ ایک نام۔ اسکے اوپر نمایاں طور پر کھدا ہوا دوسرا نام۔ ابھی پہلا نام مٹا بھی نہ تھا۔ وقت ابھی پہلے نام کو مٹانے میں کامیاب بھی نہ ہوا تھا کہ ایک انسان نے دوسرے انسان کی بغل میں چھری گھونپ کر اسے ہلاک کر دیا۔ پھر اسکی لاش پر اپنا محل تعمیر کر لیا۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ یہ تو اس کی اپنی دنیا تھی۔ جہاں روز ہی ایسا ہوتا ہے۔ لوگ اپنی مرضی پر دوسروں کو قربان کر دیتے ہیں۔ اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے انہیں دوسروں کی لاشوں پر سے گذرنے میں بھی عار نہیں ہوتا۔ کیا کوئی تیسرا آدمی ان کے ساتھ بھی یہی برتاؤ نہیں کر سکتا؟ یہ تو دنیا ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔

وہ ناموں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

یہ تو شجرِ حیات ہے ـــ اسی طرح کا شجرِ حیات جو فلک پر ہے جس میں ایک کونپل پھوٹتی ہے، ایک انسان جنم لیتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے۔ کسی کے لئے اپنی جان کی قربانی دیتا ہے۔ یا خود کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ پھر وہ پتہ اس شجر سے جھڑ جاتا ہے۔ نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ پرانی پتیاں اپنا وقت پورا کر کے گرتی رہتی ہیں۔ لیکن لوح پر ان کا نام محفوظ رہتا ہے۔ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے اور جب تک یہ نظام قائم رہے گا۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کونپلیں پھوٹتی رہیں گی۔ پتیاں گرتی رہیں گی۔ اور لوح پہ نئے ناموں کا اضافہ ہوتا چلا جائے گا ـــ اسے اپنے پیروں کے نیچے خشک پتوں کے دبنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک اٹھا۔ ارے یہ تو کسی انسان کی دبی دبی چیخ ہے۔ دور دور تک پھیلی ہوئی ان گنت خشک پتیاں۔ لاشیں۔ ہڈیاں۔ مردہ جسم۔ اس نے گھبرا کر اپنا پیر ہٹانا چاہا مگر ہر جگہ پتیاں ہی پتیاں۔ وہ کہاں تک انہیں بچائے گا۔ یہ تو شجرِ حیات سے گرے ہوئے پتے ہیں۔ یہ تو اپنا وقت پورا کر چکے ہیں۔ اب تو ان کی قسمت میں صرف پیروں تلے روندا جانا ہی رہ گیا ہے یہ دنیا تو زندہ لوگوں پر بھی تنگ ہے۔ مُردوں کی اس میں گنجائش کہاں ـــ لیکن ـــ سامنے لوح ہے جس پر ان کا نام محفوظ ہے۔ یہ ہمیشہ محفوظ رہے گا یہی ان کی زندگی کی قیمت ہے۔

ناموں کا یہ لامتناہی سلسلہ..... یہ ابھرتے ہوئے، مٹتے ہوئے، نئے، پرانے، بھدی تحریر میں خوبصورت نام خوبصورت تحریر میں سادہ بے تکے نام مگر یہ سارے نام اہم ہیں۔ یہ دُنیا میں آئے ہیں ـــ کتنے پتے شجرِ حیات میں لگے ہوں گے ـــ کتنے گر گئے ہوں گے۔ کتنے باقی ہوں گے کتنے جھڑ رہے ہوں گے۔ ہر روز، ہر گھنٹے، ہر لمحہ، ہر پل، یہ پتے جھڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ نئی کونپلیں پھوٹتی چلی جاتی ہیں۔ سکندر ـــ صرف بتیس سال۔ تاریخ کے چند لمحے۔ آدھی دُنیا کی شہنشاہی۔ کتنا بڑا فاتح۔ کتنا بڑا نام۔ کیٹس صرف چھبیس ۲۶ سال ـــ موسیٰ خاں ۹۶ سال۔ چھیانوے طویل سال۔ ۳۵۰۴۰ دن۔ کتنا طویل عرصہ۔ بے کار۔ رائیگاں۔

چکر دریتی ۱۹۴۰ بیس طویل سال۔ ـــ مگر یہ نام نمایاں ہے۔ یہ نام روشن ہے۔ بیس سال میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔ ایک عظیم جنگ لڑی گئی۔ لاکھوں انسان آلو پیاز کی طرح کٹ گئے۔

۱۹۴۷ء۔ بھائی نے بھائی کا خون پیا۔ بہنوں کو اغوا کیا۔ ماؤں کی گودیں ویران کر دیں۔ ممتا کے سوتے خشک کر دیئے۔ دلوں کے چراغ گل کر دیئے۔ کتنے حادثے نہ ہوئے ہوں گے۔ ان میں سال میں۔ کون جانے "چکرورتی ۱۹۴۷" بھی اس بیس سال کے دوران ہونے والے کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو۔ شاید وہ اب بھی زندہ ہو۔ شاید وہ پہلے سے کہیں زیادہ امیر ہو گیا ہو۔ یا شاید چیتھڑے لٹکائے۔ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ یا ٹوٹے ہوئے بازو دکھا کر بھوک سے نڈھال کسی سڑک پر کسی نیم تاریک گلی میں بھیک مانگ رہا ہو۔ اور لوگ کترا کر نکل جاتے ہوں۔ مگر اس کا نام اس درخت پر۔ اس لوح پر اس طرح چمک رہا ہے جیسے کل ہی کا لکھا ہو۔ اس نام میں زندگی کی تڑپ ہے جینے کا حوصلہ ہے یہ نام کبھی نہیں مر سکتا۔

ایک درخت — پانچ درخت — ان گنت نام۔ ان گنت انسان — ان گنت انسان — ایک کہانی۔ ایک ہی ساز، ایک ہی نغمہ۔ زندگی کے ساز پر موت کا نغمہ — موت کے ساز پر زندگی کا نغمہ۔ انسان ہی انسان۔ لاشیں ہی لاشیں۔ اور ان لاشوں پر وحشیانہ رقص — لامتناہی۔ کبھی نہ ختم ہونے والا۔ ناتمام رقص۔

پشپا۔ رویندر۔ کویتا دیپ۔ شریف۔ نرگس۔ کمار۔ سندھیا۔ منیر زبیدہ ۱۹۴۸۔۵۴ ۱۹۵۰۔ ۱۹۴۶۔ ۱۹۳۵۔ ۱۹۴۱۔ ۱۹۳۲۔ . . . . . ناموں کے ساتھ لکھے ہوئے سن — خوبصورت نام۔ خوبصورت جوڑے۔

ان تمام خوبصورت ناموں۔ خوبصورت جوڑوں کو ایک بار پھر یہاں لے آؤ۔ ان میں سے کتنے اب بھی اس لوح پر چند منٹ نظریں جمائے رکھنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ کتنے لوگوں کو یاد ہوگا کہ انہوں نے کسی جذباتی لمحے میں یہاں اپنے نام بڑے چاؤ سے درخت کے تنوں پر کھودے ہیں۔ چاندی کے تاروں جیسے بال اور سوکھے آم کی طرح کے جھریوں سے پر چہرے لئے ہوئے لوگ شاید بہت ہی عجیب سا محسوس کریں۔ شاید انہیں یقین نہ آئے کہ یہ نام انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی خوشی سے کھودے تھے۔ شاید وہ شرم سے سر جھکا لینے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکیں — ان تمام جوڑوں کو لا کر کسی نئے درخت کے سامنے چھوڑ دو تو شاید اب ترتیب کچھ یوں ہو۔

"پشپا جگدیش۔ نرگس رشید۔ کویتا بل۔

اند پھر انہیں دوبارہ لاکر اس درخت کے سامنے کھڑا کر دو ۔۔۔ تو شاید وہ ایک دوسرے سے نظریں نہ ملا سکیں۔ جذباتی لمحے ۔ خام جذبات۔ غیر سنجیدہ باتیں۔ کتنوں نے یہیں ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہوں گی۔ مگر اب وہ دوسروں کے ساتھ بھی پوری طرح مطمئن ہوں گے۔ انہیں شاید یہ لمحے یاد بھی نہ آتے ہوں گے۔ جیسے یہ لمحے ان کی زندگی میں آئے ہی نہ ہوں ۔ یہ دنیا ہمیشہ یوں ہی رہے گی۔ انار کلیاں دیوار میں زندہ چنوائی جاتی رہیں گی۔ اور سلیم شیر افگنوں کو قتل کر کے ان کی خوبصورت بیویوں سے اپنے ایوان سجاتے رہیں گے۔ شکنتلا جنگلوں میں بھٹکتی رہے گی۔ اور دشینت اپنے محل میں داد عیش دیتے رہیں گے۔ سیتاؤں کی پاکبازی پر حرف آتا رہے گا اور وہ چودہ چودہ سال اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹتی رہیں گی۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ سے یونہی ہوتا آیا ہے۔ ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا۔

پاشا ۔ نسیم ۔۔ طاہر ۔۔ رومی ۔ گوپال ۔ کوشلیا ۔ شاکرہ ۔۔ عزیزہ ۔
برسوں کی جمی ہوئی گرد رفتہ رفتہ ہٹنے لگی۔ اور تمام مناظر صاف نظر آنے لگے۔ کئی چہرے ابھرے۔ پھر ان میں ایک چہرہ تیزی سے آگے بڑھ آیا۔

عزیزہ ۔۔۔

ایک پتے نے اپنے ساتھ کے پتے سے نہ جانے سرگوشیوں میں کیا کہا کہ وہ اسکی طرف دیکھتا رہ گیا۔ دیکھتا رہ گیا۔ اور وہ پتہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ پہلا پتہ بے شمار پتوں کے درمیان اسے ڈھونڈھتا ہی رہ گیا۔ اسکی نظریں منتظر ہی رہیں مگر وہ دوبارہ نظر نہ آیا ۔۔۔

"عزیزہ ۔۔ زندگی بذاتِ خود بہت تکلیف دہ ہے۔ اس میں اور اذیتوں کا اضافہ کرنے سے فائدہ ۔۔۔؟" ایک دن مسعود نے اس سے کہہ ہی دیا۔

"جی ؟" بہت معصومیت سے اسنے صرف 'جی' کہا۔

"مجھے یقین ہے تم جو کچھ اوپر سے نظر آتی ہو۔ واقعتاً اسکے قطعی برعکس ہو۔"

"جی ۔ میں سمجھی نہیں۔" اسنے اتنی ہی معصومیت سے جواب دیا۔

"سمجھنا ہی نہ چاہو تو اور بات ہے۔ ورنہ میں کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا ہوں جو آسانی سے سمجھ میں نہ آسکے۔"

"گھنٹہ ہو گیا۔ چلئے کلاس میں چلتے ہیں۔"

"گھنٹہ تو روز ہوتا رہے گا۔ اور ایک کلاس چھوڑ دینے سے کوئی نقصان بھی نہ ہو گا۔ مگر شاید میں بار بار یہ بات نہ کہوں۔ اور یہ بات تم کو سمجھنی پڑے گی۔"

"کچھ کہئے بھی تو ـــ"

"تم خود کو کب تک فریب دیتی رہو گی۔ کب تک خود کو پہچان لینے سے بچو گی۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس وقت پہچانو جب خود تم کو وقت گذر جانے کا افسوس ہو۔"

"آپ تو معموں میں باتیں کر رہے ہیں۔"

"یہ جو تم نے بے نیازی اور سنجیدگی کا خول سا پہن رکھا ہے۔ تم پر فٹ نہیں آتا ہے۔ یہ کسی بھی وقت تمہارے لئے وبال جان بن جائے گا۔ اس سے جتنی جلد پیچھا چھڑا سکتی ہو چھڑا لو۔"

معمولی شکل و صورت کی بالکل عام سی لڑکی تھی وہ۔ مگر بدصورت پھر بھی نہیں کہی جا سکتی تھی۔ جب وہ تنے تنے سے ابرو اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ چہرہ لئے مسعود کے سامنے آتی تو اس کا دل چاہتا کہ اس قدر زناٹے کا ایک تھپڑ جما دے کہ اس کی صورت بدل جائے۔ مگر نہ جانے کیوں جب وہ سامنے آتی تو وہ خود کو بالکل بے بس سا محسوس کرنے لگتا۔ ایسے میں وہ تمام ایسی باتیں بھول جاتا جو وہ اس سے کہنا چاہتا اور پتہ نہیں کیسی بے تکی باتیں کر جاتا کہ اسے بعد میں حیرت ہونے لگتی۔ ایک بار کئی دن کے بعد جب وہ کالج آئی تو وہ چھوٹتے ہی کہہ بیٹھا۔

"تم اتنے دن کہاں تھیں۔ یہاں تمہاری کمی محسوس ہو رہی تھی۔"

وہ اس کے چہرے کو تکتی رہی۔ جیسے بات اسکی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہ تھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔

پھر کچھ دنوں بعد یہ ہوا کہ وہ کئی روز کالج نہ گیا تو اسنے لائبریرین۔ چپراسی حتیٰ کہ اسکے چند مخصوص دوستوں تک سے اسے پوچھ ڈالا۔

"مسعود صاحب نہیں آئے؟"

لیکن جب مسعود کالج گیا اور اس سے پوچھا۔

"عزیزہ۔ تم مجھے ڈھونڈھ رہی تھیں، کوئی خاص کام تھا کیا؟"

تو اسنے انتہائی سادگی اور بے نیازی سے جواب دیا۔

"نہیں تو ــــ بس یونہی پوچھا تھا۔"

اور یہ بات اس قدر سرد مہری اور بے گانگی سے کہی گئی تھی کہ وہ اسے کسی قسم کے معنی پہنانے سے قاصر تھا۔

مسعود نے رفتہ رفتہ صرف یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زندگی کی رہگذر پہ بہت پیچھے بالکل ابتدا میں کسی ہم سفر نے اسکے کانوں میں شاید ایک مبہم سی سرگوشی کی تھی۔ ممکن ہے وہ بالکل ایک عام سی بات رہی ہو۔ مگر وہ ابھی تک اسی کی بازگشت میں کھوئی ہوئی ہے ـــ شاید وہ اب تک اسی آواز کی منتظر تھی۔

کالج کے ماحول میں عزیزہ خاص مس فٹ Misfit تھی۔ وہ تمام ہنگاموں سے بے نیاز صرف اپنے پڑھنے سے ہی کام رکھتی۔ اس لئے مسعود کو اس سے گفتگو کرنے کا بہت کم موقع ملتا ـــ کچھ عجیب بات تھی کہ مسعود اسکی تمام تر سرد مہری کے باوجود اس کا قرب چاہتا تھا۔ حالانکہ اسنے کبھی بھی اسے یاد کرکے آہ نہ بھری تھی۔ نہ ہی اس سے ملنے کو بے چین رہتا تھا۔ مگر اس سرد مہر اور لئے دیئے رہنے والی لڑکی سے مل کر اسے ایک عجیب قسم کی مسرت ہوتی تھی۔ شاید اس کی ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور سرد مہری ہی اسے پسند تھی۔ ویسے مسعود نے کبھی بھی اس سے لمبی چوڑی توقعات نہ وابستہ کی تھیں۔ نہ ہی اسکے خیالوں کی دنیا میں عزیزہ کے لئے کوئی بہت اہم جگہ تھی۔ پھر بھی وہ اس کے لئے ایک اہم کردار ضرور تھی۔

مسعود اور عزیزہ کتنی ہی بار ملے ہوں گے۔ گھنٹوں ہی اُنھوں نے باتیں کی تھیں۔ ایک آدھ بار مسعود کے اصرار پر انہوں نے ساتھ بیٹھ کر ہوٹلوں میں چائے بھی پی۔ مگر ان کے درمیان جو شروع سے ایک تکلف سا قائم ہو گیا تھا۔ وہ کسی طرح بھی ختم نہ ہو سکا۔ اور اس لئے کسی خاص قسم کا جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود مسعود اس کے خیال سے دامن نہ چھڑا پایا تھا۔ نئے سال یا عید کے موقعوں پر جب بھی وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو کارڈ بھیجنے لگتا تو لیکایک اسے عزیزہ

ضرور یاد آجاتی اور وہ کوشش کے باوجود اسے کارڈ نہ بھیجنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی بھی اسے اس کی رسید نہ ملی۔ ایک بار وہ بمشکل اسے کارڈ بھیجنے میں کامیاب ہو سکا تھا تو چند روز بعد ہی اسے اس کا ایک پرچہ ملا۔

"آپ ہمیشہ نئے سال پر کارڈ بھیجتے تھے۔ اس بار آپ نے کیوں نہ بھیجا۔ یہ ضروری تو نہیں۔ مگر پھر بھی انہونی سی بات ہو جائے تو عجیب لگتا ہے"۔

یہ پرچہ پاکر مسعود سخت الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے اس پرچے سے یہ بات تو ظاہر ہو ہی جاتی ہے کہ وہ اس سے قطع تعلق بھی نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اس کے رویے سے تعلق قائم رکھنے کی کسی ہلکی سی خواہش کا اظہار بھی نہیں ہوتا۔ غالباً وہ سمجھ گئی کہ وہ مسعود کی کمزوری بن گئی ہے اور وہ مسعود کو ان خلش سے آزاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک بار مسعود کے ایک دوست نے اس سے پوچھا۔

"مسعود ـــــ یہ مغرور لڑکی تم کو منہ لگانا بھی پسند نہیں کرتی۔ تم کیوں اسکے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہے ہو؟"

مسعود نے جواب دیا۔

"جانے کیوں پہلی بار اس لڑکی کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی بہت دکھی اداس اور تنہا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اپنے کالج کی لڑکیاں کتنی تیز طرار ہیں۔ مگر یہ لڑکی انتہائی کم گو کم آمیز اور سنجیدہ ہے ـــــ پھر یہ کہ یہ حسین بھی نہیں کہ اسے بہت سے لوگوں کا التفات حاصل ہو۔ جب تم کسی انسان سے، جو محبت چاہتا ہے، محبت نہیں کرو گے تو وہ تم سے نفرت کرنے لگے گا۔ یہ لڑکی عمر کی اس منزل پر ہے جہاں انسان کو نہ صرف محبت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ وہ خود کو اس کا حقدار بھی سمجھنے لگتا ہے لیکن دوسروں کی طرف سے خاطر خواہ اظہار نہ ہونے کی صورت میں وہ خود بھی اسکے اظہار میں ایک جھجک محسوس کرتا ہے اور اس کا نتیجہ بے نیازی اور سرد مہری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آگ دب تو جاتی ہے بجھتی نہیں۔ صرف ایک ہلکی سی پھونک راکھ کو اڑا دینے، اور چنگاری کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہی کچھ معاملہ اس لڑکی کے ساتھ ہے۔ یہ لڑکی ہے اور جوان ہے اسکے چاروں طرف ہزاروں لاکھوں انسان بستے ہیں۔

روتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ آہیں بھرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں۔ اداس رہتے ہیں ـــــ یہ ان سے
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ زندہ رہنے کی تڑپ ہے ـــــ یہ
بھی کسی سے مل کر خوش ہونا اور کسی سے جدا ہو کر اداس رہنا چاہتی ہے۔ مگر ساتھ یہ نہیں چاہتی
کہ خود حالات کی راہ میں جا پڑے۔ وہ چاہتی ہے کہ حالات اسکی راہ میں آ پڑیں ـــــ اور اپنے
احساسات سے پیچھا چھڑانے کے لئے اسنے خود کو پتھر بنا لیا ہے۔ یہ پتھر اندر سے موم سے بھی زیادہ
نرم ہے۔ اسے پگھلانے کے لئے ذرا سی گرمی کی ضرورت ہے ـــــ یہ دنیا سے الگ ہو گئی ہے
اور میں ایک زندگی رائیگاں ہوتے نہیں دیکھ سکتا ـــــ میں اسے صرف جیتے جاگتے ہنستے
بولتے انسانوں کی دنیا میں واپس لے آنا چاہتا ہوں پھر کوئی موقع اسے ڈھونڈھ لے گا یا
یہ خود کوئی موقع تلاش کرے گی۔"

"پھر تمہارے تمام تر خلوص کے باوجود اسکی سرد مہری کی کیا وجہ ہے؟"

"اسکی سرد مہری کی وجہ بہت معقول ہے۔ اسکی ذات سے میری دلچسپی کا مقصد صرف یہ
ہے کہ خود کو تنہا نہ محسوس کرے۔ اسے اطمینان رہے کہ کم از کم ایک آدمی اسکے لئے سوچتا ہے۔
اور اسے مسرور دیکھنا چاہتا ہے۔ اور شاید تمہیں اس بات پہ بے حد حیرت ہو کہ میری یہ خواہش
بالکل یک طرفہ ہے۔ میں اسکے جواب میں اس سے کچھ نہیں چاہتا۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس
تو ہو گیا ہے مگر اس کے جذبات مختلف ہیں۔ اسکے جذبات شدید ہیں اس لئے وہ دوسرے فریق
سے انتہائی شدید اور واضح اظہار اور COMMITMENT چاہتی ہے۔ یہاں اسے مجھ
سے مایوسی ہوتی ہے جو اسے قدم بڑھانے سے روکتی ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں اور آتی ہے
وہ یہ ہے کہ وہ شاید یہ سوچتی ہے کہ اگر اسنے کسی وقت بھی میرے خلوص کی اہمیت کو تسلیم کر
لیا تو شاید وہ اس تمام تر التفات سے محروم ہو جائے۔ لڑکی ہمیشہ خود کو اہم بنائے رکھنا چاہتی
ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اگر اسنے دوسرے فریق کی اہمیت کو تسلیم کر لیا تو اسکی اپنی حیثیت مجروح
ہو گی۔ حالانکہ دل سے وہ دوسرے فریق کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے۔"

"اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔"

"معلوم نہیں تم محبت سے کیا مراد لیتے ہو۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ محبت برابر کی سطح پر ہوتی ہے

خود سے کمتر لڑکی کے لئے تم رحم محسوس کر سکتے ہو اور اسی طرح بہتر لڑکی کے لئے تمہارے دل میں احترام ہوگا۔ لیکن دونوں صورتوں میں محبت کی گنجائش صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں کسی بھی طرح ایک سطح پر آ جائیں ــــ میں عزیزہ کے لئے بیک وقت رحم اور احترام دونوں محسوس کرتا ہوں، مگر محبت نہیں۔ ہم دونوں کے درمیان تکلف اور اجنبیت کی جو دیوار حائل ہے اس کے ڈھے جانے کی صورت میں شاید محبت کی گنجائش پیدا ہو جائے مگر اس سے پہلے نہیں۔"

"بڑی دلچسپ بات ہے۔ نہ تم اس سے کوئی واضح اظہار کرو گے نہ ہی اجنبیت ختم ہوگی اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔"

"میرے دل میں اس کے لئے اس قدر خلوص ہے کہ اس سے محبت مجھے اس خلوص کی توہین معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی محبت ہی کی کوئی قسم ہو جسے میں اب تک نہ سمجھ پایا ہوں۔ مگر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں نے اس سے کوئی امید وابستہ نہیں کی ہے۔ میں صرف اسے زندگی میں خوش اور کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس جذبے میں میں اپنی کوئی غرض اب تک شامل نہیں کر سکا ہوں۔"

کالج سے چلے جانے کے بعد مسعود اور عزیزہ کی چھ چھ ماہ اور سال سال بھر ملاقات نہ ہوتی مگر وہ اسے اکثر یاد آتی رہتی ــــ جب بھی وہ دونوں ملتے بات چند رسمی جملوں سے آگے نہ بڑھ پاتی ــــ عزیزہ اب بھی وہی تھی ــــ وہی خاموشی ــــ وہی سنجیدگی۔ وہی بے نیازی ــــ

یادوں کا دھاگہ ٹوٹ گیا۔ اور اسکی نظریں پھر درخت کے تنے پر بھٹکنے لگیں۔

"سالمن ۱۹۵۵ ــــ"

کتنا دھندلا مٹتا ہوا نام۔ زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں۔ جینے کی کوئی تڑپ ہی نہیں۔ زندگی صبح و شام سے عبارت ہے ــــ ایک کالی کلوٹی لڑکی ــــ سسنے بھرے کے دو تین

پیگ ــــ اور چھ آنے والی سینما کی لائن ــــ کتنا دھندلا نام۔ جیسے کل یہ یہاں برقرار نہ رہے گا۔ کون جانے یہ پتہ بہت پہلے گر چکا ہو۔ یا کسی شاخ میں کسی نہ کسی طرح لٹکا ہی ہو۔ کون جانے۔

خوبصورت نام ــــ خوبصورت جوڑے۔

عرفان، رشیدہ، نجمہ، اسلیم ــــ برٹی، ڈولی۔ پرکاش، رنو، کمل، گھوشش، سروج، اندو۔ ثروت۔ جمیل۔ رفعت۔

رفعت ــــ

یہ صورت تو عرصہ ہوا اس کے ذہن سے معدوم ہو چکی تھی۔ مگر اس وقت درخت پر اس کا نام کھدا دیکھ کر اس طرح سامنے آگئی جیسے سینما اسکوپ سائز کے پردے پر یکایک ہیرو یا ہیروئن کا چہرہ کلوزاپ میں آجاتا ہے۔

وہ جامن کے پیڑ پر بیٹھا بے خیالی میں چاقو سے رفعت کا نام کھود رہا تھا۔ وہ نیچے آکر کھڑی ہو گئی۔ معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔

"جمیل بھائی میں بھی اوپر آپ کے پاس آؤں گی۔" وہ مچل گئی۔

"لیکن آؤ گی کیسے تم درخت پر چڑھ نہیں سکتی ہو؟"

"ہوں میں کچھ نہیں جانتی میں تو آپ کے پاس آؤں گی۔" وہ بضد تھی۔

"اچھا تم اپنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ میں تم کو پکڑ کر کھینچ لیتا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا بازو الگ ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں۔"

پھر اسنے جلتا ہوا سگریٹ ہونٹ میں دبا کر اسے ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ اسکے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ سے رفعت کی پیشانی جل گئی۔ مگر اسکے منہ سے صرف سی کی آواز نکل کر رہ گئی۔ جلی ہوئی جگہ پر ذرا سی دیر میں آبلہ ابھر آیا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ چیخ کیوں نہ پڑی۔ اتنی چھوٹی سی بچی تھی وہ۔ وہ سخت شرمندگی سے اس سے معذرت چاہتا رہا۔

"بس ذرا سی جلن ہو رہی ہے۔ کوئی زیادہ تھوڑا ہی جلا ہے۔ آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں ــــ" اسنے رفعت کو گود میں لے لیا۔

رفعت کی نظر ڈال پر کھدے ہوئے اپنے نام پر پڑی۔

"دیکھئے آپ نے میرا نام یہاں کھود دیا۔" وہ خوشی سے بولی۔

وہ خاموش رہا۔

"آپ نے اپنا نام کیوں نہیں کھودا۔" اسنے پوچھا۔

وہ پھر خاموش رہا۔

"آپ اپنا نام بھی کھود دیجئے نا۔ نہیں تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔"

"ضرورت کیا ہے؟"

"تو پھر آپ میرا نام بھی مٹا دیجئے۔" اسنے روٹھتے ہوئے کہا۔

اسنے اپنا نام بھی کھود ڈالا۔

"رفعت ـــــ جمیل ـــــ" بہت عجیب سا لگا اسے یہ دونوں نام ایک ساتھ کھدے دیکھ کر۔ رفعت تو بچی تھی مگر وہ بچہ نہیں تھا۔ اسے تو عجیب سا لگنا ہی چاہئے تھا۔ اسنے سوچا تھا کہ کل جب رفعت بڑی ہو جائے گی اور کوئی آدمی یہ نام دیکھے گا تو جانے کیا سوچے گا۔

بہت دنوں کے بعد جب جمیل نے اسے دوبارہ دیکھا تو وہ پندرہ سال کی ایک انتہائی سیدھی سادی دبلی پتلی خوبصورت لڑکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ کالج میں پہنچ گئی تھی۔ مگر اسے دیکھ کر اور اس کی باتیں سنکر اس کو ہمیشہ تعجب ہوتا کہ آخر یہ لڑکی کالج میں کیسے پہنچ گئی۔ انتہائی بچکانہ گفتگو کرتی تھی وہ۔ حد تو یہ ہے کہ اسے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ ناول کسے کہتے ہیں۔ افسانہ کیا چیز ہوتی ہے۔ نظم اور غزل کا فرق اس کے ذہن میں واضح نہ تھا۔ کتابی باتوں کے علاوہ وہ کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ تکلف سے اسے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس کی گفتگو گھوم پھر کران کتابوں تک محدود رہتی جنہیں وہ پڑھ چکی تھی۔ جب بھی کوئی اس کے ہتھے چڑھ جاتا وہ بیت بازی یا ورڈ میکنگ WORD MAKING کے لئے اس کے پیچھے پڑ جاتی۔ اور زیادہ تر وہ جیتتی۔ پھر اس طرح خوش ہوتی جیسے بچے کسی بڑے کو بیوقوف بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ تالی بجا بجا کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی۔

"امی۔ جمیل بھائی ہار گئے۔ بیت بازی میں مجھ سے ہار گئے۔ کتنی چھوٹی ہوں میں۔ اتنے بڑے ہو کر بھی مجھ سے ہار گئے۔"

جب بھی وہ اسکے یہاں جاتا وہ اس سے چمٹ جاتی۔ اسکی گردن میں جھول جاتی وہ لیٹا ہوتا تو اس پر ڈھے پڑتی۔

"بہت زور سے نیند آرہی ہے۔" وہ کہتی۔

وہ سگریٹ اسکے چہرے کے پاس لے جاتا۔

"ہٹو۔ ورنہ ابھی جلا دوں گا۔"

"ایک بار جلا کے جی نہیں بھرا۔ دیکھئے ابھی تک نشان باقی ہے" اسنے اپنی پیشانی پر جلے ہوئے نشان پر انگلی رکھی۔ کئی سال پہلے کی جلی ہوئی جگہ پر اب تک نشان باقی تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی کہتی۔

"امی جمیل بھائی چاے مانگ رہے ہیں"

اور پھر خود ہی چاے بنا کر لاتی تو کہتی۔

"اچھی ہے نہ چاے۔ میں نے بنائی ہے جبھی تو اتنی اچھی ہے۔" اور خود ہی اپنی تعریف کرکے اس طرح خوش ہوتی جیسے کسی نے واقعی اسکی تعریف کردی ہو۔

پندرہ سولہ سال کی تھی۔ مگر دبلی پتلی ہونے کے سبب بالکل ہی بچی لگتی اور وہ حرکتیں بالکل بچکانہ تھیں ہی۔

کئی روز بعد وہ جاتا تو وہ شور مچاتی۔

"جمیل بھائی آگئے۔ امی جمیل بھائی آگئے۔"

پھر اس سے کہتی۔

کہاں تھے جمیل بھائی آپ اتنے دن؟ میں روز بلا ناغہ آپ کو یاد کرتی تھی۔ ہے نا میں یاد کرتی تھی نہ روز جمیل بھائی کو۔ آپ کو یقین نہیں آرہا ہے۔ پوچھ لیجئے نہ امی سے۔ کوئی جھوٹ تھوڑا ہی بول رہی ہوں۔"

بس ہر وقت ہنستی رہتی۔ گھسے پٹے بچکانہ لطیفے سنایا کرتی۔ سب کو چڑایا کرتی۔ سمجھ تو اس میں نام کو نہ تھی ــــ وہ بھی اس سے اسی طرح کا برتاؤ کرتا۔ اسکی چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا۔ زبان چڑاتا۔ اسے چھیڑتا رہتا۔ پریشان کرتا رہتا۔ خاص طور پر یاد کرکے اسے بچوں کے لطـ

سناتا۔ اس کی چار اٹھا کر پی جاتا۔ اسکے سامنے سے پلیٹ کھینچ کر کھانا کھانے لگتا۔

"جمیل بھائی مٹھائی لائے ہیں آپ یا نہیں ؟"

"کس بات کی مٹھائی ؟" وہ پوچھتا۔

"فلاں آفس میں آپ آفیسر ہو گئے ہیں نہ مجھے سب پتہ ہے"۔ وہ یونہی گڑھتی۔

"مٹھائی کھانے کو دل چاہ رہا ہے تو ایسے کہو۔ خواہ مخواہ گپ مارنے کی کیا ضرورت ہے :"

مگر جب وہ مٹھائی منگانے لگتا تو وہ منع کر دیتی۔

در اصل میں نے صبح مٹھائی کھائی تھی تو آپ بہت یاد آئے تھے۔ سوچا آپ مٹھائی منگائیں تو آپ کو کھلاؤں ــــ اچھا جانے دیجئے پھر کبھی میں خود ہی منگا کر کھلا دوں گی۔ آپ بھی کیا یاد کیجئے گا۔"

پھر جب اسکی شادی ہونے کو تھی اور رفعت کو پتہ چلا تو اسنے گھبراہٹ سے پوچھا

"جمیل بھائی آپ کی شادی ہو رہی ہے ؟"

"ہاں بھئی میں نے سوچا تمہارے لئے ایک عدد بھابھی کا انتظام کر دوں"

تھوڑی دیر وہ خاموشی سے بیٹھی رہی پھر اسکے گلے میں جھول گئی۔

"جمیل بھائی۔ ایک بات کہوں ؟

"کہو"

"آپ شادی نہ کیجئے"

"کیوں ؟" اسنے چونک کر پوچھا

"بس یونہی۔ میرا دل چاہتا ہے آپ شادی نہ کیجئے"

اسنے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی اسے بہت ہی اجنبی اور عجیب سی لگی۔ بالکل بدلی ہوئی۔ جیسے یکایک بہت بڑی ہو گئی ہو۔

"اچھا یہ بتایئے شادی کے بعد بھی آپ یہاں آئیں گے ؟"

"آؤں گا کیوں نہیں۔ کیا شادی کے بعد کوئی کسی کے یہاں جانا آنا چھوڑ دیتا ہے"

چند لمحے وہ خاموشی سے سوچتی رہی پھر بولی۔

"اگر آپ نہ آئے تو ــــ" اسنے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا جیسے کچھ سوچنے لگی ہو۔"
"نہ آئے تو کیا ــــ ؟"
"نہ آئے تو ــــ میں بہت روؤں گی۔"
وہ ابھی تک اسے مذاق سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر رفعت کی سنجیدگی نے اسے یقین دلا دیا کہ کم از کم وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔ وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسکی کچھ بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔
پھر اسنے رفعت کے دونوں گالوں پر ہلکے سے چپت لگاتے ہوئے صرف اس قدر کہا
"بہت شرارتی ہوگئی ہو تم۔"
شادی کے بعد جب بھی وہ اسکے گھر گیا وہ اسے سنجیدہ ہی نظر آئی۔ باہر سے وہ اسکی شرارت بھری گفتگو اور قہقہے سنتا مگر جونہی وہ اسکے سامنے جاتا وہ یکایک بدل جاتی۔ ایک دم بڑی ہوجاتی اور دور بیٹھی اداسی سے اسے گھورا کرتی۔ اسکے لئے چائے بناتی تو خاموشی سے پیالی اسکے سامنے رکھ کر آہستگی سے ہٹ جاتی۔ اس سے بے تکلفی بھی برتتی تو وہ پہلی سی بے تکلفی نہ ہوتی۔ نہ جانے کیا ہوگیا تھا اسے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ اور دبلی ہوگئی۔ اسکی آنکھیں روشن تیز اور چہرہ دھندلا ہوتا چلا گیا۔ اور ان اداس آنکھوں میں اس قدر چمک آگئی تھی کہ وہ اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کرپاتا ــــ
رفعت کا چہرہ رفتہ رفتہ دھندلا ہوتا گیا ــــ پھر بالکل ہی مٹ گیا۔ بہت دیر تک وہ کوشش کرتا رہا کہ وہ رفعت کے نقوش کو اپنے ذہن میں اجاگر کرسکے مگر وہ ناکام رہا ــــ
اب وہاں صرف دھند تھی۔ چہرے ابھرنے سے پہلے دھندلا جاتے تھے۔ کوئی بھی صورت پوری طرح نہیں ابھرنے پاتی تھی۔
وہ ٹہلتا ہوا دوسرے درختوں کی طرف گیا۔ ہر درخت پر نام۔ مختلف مذاہب مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کے نام مختلف زبانوں۔ مختلف انداز اور مختلف طرز تحریر میں لکھے ہوئے نام۔ جیسے انسانوں کا ایک جم غفیر ہو۔ ہر کوئی اس بھیڑ میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش میں دوسروں کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ رہا ہو۔ اور دور دور پھیلی ہوئی موٹی موٹی شاخوں

پر دُور دُور اور عام طور پر نظر نہ پہنچنے والی جگہوں پر لکھے ہوئے اِکا دُکا نام۔
"ہریش - اسد - شہلا - کلاوتی - سندھیا - ناصرہ - لطیف - رضیہ ....
دُور دور چھپی ہوئی جگہوں۔ منفرد جگہوں پر لکھے ہوئے اکیلے نام ـــــ پانچ سال ـــــ
دس سال ـــــ بیس سال پہلے لکھے ہوئے نمایاں چمکتے ہوئے اپنا وجود منواتے ہوئے اکیلے نام۔
ـــــ اتنی بڑی دنیا میں۔ اتنے سارے انسانوں کے ہجوم میں یہ کیسے اکیلے رہ گئے۔ انہیں کسی
کا ہاتھ کیوں نہیں مل گیا۔ انہیں کوئی ہم سفر کیوں نہ ملا۔ زندگی کا سفر تو بڑا اکتا دینے والا۔
بہت پیچیدہ بے حد خشک ہے۔ ایک قدم بھی اکیلے نہیں چلا جاتا۔ پھر اتنا طویل سفر انہوں
نے کیسے طے کیا ہوگا۔ کیسے طے کریں گے یہ اتنا بڑا سفر۔ کہ راہ میں تجربہ بیدار بھی تو نہیں۔ کسی
گیسو کا سایہ نہیں۔ کہیں خلوص کی چھاؤں نہیں ـــــ حدِ نظر تک تپتا ہوا ریگستان ـــــ دل میں
ایک طویل صحرا ـــــ کیسے پہنچیں گے منزل پر۔ طویل راہ ہے اور منزلوں اندھیرا ہے پیار کا چراغ
جلائے بغیر روشنی کہاں سے آئے گی؟
لیکن سفر تو جاری ہے۔ تنہا ہی سہی۔ ہر شخص اداس تنہا۔ اپنے دل میں بے کراں یاس
بے اندازہ کرب چھپائے اپنے ہونٹوں پر تبسم چپکائے چلا جا رہا ہے چلتا ہی جا رہا ہے کہ کہیں
کوئی اسے پہچان نہ لے۔ اسکے دل کا بھید نہ جان لے۔ کہیں وہ خود کو ہی نہ پہچان لے۔ خود
کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے خود سے کتراتا ہر شخص چلا جا رہا ہے ـــــ منزل کی طرف ـــــ اس
منزل کی طرف جس کا اسے کچھ بھی پتہ نہیں جس کا دھندلا سا تصور بھی اس کے پاس نہیں۔
اسے اپنی زندگی سے محبت ہے۔ وہ اپنے لئے اپنے بے کراں کرب بے اندازہ مایوسی اور نقلی تبسم کے
لئے جئے گا۔ زندگی کا حق تو وہ ضرور ہی ادا کرے گا۔ ہوسکتا ہے راہ میں کوئی اس جیسا اداس،
تنہا مسافر اسے مل جائے اور اسکے ساتھ ہو جائے۔ پھر تو سفر آسان ہو جائے گا۔ منزل تک کی
نہیں تو چند گام کی ہی رفاقت سہی۔ یہ بھی بہت ہے۔
پھر یکایک جانے کیسے برٹی کا چہرہ سامنے آ گیا۔
سیاہ چمکتے ہوئے چہرے والا برٹی۔ اونچی پتلون پہنے ہوئے۔ گہرے سُرخ رنگ کی
قمیص۔ نیلی، گندی ٹخنوں سے اوپر پتلون۔ لحاف کے فرد جیسی بدسلیقگی سے بندھی ہوئی گندی

ٹائی۔ کالا لمبوترا سا چہرہ ـــ وکٹر مچیور کے انداز پر بھینچے ہوئے ہونٹ بالوں کی ایک موٹی سی لٹ دلیپ کے انداز پر پیشانی پر لٹکی ہوئی۔ ایک بے فکرا، آوارہ سا نوجوان تھا وہ۔

عرفان سے اسکی پہلی ملاقات بہت ہی غیر اہم تھی۔

پکچر ہاؤس پر بھیڑ تھی۔ بڑی کلاس کے تمام ٹکٹ ختم ہو چکے تھے۔ اور ساڑھے چھ آنے کے ٹکٹ والی کھڑکی پر ایک طویل قطار تھی۔ اور لوگ کھڑکی کھلنے کے انتظار میں ایک دوسرے سے چپٹے کھڑے ہوئے سگریٹ پی رہے تھے۔ مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ پچھلی دیکھی ہوئی فلموں پر تبصرے کر رہے تھے۔ اور ادھر اُدھر بغیر نمبر کے لائن میں گھسنے کی کوشش کرنے والوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔

عرفان مایوس سا کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ فلم اسی دن دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ یکایک وہ اسکے قریب آکر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"جنٹل مین! ڈو یو وانٹ ٹکٹ؟"

عرفان نے مڑ کر اسکی طرف کسی قدر حیرت سے دیکھا۔

"تھری فار ٹو فائیوز" اسنے تیزی سے بہت ہی کاروباری لہجے میں کہا۔

عرفان نے تین روپے اسکے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور دو روپے پانچ آنے والا ٹکٹ لیکر جیب میں رکھ لیا۔

"تھینک یو سر" کہہ کر وہ تیزی سے ساڑھے چھ آنے والی لائن کی طرف بڑھا۔ اور بالکل کھڑکی کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب عرفان ٹی اسٹال پر کھڑا چائے پی رہا تھا تو اسنے دیکھا وہ ایک آدمی کو ساڑھے چھ آنے والا ٹکٹ بارہ آنے میں دے رہا ہے۔ پھر اسنے ایک ٹکٹ بہت احتیاط سے موڑ کر جیب میں رکھا۔ بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا اور آکر ٹی اسٹال پر کھڑا ہو گیا۔ چائے پیتے ہوئے اسکی نظر ساتھ کھڑے ہوئے عرفان پر پڑی تو وہ اس سے مخاطب ہو گیا۔

"معاف کرنا صاحب۔ ہمارا پاس پکچر دیکھنے کو پیسہ نہیں تھا اس لئے مجھے مجبوری پر اس طرح پیسہ بنانا پڑا۔"

عرفان نے اس آدمی کو غور سے دیکھا جو ٹکٹ کی بلیک کر کے اس کی معافی بھی مانگ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں" عرفان نے صرف اس قدر کہا۔ اسی وقت قریب سے ایک گداز جسم والی لڑکی کو گذرتے دیکھ کر عرفان اس طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہاٹ اے ونڈرفل باڈی۔ از نٹ اٹ؟" وہ خود بخود بول اٹھا۔ "مگر صاحب یہ بڑا بے وفا لڑکی ہے۔ یہ میرا اِلبوڈ تھا مگر اب میرا طرف دیکھتا بھی نہیں۔"

"اچھا!" عرفان نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"بہت غریب تھا جناب یہ۔ اس وقت یہ مجھ سے بہت لو کرتا تھا۔ اور میں لوگوں سے ادھار مانگ کر، ٹکٹ بلیک کر کے اسے پکچر دکھاتا تھا۔ اس کا لئے لپ اسٹک اور پاوڈر لاتا تھا۔ اس وقت یہ بہت بھولا تھا۔ پھر جب یہ کسی طرح سینیر کیمبرج پاس کر لیا۔ اور ایک فرم میں ٹیلی فون آپریٹر ہو گیا۔ پھر اس کا خرچ بہت بڑھ گیا۔ اور اس پر خرچ کرنے والا لوگ بھی بڑھ گیا۔ میں اس کا خرچ نہیں پورا کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے مجھ سے بیوفائی کر دی۔

اتنے میں پکچر شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ اور عرفان نے اپنی اور اس کی چائے کے پیسے ادا کر دیئے۔

"تھینک یو سر ـــ مائی نیم از برٹی ـــ رابرٹ ـــ آپ کو جب بھی ٹکٹ کا ضرورت ہو ـــ کوئی بھی شو کا ٹکٹ ـــ چاہے کتنا بھی بھیڑ کیوں نہ ہو۔ آپ ہم کو ڈھونڈھ لو۔ میں ٹکٹ دلا دے گا۔ میں سینما کے وقت اسی طرف کہیں آس پاس میں مل جائے گا۔

آٹھ دس دن بعد یکایک عرفان کو پھر برٹی نظر آ گیا۔ وہ اسی لڑکی کے ساتھ تھا جسے اسنے برٹی سے پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔ برٹی اس وقت ایک بے تکے سے سوٹ میں تھا اور اس لئے پہلے کے مقابلے میں کافی باسلیقہ نظر آ رہا تھا۔

"ہلو مسٹر عرفان۔ میری دوست سے ملئے۔ مس مولی۔ مسٹر عرفان۔"

عرفان نے مس مولی سے ہاتھ ملایا۔

" کم آن ۔لیٹس ہیو ٹی COME ON LATS HAUE TEA " برنی نے کہا۔
وہ تینوں تاج کے ایک کیبن میں چلے گئے ۔ برنی نے بہت سی چیزوں کا آرڈر بہت فراخدلی سے دیا۔
عرفان نے مولی کو قریب سے دیکھا۔ اس کا جسم بہت گداز تھا۔ اور ضرورت سے زیادہ کھلے گلے کی اسکرٹ سے اسکے سینے کا خاصا حصہ نظر آرہا تھا۔ اسنے اپنے کالے ہونٹوں پر بہت سلیقے سے لپ اسٹک لگائی تھی۔ اور پاوڈر اس احتیاط سے ملا تھا کہ بجلی کی روشنی میں وہ گندمی رنگ کی خاصی دلکش نظر آرہی تھی۔ خاص کر سرخی سے دہکتے ہوئے اسکے نیم وا لب مکمل دعوت بن گئے تھے ۔ وہ مسکرا کر بہت پرکشش انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔
چار کے درمیان مولی بھی اس سے بے تکلف ہوگئی ۔ وہ بہت غور سے اسکی رولکس گھڑی۔ اس کا شیفرز پن اور قیمتی سوٹ دیکھ رہی تھی۔
جب عرفان چلنے لگا تو برنی نے کہا ۔
" مسٹر عرفان پرسوں آپ میرے گھر لکشری پر سات بجے شام کو ملنا۔"
" اچھا۔"
" شیور ۔۔۔!"
" شیور "
لیکن برنی اسے دوسرے ہی دن مل گیا۔ عرفان نے اس سے پوچھا
" برنی تم تو کہتے تھے کہ مولی بے وفا ہے ۔لیکن کل تم اس کے لئے بچھے جا رہے تھے ۔ اسپر بے دردی سے پیسے خرچ کر رہے تھے ۔"
" بات یہ ہے مسٹر عرفان " اسنے عرفان کی بات کاٹ کر کہا " کہ پہلے میں مولی سے محبت کرتا تھا۔ اور وہ بھی میرے سے محبت کرتا تھا لیکن اب ہمارا بیچ میں صرف پیسے کا رشتہ ہے۔ ہمارا بیچ ایک قسم کا سمجھوتہ ہے۔ جب تک میرا پاس پیسہ ہوگا وہ میرے ساتھ رہے گا۔ میرے ساتھ گھومے گا پکچر دیکھے گا۔ ڈنر کھائے گا۔ ڈانس کرے گا۔ شراب پئے گا ۔ اور پھر زیادہ پی کر لڑکھڑاتا ہوا میرا بازو کا سہارا لئے میرے گھر پر چلا جائے گا۔ جب تک میری جیب میں پیسہ ہے ۔ ہم

دونوں ایک دوسرے کا ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں اسٹرینجر STRANGER ہو جاتا۔ گیارہ سے کو میں ریس سے ساڑھے چار سو روپے جیتا تھا۔ اور اس دن سے اب تک وہ میرے پاس تھا۔ میرا پاس ہنڈریڈ پرسنٹ ختم ہوتے کو ہے۔ اب پھر ہم دونوں اس وقت تک کیلئے STRANGER ہو جائیں گا جب تک میرا پاس پھر ریس یا سٹے سے رقم نہیں آجاتا۔

پھر یکایک اسے جیسے کچھ یاد آگیا اور وہ بولا۔

"ایکسکیوز می مسٹر عرفان۔ میرے کو ذرا جلدی ہے۔ کل آپ لکشری پر ملے گا نہ۔ سات بجے بھولنا نہیں" اور وہ تیزی سے چلا گیا۔

دوسرے دن جب عرفان لکشری پر پہنچا تو برٹی ایک لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔

"ہلو مسٹر عرفان۔ میٹ مائی بلوڈ۔ مس باربرا۔ مسٹر عرفان"

"پلیزڈ ٹو میٹ یو" عرفان نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"می ٹو ——" باربرا نے بہت میٹھی آواز میں جواب دیا۔

وہ تینوں جاکر اندر بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد ہی برٹی نے کہا۔

"ایکسکیوز می فار اے منٹ۔ آئم جسٹ کمنگ ——" اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

دو منٹ بعد بیرے نے لاکر عرفان کو ایک پرچہ دیا۔

"میری ایک بات سن جائیے —— برٹی"

برٹی ایک کونے میں کھڑا تھا۔

"معاف کریئے گا مسٹر عرفان۔ ہم کو دس روپے کا فوراً ضرورت پڑ گیا ہے۔ کل واپس کرے گا۔"

عرفان نے اسے دس روپے دیدیئے اور وہ فوراً باہر چلا گیا۔ عرفان واپس کیبن میں آگیا

"برٹی کہاں ہے؟" باربرا نے پوچھا

"اسے کوئی ضروری کام تھا۔ شاید کچھ دیر بعد واپس آئے۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"کیا پئیں گی آپ مس باربرا؟" عرفان نے پوچھا۔

"شمپین ـــ" اسنے فوراً جواب دیا۔ جیسے وہ پہلے سے اس سوال کا جواب سوچ کر بیٹھی ہو۔
"کیا پینیں گی" سے عرفان کی مراد شراب قطعی نہیں تھی۔ مگر اب چونکہ اسنے کہہ دیا تھا۔ اس لئے عرفان نے آرڈر دے دیا۔
تین چار پیگ کے بعد وہ بہکنے لگی۔ بات بات پر قہقہے لگانا شروع کر دیا۔ بار بار انگڑائی لینے لگی کئی بار اسکی ننگی ٹانگیں عرفان کی ٹانگوں سے مس ہو گئیں۔ تو اسنے مسکرا کر ایک آدھ بار "سارّی" کہا۔ اسکے بعد وہ بھی نہیں۔ عرفان قصداً اس کا گلاس بار بار بھر دیتا۔ اور وہ آہستہ آہستہ انہیں خالی کرتی جاتی۔ پھر جب دونوں وہاں سے اٹھے تو وہ پوری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ اور عرفان کو پوری طرح سہارا بنائے ہوئے تھی۔
عرفان نے ایک ٹیکسی روکی۔
"کہاں چلیں گی مس باربرا؟" عرفان نے پوچھا۔
"ایون ٹو ہل EVEN TO HELL" اسنے جھومتے ہوئے جواب دیا۔
وہ دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے اور عرفان نے ڈرائیور کو اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔
کئی روز تک عرفان کو برلی ٹنہ ملا پھر جب ملا تو وہ بہت بری حالت میں تھا۔ اس کے کپڑے کافی گندے تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اور وہ کافی کمزور دکھائی دے رہا تھا عرفان اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اور چار منگائی ـــ برلی بیٹھا خالی نظروں سے سامنے دیوار پر لگے ہوئے کسی بیکری کے خوبصورت کلنڈر پر بنے ہوئے خوش رنگ بڑے سے کیک کو گھور رہا تھا۔
عرفان نے اسکی للچائی ہوئی نظروں کو پڑھ لیا۔ اور سینڈوچ اور کیک منگائے ـــ تھوڑی دیر بعد اسکے چہرے پر رونق آ گئی اور وہ تازہ دم ہو گیا۔
"تم اس دن اپنی "بلونڈ" کو چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے" عرفان نے پوچھا۔
"مسٹر عرفان۔ بات یہ ہے کہ ہم اس لڑکی سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اپیر خرچ کرنے کو میرے پاس پیسہ نہیں ہے۔ وہ میری بلونڈ نہیں میرا اتنی بڑی دنیا میں کوئی نہیں۔ اب ہر لڑکی

جو ہم کو ملتا ہے دو روز تک میری بلوڈ رہتا ہے۔ تیسرے دن وہ ہمارے لئے عورت ہو جاتا ہے آپ کو شاید تعجب ہو کہ میں اسکو اس طرح آپ کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر مسٹر عرفان ہم کو پتہ ہے اگر ہم یہ نہ کرتا تو چند روز بعد وہ لڑکی ـــ بار برا ـــ میرے ساتھ یہی کرتا۔ مولی نے ہم کو ایسا ہی لیسن LESSON دیا ـــ ہر لڑکی صرف چند آدمیوں کے لئے بہن بیٹی یا بلوڈ ہوتا ہے۔ باقی تمام دنیا کے لئے وہ صرف عورت ہوتا ہے۔ صرف عورت ـــ اور مسٹر عرفان کر سچ یہی لڑکی بہت کم کسی کا بہن یا بیٹی ہوتا ہے وہ سب سے پہلے عورت ہوتا ہے پھر کچھ اور ـــ یہ ہمارا EXPERIENCE ہے۔ شاید آپ کو برا لگے کہ ہم اپنے لوگوں کے خلاف کہتا ہے پر سچ یہی ہے ـــ جب ہم کو معلوم ہے کہ وہ پہلے عورت ہے پھر کچھ اور تو میں کیوں اسکو بلوڈ سمجھ کر خود کو دھوکے میں رکھے ـــ؟"

"لیکن مولی کو تم اب بھی لو کرتے ہو؟"

"مسٹر عرفان ہم آپ کو ایک بات بتاتا ہے۔ مولی جب اونچا اڑنے لگا۔ اور کار والا دوستوں کے سامنے ہم کو پہچانتا تک نہیں تھا تو میں نے ایک بار اسے تین سو روپیہ دکھا کر بولا۔ 'مولی ہم سٹے میں تین سو روپیہ جیتا ہے۔ اور شاپنگ کرنے جاتا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلے گا؟' اور وہ فوراً تیار ہو گیا۔ پھر وہ ہمارے ساتھ ایسا لگ کر چلتا تھا اور ایسا مجھ سے مسکرا کر پیار سے باتیں کرتا تھا۔ جیسے سچ مچ وہ ہم کو بہت لو کرتا ہو۔ ہم اسے بہت سا تحفہ خرید کر دیا۔ پکچر دکھایا۔ ڈانس کیا۔ شراب پلایا اور پھر وہ بغیر تکرار کے میرا ساتھ میرا کمرہ میں چلا گیا۔ اس سے پہلے ہم اسکو صرف دو تین بار بہت RESPECT کے ساتھ کیس کیا تھا مگر اس دن جب وہ میرا کمرے پر گیا تو میرا بلوڈ نہیں تھا۔ ایک عورت تھا۔ اور وہ برتی کے پاس نہیں گیا تھا۔ ایک مرد کے پاس گیا تھا۔ جو اسے ساٹھ ستر روپے کا پریزنٹس دیا۔ تیس چالیس روپیہ اس پہ اور خرچ کیا اور جس کا جیب میں ابھی اور نقد روپیہ باقی تھا۔

وہ ذرا دیر ٹھیرا پھر یکایک عرفان سے سوال کر ڈالا۔

"آپ جانتا ہے اسکے ساتھ کیا کیا؟"

"کیا؟" عرفان کے منہ سے نکل گیا۔

"میں اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اور وہاں اسے ایک ایسا آدمی کے پاس چھوڑ گیا جس کا جیب میں روپیہ تھا اور جسکو عورت کی ضرورت تھی ـــــ جیسا ہم باربرا کو آپکے پاس چھوڑا تھا ـــــ اور جب دوسرے دن وہ مجھے ملا تھا تو ہم سوچا کہ وہ ہم سے ناخوش ہوگا ـــــ ہمارا COMPLAINT کرے گا ـــــ مگر وہ کچھ بھی نہ بولا۔ جیسے کوئی بات نہ ہوا ہو ـــ کاش وہ کچھ کہا ہوتا۔ ہم پر ناخوش ہوتا ـــــ وہ ہم سے صرف یہ پوچھا" ہنی تمہارا پاس پیسے ہیں۔ اسپلنڈڈ میں اسپینی ڈانسر آیا ہے " میری جیب میں سو سے زیادہ روپیہ تھا مگر میں اسے جواب دیا کہ میرا پاس صرف پکچر دیکھنے اور عمدہ چار کے لئے پیسہ ہے تو وہ بالکل انکار کر گیا۔ اب وہ شراب بہت پیتا ہے۔ بغیر شراب کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی شام جب اس کا کوئی انگیجمنٹ نہیں ہوتا تو وہ میرے پاس آتا ہے اور اگر میرا پاس بھی زیادہ پیسہ نہیں ہوتا تو اس پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ شراب کی بوتل خرید کر ہم اپنے کمرے پر چلی کر بیٹھیں۔ اس وقت وہ بالکل فری FREE ہو جاتا ہے۔"

وہ مستقل مونث کو مذکر بول رہا تھا۔ اور عرفان کو اس بے تکی اردو سے خاصی چڑ ہو گئی۔ پھر یہ کہ اسنے دیکھا کہ برٹی "بے حد جذباتی" ہو رہا ہے۔ اس لئے اسنے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"برٹی زندگی اس طرح تو نہیں گذر سکتی۔ تم آخر ملازمت کیوں نہیں کر لیتے ؟"

"پہلا بات یہ مسٹر عرفان کہ ہم اتنا پڑھا لکھا نہیں کہ ہم کو کوئی اچھا سا جاب JOB مل جائے پھر بھی میں اپنا 'ملا ٹنگ' کے وجہ سے کمانے کا بہت سا دھندا کر سکتا ہے انشورنس ایجنٹ ہو سکتا۔ پراپرٹی بروکر ہو سکتا۔ سیلز مین ہو سکتا، کمیشن ایجنٹ ہو سکتا۔ اور اسی موافق بہت سے کام ہم کر سکتا جس سے روپیہ پیدا ہو سکے۔ پر مسٹر عرفان سارا پرابلم یہ ہے کہ میں کس کا واسطے یہ سب کچھ کریں۔ اتنا بڑا دنیا میں اپنا تو کوئی بھی نہیں جو میرا کامیابی پر خوش ہو یا میری ناکامیابی پر میرا ہمت بڑھائے۔ کوئی بھی تو نہیں جس کی خوشی اور غم میری خوشی اور غم پر ڈپنڈ کرے۔ جو میرا ساتھ اداس ہو۔ میرا ساتھ مسکرائے۔ کندھے سے کندھا ملا کر چلے۔ میں سوچا تھا کہ مولی کے لئے سب کچھ کرینگا۔ اور ہم مولی کا واسطے سب کچھ کرتا۔ اس کے لئے ہم چوبیس گھنٹہ محنت کرتا۔ مگر وہ میرا ساتھ نہ دی۔ وہ دوسرا راستہ پر چلا گیا۔ ہم [illegible] کا بیک اس کے لئے شروع کیا۔

بتا کر رخصت ہو گیا۔

ایک ہفتہ تک وہ عرفان کے ساتھ رہا خوب تفریحیں کیں۔ فلمیں دیکھیں ڈانس دیکھے اپنے لئے عمدہ کپڑے خریدے۔ اور عرفان کو ایک خوبصورت اور قیمتی سگریٹ کیس پریزنٹ کی ــــ اس درمیان اسنے کسی بھی لڑکی کا نام نہ لیا۔

اسکے بعد کافی دنوں تک جب عرفان کو برٹی نظر نہ آیا اسے تشویش ہوئی اور ایک دن وہ اسکے کمرے پر پہنچ گیا۔ برٹی لاغر اور کمزور چارپائی پر لیٹا تھا۔ اور سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی مقدس مریم کی معصوم تصویر کو گھور رہا تھا۔ عرفان کمرے میں چلا گیا۔ مگر اسے پتہ نہ چلا۔ عرفان نے جب اسے پکارا تو وہ چونکا۔

"اوہ مسٹر عرفان آیئے"

اسنے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ عرفان نے اسے منع کر دیا۔

"کیا ہو گیا تم کو برٹی ــــ؟"

"ایک مہینے سے بخار اور کھانسی تھی۔ مگر پچھلے ہفتے ڈاکٹر نے ایکسرے لے کر بتایا ہے کر ٹی بی ہے۔ وہ تو پہلا اسٹیج ہی بتایا مگر ہم سوچتا ہے کہ وہ ہمارا تسلی کو ایسا کہہ دیا ــــ خیر ــــ اچھا ہوا آپ آگیا ــــ میں اکیلا تھا اور سوچتا تھا کہ میں مرجاؤں گا پر کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مسٹر عرفان آپ آگیا ہم بہت خوش ہے کل ہم سینے ٹوریم چلا جائے گا پھر کون جانتا ہے واپس آئے گا کہ نہیں ــــ آپ میرا ایک کام کر دے گا؟"

"کہو"

"مہینے کا آخری ہفتہ ہے۔ مولی اپنے گھر پر ہی ہوگا۔ آپ اسے بلا دو۔ مگر اس کا لئے بوتل کا انتظام ضرور کر دیجئے۔ مولی پینے کے بعد بالکل فری ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایسا ــــ BE HAVE کرتا ہے جیسے وہ ہم کو بہت محبت کرتا ہے۔ کل ہم سینے ٹوریم چلا جائے گا۔ میں چاہتا ہے کم سے کم آج کی شام وہ میرے پاس رہے کہ میں اکیلا پن نہ FEEL کروں۔"

عرفان گیا مگر اسکو مولی گھر پر نہ ملی۔ اور نہ کہا اسے میں برٹی کو یہ مایوس کن خبر سنانے کی

ہمت تھی ——

اور دوسرے دن ہری مینے ٹوریم چلا گیا ——

یکایک ملی جلی آوازوں کے شور نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے بھانجے بھتیجے باغ کے باہر چہکتے ہوئے ریگزار پر سے گذرتے ہوئے اونٹوں کے ایک قافلے کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس اونٹ جن پر سامان لدا تھا۔ ایک قطار میں ایک رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے اور سب سے پیچھے کے اونٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ باقی تمام اونٹوں پر صرف سامان لدا تھا۔ تمام کے تمام اونٹ ریگ زار کی گرمی اور ایک طرف بہت ہی خوبصورت ہرے بھرے درختوں سے بے نیاز اپنی منزل کی سمت چلے جا رہے تھے۔ ان کے عقب میں صاف گہرا نیلا آسمان تھا اور اس پس منظر پر یہ قافلہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اسکے ساتھ آئے ہوئے تصویر لینے کی کوشش میں اس قافلے کے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے —— اس نے دیکھا سائرہ ایک گوشے میں کھڑی بہت غور سے دور گذرنے والے قافلے کو دیکھ رہی ہے۔

یکایک اسے خیال آیا کہ یہ قافلے بھی درختوں پر کھدے ہوئے ناموں کی طرح ہیں۔ یہ ریگزار برسوں سے یہاں ایک ہی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس پر سے نہ جانے کتنے قافلے گذرے ہوں گے۔ اور نہ جانے کتنے قافلے اور گذریں گے۔ ہر قافلہ اپنے نقش قدم چھوڑ کر کہیں دور نکل جاتا ہے۔ پھر کوئی دوسرا قافلہ آتا ہے۔ جو پرانے نقش قدم مٹا کر نئے نقش بناتا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا ہے مگر کوئی بھی ایک تپتے ہوئے ریگزار کا رفیق نہیں۔ یہ ہمیشہ سے یونہی تنہا ہے۔ یہ تمام اونٹ جو ابھی گذرے ہیں۔ انہیں اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے مگر اسے ایسا لگتا ہے جیسے وہ انہیں ہمیشہ سے دیکھتا آیا ہو۔ کیونکہ تمام اونٹ ایک جیسے ہوتے ہیں —— یہ تمام نام جو ان درختوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ کسی کو نہیں جانتا۔ مگر اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان میں ہر ایک کو جانتا ہے۔ سب کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ صرف اس لئے کہ تمام انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور بہت سے آدمیوں کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔

سندھیا ـــ شاکرہ ـ اسد ـ پرکاش ـ ڈولی ـ سروج ـ پشپا ـ دیپ ـ یہ تمام نام جو ان درختوں پر لکھے ہوئے ہیں ـ ان میں سے وہ کسی کو نہیں جانتا ـ پھر بھی وہ ایسا محسوس کرتا ہے جیسے ہر ایک کو اچھی طرح جانتا ہے ـــ ان تمام لوگوں کو جنہوں نے یہ نام کھودے ہیں ـ ہو سکتا ہے وہ نہ جانتا ہو مگر ان تمام ناموں کو جو یہاں کھدے ہوئے ہیں وہ اچھی طرح جانتا ہے ـــ

"دیپ" ـــ

اسے دیپ یاد آیا ـ

کھدر کا سفید کرتہ اور سفید پاجامہ پہنے ـ پیروں میں ایک معمولی سی چپل اٹکائے بال بکھرے اداس چہرے اور کھوئی ہوئی ذہین آنکھوں والا دیپ ـ دیپ جو ایک آرٹسٹ تھا ـ ایک آرٹسٹ جو سارے ملک میں مانا جاتا تھا ـ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا ـ لڑکیاں جس پر چپکے چپکے دل ہی مرا کرتی تھیں ـ اس سے ملنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھیں ـــ جو نوجوانوں میں اتنا ہی مقبول تھا ـ ملک کے پڑھے لکھے لوگ اسکی عزت کرتے تھے ـ مگر خود ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھا ـــ اپنے فن کی دنیا میں گم ـ

آرٹ گیلری میں اسکی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی ـ اور منتظمین کے اس اصرار پر کہ بہت سے لوگ تصویروں کے ساتھ ان کے خالق کو بھی دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں ـ اس سے بالمشافہ گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اسکے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں ـ وہ چلا آیا تھا ـ اور دیکھنے والوں کی بھیڑ سے بے نیاز الگ ایک کونے میں اپنی ایک تصویر کے چوکھٹے سے لگا سگریٹ کے کش لے رہا تھا ـ

"مسٹر دیپ ـ میں کئی روز سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی ـ آج مجھے فون پر بتایا گیا کہ آپ بھی گیلری میں تشریف لانے والے ہیں ـ"

دیپ نے مخاطب کو دیکھا اور چونک گیا ـ

اس سڈول جسم ـ بڑی بڑی آنکھوں ـ لمبی پلکوں اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے پتلے لبوں والی اس معصوم صورت لڑکی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا ـ

اس لڑکی نے اسے غور سے دیکھا ـ پھر اسکے پاس دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر "ماضی کے سائے" کو دیکھا اور پھر اسے دیکھنے لگی ـ اتنے میں اس کا شوہر جگدیش ان کے پاس آ گیا ـ جگدیش نے چونک کر

دیپ کو غور سے دیکھا۔
"ارے ستیش تم ـــ" جگدیش دیپ سے لپٹ گیا۔ اور وہ ان دونوں کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ پھر جگدیش نے اس لڑکی کی طرف مڑ کر کہا۔
"کلا یہ میرے عزیز دوست ستیش چندر سرپاستو ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ آرٹسٹ ہیں لیکن نہیں معلوم تھا کہ مشہور آرٹسٹ دیپ یہی ہیں۔ دیپ یہ تمہاری بھابی کلا ہیں۔"
دونوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔
"ہاں بھئی دیپ تم اتنے دن کہاں غائب رہے اور ٹھیرے کہاں ہو؟"
"فرسکو میں۔"
"میرے ساتھ گھر چلو اور وہاں سے سامان اٹھالاؤ۔ تم اس شہر میں میرے گھر کے علاوہ کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔"
جگدیش کا وسیع اور خوبصورت بنگلہ سمندر کے کنارے بہت دلکش اور پرسکون جگہ پر واقع تھا۔ لان سے صرف چند قدم پر سمندر تھا اور آس پاس اگے ہوئے ناریل کے درخت دُور سے پانی میں کھڑے ہوئے معلوم ہوتے۔
دیپ کو سمندر کی طرف کا ایک آراستہ کمرہ دے دیا گیا۔
"کلا۔ آرٹسٹ لوگ بہت خود فراموش ہوتے ہیں یہ تو تم جانتی ہی ہو۔ ان کا خیال رکھنا خود ان کو نہ کبھی اپنا خیال آئے گا اور نہ یہ تم سے کچھ کہیں گے۔ یہ تمہارا کام ہے کہ تم ان کی ضرورتوں اور ان کے آرام کا ہر ممکن خیال رکھو۔" جگدیش نے کلا سے کہا۔
دوسرے دن دیپ اپنے کمرے میں بیٹھا سامنے اسٹینڈ پر لگی ہوئی اپنی نامکمل تصویر کو گھور رہا تھا کہ کلا آگئی۔
"میں مخل تو نہیں ہوئی ـــ؟"
"آیئے آیئے" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"کل میں آپ کو پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکی۔ دہلی میں جب آپ کلب میں ہم لوگوں کو پینٹنگ سکھانے آتے تھے تو کتنے سلیقے سے سوٹ پہنتے تھے۔ روز شیو کرتے تھے۔ نفاست سے

بال سنواتے تھے۔ کتنے فیشن ایبل تھے آپ اب تو آپ بالکل ہی بدل گئے۔"
دیپ نے خاموشی سے ایک سگریٹ سلگا لیا۔
"آپ کو کلب کی وہ شامیں تو نہ بھولی ہوں گی؟" کلا نے پھر پوچھا
"کاش میں بھول سکتا" یکایک دیپ کے منہ سے نکل گیا۔ پھر ذرا دیر وہ خاموشی سے کچھ سوچتا رہا۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔

"بہت سی باتیں انسان کوشش کے باوجود نہیں بھلا سکتا۔ حالانکہ ان کا بھلا دینا ہی اچھا ہوتا ہے ــــ کلب کی وہ شامیں شاید میں بھول بھی جاتا مگر ــــ کسی کے ساتھ گذارے ہوئے وہ حسین لمحات میں نہیں بھلا سکتا۔ یہی سب سے بڑی مشکل ہے۔"
"کون تھا وہ؟"

"وہی جس کو شاید یہ پتہ بھی نہ ہو کہ وہ کسی کی روح میں اتر گیا تھا۔ کسی کی زندگی بن گیا تھا۔ وہ تو بس زندگی میں ایک ہلچل مچا کر چلا گیا۔"
"کیا آپ نے اپنے دل کی بات اسے بتادی تھی۔؟" کلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت سے جذبات کا الفاظ میں اظہار ان جذبات کی توہین ہوتا ہے۔ میں نے اگر غلط نہیں سمجھا تھا تو اسے نہ صرف میرے جذبات کا علم تھا بلکہ خود اسکے جذبات بھی مختلف نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسکے باقاعدہ اظہار کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ خیر چھوڑیئے اس کا کیا ذکر ــــ گذری ہوئی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے ــــ"
"لیکن اگر گذری ہوئی باتیں زندگی کے لئے مصیبت بن جائیں تو اس کا کوئی نہ کوئی حل تو ڈھونڈھنا ہی پڑے گا۔" کلا کی نظریں اب بھی دیپ کے چہرے پر تھیں۔
"کلا۔ بھگوان کے لئے دبی ہوئی چنگاریوں کو نہ کریدو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" دیپ تقریباً چیخ اٹھا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد اسنے اپنا زیادہ تر وقت باہر گذارنا شروع کر دیا۔ مگر جب بھی وہ گھر پر آتا کلا کو چشم براہ پاتا۔ وہ کتنی ہی دیر سے آتا کلا اسے اپنے ہاتھوں سے گرم کر کے کھانا دیتی۔ اس کے لئے

چائے بناتی۔ اس کے لئے عمدہ قسم کے سگریٹ منگاکر موجود رکھتی۔ اس کا بستر ٹھیک کرتی۔ اور یہ تمام باتیں دیپ کو شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتیں۔ اس میں ضبط کا یارا نہ رہا۔ مگر وہ کلا کی زندگی میں کانٹے نہیں بونا چاہتا تھا۔ جگدیش اس کا عزیز دوست تھا۔ وہ اسکے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن دوسری طرف کلا تھی۔ جیسے وہ اس وقت سے جب وہ کلب میں پینٹنگ سیکھنے آیا کرتی تھی۔ اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا آیا تھا پوجتا رہا تھا۔ مگر اسنے کبھی اسکے اظہار کی ضرورت نہ محسوس کی تھی۔ اور اب کلا اس سے اس قدر بے تکلفی کا برتاؤ کرتی تھی کہ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ تمام باتیں جو وہ آج تک زبان پر نہ لایا تھا اب کلا سے کہہ دے اسے بتا دے کہ اسنے زندگی میں صرف کلا کو چاہا ہے۔ کلا اس کی نس نس میں رچ گئی ہے۔ لیکن وہ کلا کو کانٹوں میں نہ کھینچنا چاہتا تھا۔ وہ اسکی زندگی کو غمناک نہیں بنانا چاہتا تھا مگر خود کلا ہر موڑ پر اسکے سامنے آجاتی تھی۔ وہ جب بھی مایوس ہو جانا چاہتا وہ نظر اک نہ اک چال چل دیتی۔

ایک دن کلا نے اس سے پوچھ لیا۔

" دیپ بابو ــــ آپ نے اپنا نام کیوں بدل دیا؟"

اسنے کوئی جواب نہ دیا۔

" بولئے نا ــــ"

" کلا آخر تم چاہتی کیا ہو ــــ؟ تم سب کچھ جانتی ہو۔ پھر کیوں میرے زخموں کو کریدتی رہتی ہو۔ تم نے اپنی منزل پالی ہے اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم دوسرے راہرؤں پر قہقہے لگاؤ" آخر وہ جھلا کر بول اٹھا۔

" میں سب کچھ جانتی ہوں اسی لئے آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ میں آپ کی زبان سے وہ تمام باتیں سننا چاہتی ہوں جو میں جانتی ہوں۔ آپ میں جرأتِ اظہار کی جو کمی ہے میں اسے دور کرنا چاہتی ہوں۔ میں اتنے دنوں سے آپ کی تلاش میں تھی مگر آپ اتنے بزدل ہیں کہ آپ نے اپنا نام تک بدل لیا تھا کہ کہیں میں آپ کو ڈھونڈھ نہ لوں۔ جب میں نے آرٹ گیلری میں آپ کی تصویر "ماضی کے سائے" میں اپنی شبیہہ دیکھی تو مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ مگر اسوقت

مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اس میں ارادے کو دخل ہے۔ میں نے سوچا تھا یونہی اتفاقاً صورت مل گئی ہوگی ۔۔۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود آپ مجھ سے چھپ کر نہ رہ سکے۔ یہ جو آپ تمام دن باہر رہتے ہیں اور گھر آنے سے کتراتے ہیں اس کا مطلب سمجھتی ہوں ہزاروں دن سے آپ نے یہ نامکمل تصویر اسٹینڈ پر لگا رکھی ہے۔ لیکن اتنے دن سے آپ اسے صرف ۔۔۔ گھورتے رہے ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا؟ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ سوچنے سے بھی گھبراتے ہونگے۔"

کلا نے بہت پر اعتماد اور نرم لہجے میں کہا اور دیپ عجیب آنکھیں نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

دوسرے دن جب کلا اسکے لئے ناشتہ لے کر آئی تو اسنے کہا۔

"آپ یہ تصویر مکمل کر ڈالئے۔"

"سوچتا میں بھی یہی ہوں۔ بشرطیکہ تم میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔"

کلا اسکے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ دیپ نے کئی رنگ تیار کئے برش صاف کئے اور پھر ایک برش لے کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک وہ کلا کو گھورتا رہا مگر اسنے تصویر کو برش نہ لگایا۔ آخر کلا بول اٹھی۔

"آپ یونہی بیٹھے مجھے گھورتے رہیں گے۔ یا تصویر مکمل کرینگے؟"

وہ چونکا پھر آہستہ سے بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسا رنگ بھروں۔ تمہاری تخلیق میں بھگوان نے نہ جانے کونسا رنگ استعمال کیا ہے جو مجھے بہت پسند ہے مگر جسے میں اور رنگوں سے الگ نہیں کر پاتا۔ میں اس تصویر کو اپنا شاہکار بنانا چاہتا ہوں۔ مگر جب تک مجھے اس رنگ کا پتہ نہ چل جائے میں تصویر مکمل نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تو میں بے فکر ہو کر بیٹھتی ہوں۔ آپ اطمینان سے وہ رنگ ڈھونڈھ لیجئے۔" کلا نے شوخی سے کہا اور پہلو بدل کر آرام سے بیٹھ گئی۔

پھر یہ ہوا کہ کلا گھنٹوں دیپ کے سامنے کرسی پر بیٹھی رہتی۔ وہ اسے دیکھتا رہتا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس سے ایک آدھ بات کر لیتا۔ اور آہستہ آہستہ تصویر بناتا جاتا۔

کلا اور دیپ زیادہ تر ایک ساتھ رہتے۔ جگدیش دیر سے گھر آتا تھا۔ اس کو کھانا کھلا کر کلا پھر دیپ کے پاس چلی آتی اور کافی رات گئے تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔

جگدیش کی ماں نے دبے لفظوں میں جگدیش سے اس کے متعلق کہا بھی تو وہ ہنس کر ٹال گیا۔

"ماں مجھے کلا پہ اور اس سے زیادہ دیپ پر بھروسہ ہے وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ دیپ کو میں جانتا ہوں اس سے کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی امید نہیں کی جا سکتی۔"

"مگر وہ ہر وقت اسکے کمرے میں گھسی رہتی ہے۔"

"اس سے کیا ہوا —— تم کو معلوم ہے ماں۔ دیپ کتنا بڑا آرٹسٹ ہے اور کلا کو آرٹ سے کس قدر لگاؤ ہے۔ دہلی میں کلا دیپ سے پینٹنگ سیکھا کرتی تھی۔ کلا کو دن بھر کوئی خاص کام تو ہوتا نہیں۔ اکیلی پڑی گھبرا جاتی ہوگی۔ دونوں ہم مذاق ہیں۔ ساتھ بیٹھ جاتے ہیں تو کیا ہرج ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔"

جگدیش اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وسیع النظر آدمی تھا۔ اسنے کبھی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت نہ دی۔ بلکہ اسے کسی حد تک خوشی تھی کہ دیپ کا اسکے گھر میں دل لگ گیا ہے اور وہ کسی حد تک مطمئن اور مسرور نظر آتا ہے۔ تنہا کھوئے کھوئے اور اداس دیپ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اسے بہت عزیز تھی۔

اکثر دیپ اور کلا گھومنے تفریح کرنے اور سینما دیکھنے چلے جاتے۔ اکثر وہ ساتھ باہر جاتے اور دیر تک باہر رہتے مگر جگدیش نے کبھی بھی اس کا کچھ خیال نہ کیا۔

دیپ کو دہلی کی ایک بہت بڑی اشتہاروں کی فرم نے ایک ہزار روپے ماہانہ کی پیشکش کی تو وہ کئی دن تک سوچتا رہا —— وہ کلا کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا مگر وہ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ جب جگدیش اور کلا دونوں نے مل کر اصرار کیا کہ اسے یہ پیشکش قبول کر لینی چاہئے تو اسے مجبوراً جانا ہی پڑا۔ مگر وہاں ایک دن بھی اس کا دل نہ لگا۔ کلا سے وہ بے حد محبت کرتا تھا مگر اسے اپنے اس جنوں کا انجام کبھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کلا اسکی نہیں ہو سکتی تھی یہ کلا کو بھی معلوم تھا اور اسے بھی —— مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کا انجام سوچنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ نہ ہی وہ اپنے جذبات پر قابو پا سکتے تھے۔ اور یہ کرب کم از کم دیپ کے لئے ایک سلگتی ہوئی گیلی لکڑی سے کم نہ تھا جو بھڑک نہیں سکتی تھی صرف دم گھوٹنے والا دھواں پیدا کر سکتی تھی۔

چند ماہ میں ہی دیپ نے وہ ملازمت ترک کر دی۔ اور واپس جگدیش کے یہاں چلا گیا۔ جگدیش نے سوچا۔ دیپ پابندی کا عادی نہیں اور یہ جگہ شاید اسے کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔ اس لئے اسنے کچھ بھی نہ پوچھا۔ اسے خوشی ہی ہوئی کہ دیپ اسکے ساتھ رہ کر سکون محسوس کرتا ہے۔

دیپ کو سوائے کلا سے باتیں کرنے، اسکے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جانے اور کبھی کبھی تصویریں بنانے کے کوئی کام نہ تھا۔ یہاں وہ مطمئن تھا۔ کم از کم وہ کلا کو دیکھ سکتا تھا، اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ وقت گذار سکتا تھا۔ کلا کی رفاقت ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ اس کے آگے وہ کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس کی فکر کے تمام راستے مسدود تھے۔ اور یہ احساس اسے شدید کرب میں مبتلا رکھتا تھا۔

جگدیش کے دوستوں حتیٰ کہ عزیزوں تک نے دبے دبے اور آخر میں کھلے الفاظ میں کہنا شروع کیا کہ دیپ کے ساتھ کلا کا اس آزادی سے گھومنا پھرنا مناسب نہیں۔ اور یہ کہ اس سے جگدیش کی بدنامی ہو رہی ہے ۔۔۔ شروع میں تو اس نے ان تمام باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ مگر آخر اسے سوچنا ہی پڑا ۔۔۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسنے خود بھی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ کلا اور دیپ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے ہیں مگر اسے کلا اور دیپ دونوں پر مکمل اعتماد تھا اور وہ جانتا تھا کہ اسکے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگے گی۔

ایک شام دیپ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا کہ کلا آگئی۔

"دیپ باہر نہیں چلو گے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" کلا نے اسکے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

"کلا ۔۔۔ لوگ ہم دونوں کے تعلقات کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں۔ جگدیش سنے گا تو کیا سوچے گا۔ وہ میرا دوست ہے اور مجھ پر اعتماد کرتا ہے اگر میرے سبب اسکے اعتماد کو ٹھیس پہنچی تو سوچو اسکی کیا حالت ہوگی ۔۔۔ تم دونوں کی زندگی خوشگوار ہے کیا میری خود غرضی نہیں ہوگی کہ میں تم دونوں کی زندگی میں تلخیاں پیدا کر دوں ۔۔۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔ میں کبھی بھی اس قدر نہیں گر سکتا ۔۔۔ تم میری نہیں ہو سکتی یہ ایک حقیقت ہے میں نے تمہارے

پتاجی سے ہم کو مانگا تھا تو انہوں نے مجھے صاف جواب دے دیا "۔۔۔
"تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا ۔۔۔؟" کلا نے اسکی بات کاٹ کر جوش سے کہا۔
مگر دیپ اسی طرح پرسکون رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ اپنی بات کہتا رہا۔
"ان کا خیال تھا کہ میں ایک غیر ذمہ دار نکما نوجوان ہوں۔ اور یہ کہ تمہاری شادی کسی بہت بڑی جگہ کرنے والے تھے۔ مجھے اس وقت مایوس ہو جانا چاہئے تھا مگر قسمت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ بہت بڑا آدمی جگدیش نکلا اور تم پھر میرے راستے میں آ گئیں۔ اور اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں ۔۔۔ کلا میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم میری نہیں ہو سکتی ہو ۔۔۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔ تمہارے خیال سے دامن نہیں چھڑا سکتا ۔۔۔"
وہ ہتھیلی سے اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ اور کلا کا چہرہ دھندلا گیا اور اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
دیپ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔
"میں جانتا ہوں کہ تم میرے لئے ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سراب مایوسی کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔ مگر تم اس آدمی کے کرب اور اسکی تشنگی کا اندازہ کرو جو سراب کو سراب سمجھتے ہوئے بھی صرف اس لئے اسکے پیچھے بھاگتا ہے کہ اگر اس سے نظریں ہٹالے تو پھر کہاں دیکھے۔ مایوسیوں کا تعلق بہر حال امید سے ہے۔ اگر مایوسی بھی نہ ہو تو وہ کیسے زندہ رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔"

اور دوسری حسین شام کو جب دیپ اپنے کمرے کی کھڑکی سے سمندر کی بے چین لہروں کو یونہی بے مقصد گھورے جا رہا تھا تو جگدیش آ گیا۔
"ارے بھئی دیپ۔ شام اتنی حسین ہے اور تم اپنے کمرے میں بند ہو۔ چلو چل کر سمندر کے کنارے ٹہلتے ہیں۔"
جگدیش نے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ خاموشی سے اسکے ساتھ ہو لیا۔
"دیپ آج کل تم بہت خاموش اور مضمحل نظر آتے ہو۔ کیا بات ہے ۔۔۔؟"
"کوئی بات نہیں۔" دیپ نے آہستہ سے جواب دیا۔

"دیپ تم میرے عزیز ترین دوست ہو۔ اور دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں تمہارا دکھ بانٹ لوں ۔۔۔ میری کوئی بات اگر تم کو ناگوار گذرے تو مجھے معاف کر دینا اس لئے کہ اس میں میرے ارادے کو قطعی دخل نہ ہو گا۔ لیکن کسی بات کو غلط مفہوم دینے کی کوشش نہ کرنا۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم بہت مضطرب رہتے ہو۔ اور مجھے تمہاری پریشانی کا علم بھی ہے۔ ایسی صورت میں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تمہارے لئے جو کچھ بھی کر دوں کم ہے۔"

جگدیش خاموش ہو گیا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ آگے اسے کیا کہنا ہے اور کس طرح کہنا ہے۔ اسنے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"کلا بہت حسین عورت ہے اور وہ ہمیشہ ایک وفادار بیوی رہی ہے اسنے کبھی بھی مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔ لیکن وہ میری محبوبہ نہیں ہے شادی سے پہلے میں اسے جانتا بھی نہ تھا ۔۔۔ میں نے اس سے شادی کی اور وہ میری بیوی بن گئی ۔۔۔ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ وہ بہت حسین ہے مگر پھر بھی وہ میرے لئے زندگی کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسکے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ اور اگر کسی دوسرے آدمی کے لئے وہ زندگی کا مسئلہ بن گئی ہو اور اس آدمی کے خلوص پر بھی اعتماد کیا جا سکے تو یقیناً اس شخص کے حقوق اس پر مجھ سے زیادہ ہوں گے۔ کل شام میں نے اتفاق سے تم دونوں کی گفتگو سن لی تھی۔ تمہارے لئے وہ زندگی کا مسئلہ بن گئی ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس یہی بات کلا کے ساتھ بھی ہے ۔۔۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ کیا میں تمہارے لئے اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتا۔ یقین کرو تمہاری زندگی بنا کر مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ اور میں تمہارے حق میں کلا سے دستبردار ہو کر فخر محسوس کروں گا ۔۔۔ تمہیں اس کا بھی خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ مجھ کو مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ میں پرانے خیال کا آدمی نہیں۔ اور سول کورٹ یہ مسئلہ حل کر دینے کے لئے کافی ہے۔"

"جگدیش بھگوان کے لئے خاموش ہو جاؤ ۔۔۔" دیپ نے بہت تکلیف سے کہا۔

"دیپ جذباتی نہ بنو ۔۔۔ میں نے تمام رات اس مسئلے پر سوچا ہے۔ اور سوچ سمجھ کر یہ باتیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ میری بات پر غور کرو۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"جگدیش ۔۔۔ مجھے اتنی سزا نہ دو۔ آدمی کبھی کبھی جذبات سے مغلوب ہو کر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ مگر تم نے میری آنکھیں کھول

دی میں ۔۔۔" اور پھر دیپ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔

صبح جب جگدیش اس کے کمرے میں گیا تو دیپ کمرے میں نہ تھا۔ پینٹنگ کا سارا سامان ویسے ہی پڑا تھا۔ اس کی نامکمل تصویر اسی طرح اسٹینڈ پر لگی تھی اور میز پہ ایک چٹ پڑی تھی۔

"جگدیش میں جا رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا ۔۔۔ دیپ"

پھر کئی سال تک جگدیش کو دیپ کا کچھ پتہ نہ چلا ۔۔۔ پھر معلوم ہوا کہ دیپ نے مصوری کم و بیش ترک کر دی ہے۔ اور بے حد شراب پینے لگا ہے۔ اسکے بعد معلوم ہوا کہ دیپ سینے ٹوریم میں ہے لیکن جب جگدیش اسے دیکھنے گیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ چند روز قبل بغیر کسی اطلاع کے سینے ٹوریم سے چلا گیا۔

اور ایک دن اتفاق سے جگدیش کو وہ اسی شہر میں مل گیا۔ بالکل بدلا ہوا۔ ایک آوارہ سا آدمی لگتا تھا وہ۔ کئی دن کا شیو۔ لمبے بے ترتیب بال اور بے سلیقہ کپڑے۔

جگدیش اسے بہت خلوص اور پیار سے پکڑ کر اپنے بنگلے پر لے گیا۔

دیپ شدید ذہنی کرب کا شکار ہو گیا تھا۔ کلا اسکے سامنے آتی وہ نظریں پھیر کر بے نیاز بلکہ اجنبی بننے کی کوشش کرتا۔ حالانکہ یہ اسکے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دیپ سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتی تو وہ مختصر سے مختصر جواب دینے کی کوشش کرتا۔ حالانکہ ماضی ہر لمحے اسے اکساتا رہتا۔ وہ کلا کو نظر بھر کر دیکھنا چاہتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکتا ۔۔۔ وہ ڈرتا رہتا کہ وہ نظریں پھر کچھ نہ کہہ دیں۔ اور وہ بے بس ہو جائے ۔۔۔ دن بھر یا تو وہ کمرے میں بند سگریٹ پھونکا کرتا یا باہر جا کر شراب میں غرق ہو جاتا۔ اور ایک دن پھر وہ بغیر کوئی اطلاع دیتے وہاں سے چلا گیا۔

جگدیش نے اخبار میں پڑھا کہ دیپ بے حد بیمار ہے ڈاکٹر نے اسے شراب کی طرف دیکھنے تک کی ممانعت کر دی ہے مگر وہ مانتا نہیں۔ پھر ایک صبح جگدیش کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا۔ اخبار کی ایک نمایاں سرخی تھی ۔۔۔ " ملک کے مشہور آرٹسٹ دیپ کا کثرت شراب نوشی کے سبب کل رات انتقال ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک سا چلا تھا۔ اسنے جاکر تھرماس سے چاء انڈیل کر پی اور پھر دری پر

لیٹ گیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال سے زیادہ ہونے کو آئی تھی۔ اور اس طویل عرصے میں گذرے ہوئے کتنے واقعات اسکی نظروں کے سامنے آ گئے تھے کتنے بھولے بسرے چہرے اسکی آنکھوں میں گھوم رہے تھے ــــ سکون انسان کو ماضی کی طرف لے جاتا ہے اور ماضی انسان کو ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔

یکایک اسے سائرہ کا خیال آیا۔ اس کی خاموش تنہا اور اداس لڑکی سائرہ جس کی ماں اسے بچپن میں ہی چھوڑ گئی ــــ خود اسے چند قدم سے زیادہ کسی کی بھی تو رفاقت حاصل نہ ہوئی ــــ اور اسکی بچی بھی اسی تنہائی اسی ازلی پیاس کا شکار ہو گئی ــــ وہ سائرہ کو ڈھونڈھنے لگا۔

وہ ایک درخت کی موٹی نیچی شاخ پر چڑھی ہوئی تھی۔ وہ شاخ سے چمٹی ہوئی بہت انہماک سے اپنا نام کھود رہی تھی ــــ سائرہ ــــ خوبصورت نمایاں نام ــــ اتنی بڑی دنیا میں اس کی بچی بھی تنہا ہے۔ اپنے باپ سے اسے بھی تنہائی ورثے میں پائی ہے ــــ اور اس لمحے اس کے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ کاش سائرہ اپنے نام کے ساتھ کسی اور کا نام بھی کھودے۔ اسنے خود سوچا کہ اس کی یہ خواہش کتنی عجیب ہے مگر پھر بھی یہ اسکی دلی خواہش تھی۔ کاش ایسا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ سائرہ صرف اپنا نام کھود رہی تھی۔ جلی حروف میں بہت ہی محنت سے بہت نمایاں طور پر ــــ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ سائرہ اس قدر منہمک تھی کہ اسے اپنے پیچھے اپنے پاپا کی موجودگی کا علم بھی نہ ہوا۔

خاموشی سے وہ اس جگہ سے ہٹ گیا اور پھر بے مقصد ادھر اُدھر ٹہلنے لگا تھوڑی دیر بعد جب سائرہ اپنی جگہ واپس آگئی تو وہ پھر آہستہ آہستہ اسی جگہ واپس پہنچ گیا اور کھدے ہوئے نام کو دیکھنے لگا۔ تازہ کھدا ہوا بہت گہرا بہت نمایاں نام۔ اسنے سوچا یہ نام کس قدر سادہ ہے اسے دیکھ کر کوئی بھی تو کہانی ذہن میں نہیں ابھرتی ــــ مگر جیسے جیسے یہ نام پرانا ہوتا جائے گا کہانی بنتا جائے گا ــــ ابھی اس نام کی کوئی اہمیت نہیں مگر چند سال بعد یہ نام بھی دوسرے ناموں کی طرح اہم ہو جائے گا۔ انسان کو ماضی کتنا اہم معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ چیز اسکے سامنے ہوتی ہے تو وہ اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتا مگر ــــ

یکایک اسے سائرہ کے نام کے اوپر کچھ نشانات سے نظر آئے۔ پھر اسنے غور کیا تو پتہ

جیلاکر بھی کوئی نام ہے ـــــ جو شاخوں کے موٹے ہو جانے کے سبب بہت پھیل گیا ہے۔ اسنے اپنا سر تھوڑا پیچھے کیا تو وہ نام صاف ابھر آیا۔

"نرنیدر پاشا ـــــ" عجیب سا لگا اسے یہ نام نرنیدر پاشا۔

لیکن وہ چونکا ـــــ ماضی کے دریچے آہستہ آہستہ پھر کھلنے لگے۔

یہ اس کا اپنا نام تھا جو اسے یاد بھی نہ تھا۔ جو اسنے خود نہ لکھا تھا لیکن اس کا لکھنے والا سادھنا کے علاوہ کوئی بھی نہ ہو سکتا تھا۔

جس زمانے میں وہ کالج میں پروفیسر تھا سادھنا بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ فطرتاً وہ خاموشی پسند تھا مگر بذلہ سنجی کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ اپنے مضمون کا وہ ماہر تھا۔ اور اس کے باوجود غرور اس میں نام کو نہ تھا۔ اسی لئے اسکے طالب علم اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اس کے خاص شاگردوں میں منہ پھٹ تیز اور خوبصورت بنگالی لڑکی سادھنا بھی تھی۔ جو اس سے ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب تھی۔

جیسے ہی سادھنا کو معلوم ہوا کہ پروفیسر جمیل پاشا بھی اسی ہوسٹل کے مردانہ حصے میں رہتا ہے۔ وہ اسکے یہاں پہنچنے لگی۔ بی اے میں اسکے پاس اختیاری مضامین میں سے ایک انگریزی ادب تھا۔ اور ایم اے وہ اسی مضمون میں کرنا چاہتی تھی۔ اور پروفیسر پاشا انگریزی کا مانا ہوا پروفیسر تھا۔ پاشا سے نہ صرف پڑھنے کے معاملے میں اسے ہر ممکن مدد ملتی تھی بلکہ فرصت کے اوقات بھی وہ اسکے گھر میں بیٹھی رہتی۔ اسکے شلف سے نکال کر کتابیں پڑھتی رہتی۔ اور کچھ کام نہ ہوتا تو گھر کی چیزوں کو ہی ترتیب دینے لگتی۔ ہاسٹل کے اکیلے کمرے سے پروفیسر پاشا کا گھر اسے زیادہ اچھا لگتا۔ دراصل یہاں اسے اپنی مصروفیت کا کچھ نہ کچھ بہانہ مل جاتا تھا۔ وہ اسکے گھر کا کام کر کے خوشی محسوس کرتی۔ اسکی چیزیں عام طور پر بے ترتیب ہوتیں۔ وہ انہیں سلیقے سے رکھتی۔ نوکر ہونے کے باوجود وہ چائے اپنے ہاتھ سے بناتا تھا۔ اور سادھنا کو اسے چائے بناتے دیکھ کر اسپر بے حد ترس آتا ـــــ

وہ گذری ہوئی تمام باتوں کو اس طرح سوچ رہا تھا جیسے وہ اس کی اپنی باتیں نہ ہوں، بلکہ کسی اور کی ہوں ـــــ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پروفیسر اور سادھنا ایسے لوگ تھے جنہیں وہ صرف قریب سے جانتا تھا ـــــ

"سر آپ چاہئے میں چار بنا دیتی ہوں" وہ اسے چار بناتے دیکھ کر کہتی۔
"نہیں میں بنالوں گا" وہ سادگی سے کہتا۔
"نہیں سر۔ آپ کو چار بناتے دیکھ کر عجیب سا لگتا ہے۔ میں بناؤں گی اور اس ذمہ داری کے ساتھ کہ آپ کو پسند آئے گی۔"
اور وہ مسکرا کر آہستہ سے ہٹ جاتا۔
کئی بار سادھنا نے دیکھا کہ اسکی قمیض میں بٹن نہیں ہے یا کہیں پھٹی ہوئی ہے تو وہ ٹوک دیتی ــــ اور وہ مسکرا کر جواب دیتا۔
"کالج جاتے ہوئے دیکھا تو سوچا کہ کون اب سوئی دھاگہ لے کر اسے ٹھیک کرنے بیٹھے۔"
"تو آپ مجھے دے دیا کیجئے۔ میں ٹھیک کر دیا کروں گی۔"
"میں خود ٹھیک کروں گا یہ تم کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔"
لیکن ایک دن جب سادھنا نے اسے سوئی سے اپنی انگلی زخمی کرتے دیکھ لیا تو اس سے نہ رہا گیا اور اسنے جھپٹ کر اس سے سوئی اور کپڑا چھین لیا۔
"چھوڑیئے سر۔ یہ مردوں کا کام نہیں۔ آئندہ آپکے کپڑے آپ کو ٹھیک ملا کریں گے۔"
اور سادھنا نے رفتہ رفتہ اسکے بہت سے ذاتی کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کبھی کبھی تو وہ یہاں تک کرتی کہ اسکے کپڑے آکر نکال دیتی۔
"سر آج آپ یہ کپڑے پہنیں گے۔"
"سادھنا تم میری عادتیں خراب کر رہی ہو۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو جس تنہائی کا عادی بنایا ہے تم اسے میرے لئے تکلیف دہ بنا رہی ہو۔"
"مگر سر۔ آپ کو کسی ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو آپ کا خیال رکھے۔ آپ خود تو اپنا خیال رکھ نہیں سکتے۔ ایسے زندگی کتنی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔"
وہ ہلکے سے مسکرا دیا مگر وہ اپنے تبسم کو غمزدہ ہونے سے نہ بچا سکا۔
"سر آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"
"جب مجھے اپنا خیال رکھنے والی کوئی لڑکی مل جائے گی تو کروں گا۔"

اور اس لمحے اسکی تنہائی کا احساس سادھنا کے ذہن میں بے حد شدید ہو گیا اسکے بعد رفتہ رفتہ بالکل غیر محسوس طریقے پر اسنے اسکے گھر کا کم و بیش پورا چارج لے لیا اور آہستہ آہستہ اسکے ذاتی معاملات میں بھی خوشگوار انداز میں دخیل ہوتی چلی گئی۔

سادھنا فطرتاً بہت ہی صاف دل، سلیقہ شعار اور حساس لڑکی تھی۔ وہ اس کا بیحد خیال رکھتی اور اس کا کوئی بھی کام کر کے خوش ہوتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا خمیر ہی بے لوث لطافت اور پیار سے تیار کیا گیا ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکی روح کا وہ خلا جو شدید احساس تنہائی کا پیدا کردہ تھا، سادھنا کے وجود سے غیر محسوس طریقے پر پُر ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گیا۔

فرصت کے اوقات میں وہ آرام سے کرسی پر بیٹھا رہتا اور سادھنا کو اپنے گھر کا کام پوری تندہی اور دلچسپی سے کرتے دیکھتا رہتا۔ اور اسے کبھی محسوس نہ ہوتا کہ سادھنا غیر ہے یا سادھنا کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل اسنے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہ تھا۔ حالات اتنے خوشگوار تھے کہ اسنے بغیر سوچے سمجھے انہیں قبول کر لیا تھا۔ سادھنا کے چہرے کا ہلکا سا مستقل تبسم، ملکوتی پاکیزگی اور بے نیازانہ طمانیت نے اسکی زندگی کو ایک عجیب خوشگوار غیر محسوس طمانیت سے پُر کر دیا تھا۔ اور یہ اسکی توقعات سے بہت زیادہ تھا۔

بی اے کے امتحان کے بعد سادھنا گھر جانے لگی تو اس سے پوچھ بیٹھی۔

"آپ چھٹیاں کہاں گذاریں گے؟"

"یہیں" اسنے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کو تنہائی نہیں محسوس ہو گی؟"

"ہو گی تو"

"تو میں چند دن رک کر جاؤں گی۔"

"لیکن جب تم کو جانا ہی ہے تو خواہ ابھی چلی جاؤ، یا چند روز بعد۔ بات ایک ہی ہو گی۔"

"میں سوچتی ہوں اکیلے آپ کو کتنی تکلیف ہو گی۔ مگر مجبوری ہے۔ مجھے گھر تو جانا ہی ہے۔ پھر یہ کہ یہاں یونیورسٹی بھی نہیں۔ اور مجھے ایم اے کرنا ہے اور میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بغیر آپکو بہت تکلیف ہو گی۔ میں جہاں بھی رہوں گی مجھے آپ کا خیال رہے گا۔"

"ہاں تم نے میری عادتیں اس قدر خراب کر دی ہیں کہ میں آسانی سے تم کو نہ بھلا سکوں گا۔"

سادھنا کے چلے جانے کے بعد اسے اتنی شدید تنہائی محسوس ہوئی جسکا اسنے پہلے تصور بھی نہ کیا تھا گھر اسقدر ویران نظر آنے لگا کہ اسے اسکے در و دیوار سے وحشت ہونے لگی۔ گھر کی ہر چیز رفتہ رفتہ بے ترتیب ہو گئی اور اب یہ بے ترتیبی اس کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ پہروں سوچا کرتا کہ جب سادھنا تھی تو ہر چیز ترتیب سے رہتی تھی۔ ہر چیز میں ایک حُسن نظر آتا تھا اور وہ خود کو کس قدر مطمئن محسوس کرتا تھا۔ مگر اسکے جاتے ہی در و دیوار کی وہ صورت ہی نہ رہ گئی۔ اور یہ سب کچھ اتنا غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر ہوا کہ اسے کبھی اس موضوع پر سوچنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی ـــــ مگر سادھنا اس کی کچھ بھی تو نہ تھی ـــــ اسکے آگے وہ نہ سوچ پاتا ـــــ

ایک ہفتے کے اندر ہی جب اسے سادھنا کا خط ملا تو اس کا کرب اور اس کی تنہائی اور شدید ہو گئی ـــــ اسنے لکھا تھا۔

"میں سوچتی رہتی ہوں کہ آپ کو اکیلے کتنی تکلیف ہوتی ہو گی۔ آپ کی تمام چیزیں بے ترتیب ہو گئی ہو گی ـــــ آپ پھر اپنے ہاتھ سے چائے بنانے لگے ہوں گے۔ پھر آپ اپنے کپڑوں کی مرمت کرتے کرتے انگلی چھید لیتے ہوں گے ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ سب کچھ کیسے برداشت کرتے ہوں گے۔"

اور واقعی یہ سب کچھ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اور وہ چھٹیاں گذارنے اپنے ایک عزیز کے یہاں چلا گیا۔ اس بار اس کے سامنے شادی کی جو سب سے پہلی تجویز آئی اس نے اسے قبول کر لیا۔

اسکی بیوی ایک عام سی سیدھی سادی لڑکی تھی جو محنت کرنا تو جانتی تھی مگر لطیف احساسات سے عاری تھی ـــــ وہ اسکی روح کا خلا تو نہ پُر کر سکی لیکن اس کی تنہائی کسی حد تک ضرور کم ہو گئی۔ وہ اسکی پسند نہ تھی بلکہ اس کی ضرورت تھی۔ اس لئے اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سمجھوتہ بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ سائرہ کو اپنی زندگی دے کر اس دنیا سے کبھی نہ آنے کے لئے بہت دُور چلی گئی۔ جس بچے کی اسے بے حد تمنا تھی اس کے رونے کی آواز بھی وہ نہ سن سکی۔ اور اس کے لئے زندگی بے حد کربناک ہو گئی۔ چار دن کی یہ رفاقت جو ابھی پوری طرح رفاقت بھی نہ ہوئی تھی اسکی

زندگی کے لئے ایک آزار بن گئی۔ ہر بار اس کی تنہائی پہلے سے زیادہ شدید صورت میں ظاہر ہوتی۔
شروع کے چند مہینے تو بے حد تکلیف دہ تھے مگر سائرہ چار پانچ ماہ کی ہوگئی تو ایک آیا نے اسے سنبھال لیا۔ وہ خود پروفیسری چھوڑ کر اس شہر سے چلا گیا اور دوسرے شہر میں وکالت شروع کر دی اور یہاں وہ بہت خوش نصیب ثابت ہوا۔
جب تک وہ پروفیسر تھا کالج کے پتے پر سادھنا کے خطوط آتے رہے لیکن جب سے وہ نئے شہر میں آیا تھا۔ اسکے خطوط آنے بند ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ اس نے اپنا نیا پتہ اسے نہ لکھا تھا۔
سادھنا نے ایم اے کر لیا تھا اور ایل ٹی کر رہی تھی۔ یہاں تک اسے معلوم تھا۔
ایک شام جب وہ چائے پی رہا تھا کہ ایک سادھنا آگئی۔ اور وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔
"سر آپ کو سنکر خوشی ہوگی کہ مجھے یہاں گرلس کالج میں لکچرار کی جگہ مل گئی ہے۔ میں تین چار دن ہوئے یہاں آئی۔ کل یکایک آپ کا پتہ چل گیا کہ آپ بھی اس شہر میں ہیں۔"
چار سال میں سادھنا کے نقوش میں خاصی پختگی آگئی تھی۔ مگر اس کا مستقل تبسم اور ملکوتی معصومیت اب بھی ویسی ہی تھی۔ جیسے اسنے چار سال پہلے دیکھی تھی۔
"بہت خوشی ہوئی۔ خدا تم کو کامیاب کرے۔"
"سر یہ سب آپ کا فیض ہے۔" سادھنا کے لہجے میں بے حد عقیدت تھی۔
"سادھنا اب تم مجھے سر نہ کہا کرو۔ ایک تو یہ کہ اب تم پڑھ لکھ کر میرے برابر ہو گئی ہو۔ اب تم میری شاگرد نہیں رہیں۔ دوسرے یہ کہ میں نے پروفیسری بھی ترک کر دی ہے۔"
اس دن جانے کیا ہوا کہ وہ گذشتہ چار سال کے تمام کربناک لمحوں کا تذکرہ اس سے کرنے لگا جس میں ہاسٹل کے ان دنوں کا ذکر بھی شامل تھا جب وہ بی اے کا امتحان دے کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس دن اسنے سادھنا سے اس طرح بات کی جیسے وہ اسکی بہت بے تکلف دوست ہو۔
رفتہ رفتہ پھر سادھنا نے اسکے گھر کے کاموں کو اپنے ذمہ لینا شروع کر دیا۔ خاص کر سائرہ کو تو اسنے بالکل ماں کی طرح اپنا لیا۔ وہ اسے سائرہ کا منہ دھلاتے کپڑے پہناتے اور اس کا ننھا سا بستر ٹھیک کرتے دیکھتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے سادھنا ہی اس کی ماں ہو ــــ اور وہ سوچتا

کرتا سادھنا تو کنواری ہے پھر اس میں اتنی ماتا کہاں سے آگئی ــــ سادھنا کے سبب سائرہ کی آیا کو اس کے کاموں سے بہت حد تک چھٹکارا مل گیا۔

سادھنا اسکے گھر سے کافی دور رہتی تھی مگر سادھنا کے کالج کے راستے میں اس کا گھر پڑتا تھا سادھنا روز صبح اسکے گھر آجاتی۔ سائرہ کا منہ دھلاتی۔ اسے ناشتہ کراتی۔ اس کے کپڑے نکال کر دیتی۔ شام کو کالج سے وہ سیدھی اس کے گھر آتی۔ اور اسکے لئے چائے تیار کرتی۔ اگر وہ نہ آیا ہوتا تو وہ چائے بنا کر اس کا انتظار کرتی رہتی۔ پھر دونوں گھنٹوں ادھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہتے۔

ایک دن وہ دونوں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ سائرہ رونے لگی۔ وہ تیزی سے گئی اور اسے گود میں اٹھا لیا اور وہ چپ ہو گئی۔

"بے چاری ماتا کی بھوکی ہے" وہ کہہ اٹھا۔

"بے چاری کے باپ کو بھی اسی کی ضرورت ہے" سادھنا نے فوراً جواب دیا۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا پھر آہستہ سے گردن جھکا لی۔

یک بار اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔

"سادھنا اب تم گھر جاؤ، بہت دیر ہو گئی ہے" اسنے کہا۔

"مگر آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں"

"آیا تو موجود ہے ــــ تم جاؤ"

"آپ کو آیا کی نہیں میری ضرورت ہے۔ میں یہیں رہوں گی"

"اس وقت ڈھائی سال کی سائرہ بول اٹھی۔

"انٹی آپ نہ جائیے۔ یہیں رہئیے"

"نہیں، بیٹی میں نہیں جاؤں گی ــــ" کہہ کر اسنے سائرہ کو گود میں اٹھا کر چوم لیا۔

رات کو اسکی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو سادھنا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ سر دبانے لگی۔

اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی اور وہ بڑبڑانے لگا۔

"سادھنا سادھنا ــــ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ نہ جاؤ۔ میں مر جاؤں گا۔ سادھنا

۔۔مجھے بچا لو ۔۔۔"

سادھنا کے ہاتھ رک گئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسنے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔ "POOR CREATURE" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

رات کے تین بجے کے قریب اسے ہوش آیا تو وہ اپنا سر سادھنا کی گود میں پاکر متعجب ہوا۔

"تم اب تک یہیں ہو؟" اسنے نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔ اور آہستہ آہستہ آنکھیں بند کرلیں۔

دو تین دن بعد جب اسکی طبیعت ٹھیک ہوگئی اور وہ سادھنا کے ساتھ چائے پی رہا تھا تو بہت اداس تھا۔ ایک بے کراں ویرانی اس کے سارے وجود پر چھا گئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو باشا؟" سادھنا نے اس سے پوچھا۔

اس بیماری کے دوران سادھنا نے اسے بے تکلفی سے نام لے کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ اتنا غیر ارادی تھا کہ دونوں میں سے کسی نے اسے محسوس نہ کیا۔ اور جب اسے اس کا احساس ہوا تو اسے ایک مسرت کا احساس ہوا۔ جیسے اسکے دل کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہوگیا ہو ۔۔۔ دراصل اسے سادھنا کا آپ سے مخاطب کرنا نہایت اجنبی اور تکلیف دہ سا لگتا تھا۔

"میں نے زندگی میں صرف ایک مخلص ساتھی کی تمنا کی تھی مگر مجھے صرف تنہائی ہی ملی۔ جب تم ہاسٹل میں تھیں تو وہ خلا غیر محسوس طریقے پر پر ہوگیا تھا۔ مگر تمہارے جانے کے بعد وہ تنہائی اور شدید ہوگئی۔ میں نے اس تنہائی سے تنگ آکر شادی کی پناہ ڈھونڈھی مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ اور اس بار تنہائی کا احساس شدید تر ہوتا گیا۔ اب تم پھر آگئی ہو ۔۔۔ تم جو میرا اس قدر خیال رکھتی ہو اس کا مطلب میں ہاسٹل کے زمانے سے ہی سمجھتا ہوں۔ اور غالباً تم بھی اسے اچھی طرح سمجھتی ہو۔ مگر میں اس شدید تنہائی سے خوف زدہ ہوں۔ جو اس رفاقت کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان مذہب کی ایک ناقابلِ مسمار دیوار حائل ہے؟"

"باشا مجھے حیرت ہے تم پڑھے لکھے ہوکر بھی اس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ محبت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ محبت بذاتِ خود ایک مذہب ہے جو تمام مذاہب سے عظیم تر ہے۔ جو تمام انسانوں کو ایک رشتے سے جوڑتی ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں۔ تم

بھی محبت کا انجام صرف شادی کو ہی سمجھتے ہو۔ اور یہ بھول رہے ہو کہ یہ لمحے جو ہم ایک ساتھ گذار رہے ہیں بے حد قیمتی ہیں۔ محبت خود اتنی بڑی دولت ہے کہ اسکے بعد کسی چیز کی تمنا برقرار نہ رہنی چاہئے۔ شادی تو تم کسی بھی لڑکی سے کر سکتے ہو۔ شادی کے لئے تم کو ہزاروں لڑکیاں مل جائیں گی مگر محبت ـــــ اس دنیا میں ان گنت انسان ایسے بھی ہیں جنہیں کسی کی محبت حاصل نہ ہو سکی اور جو اسی حسرت میں تشنہ و ناکام اس دنیا سے چلے گئے۔ اس کی قیمت ان سے پوچھو۔ تم آنے والی تنہائی سے ڈر رہے ہو۔ اور حال کے یہ قیمتی لمحے بھی ضائع کر رہے ہو جو تمہاری زندگی کا سرمایہ بنیں گے ـــــ تم یہ بھی بھول رہے ہو کہ ماضی اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ بھی حال کے بدلے ہوئے روپ ہیں۔ اگر حال نہ ہو تو نہ ماضی وجود میں آئے گا نہ مستقبل کی کوئی حقیقت رہ جائے گی ـــــ جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے اور دنیا تمہیں اگلے وقتوں کی چیز سمجھ کر ایک کونے میں ڈال دے گی۔ اس وقت صرف یہ لمحے تمہارے رفیق ہوں گے۔ میں کہیں بھی رہوں عمر کی کسی منزل پر پہنچ جاؤں مگر میں ان لمحوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھ کر محفوظ رکھوں گی ـــــ اور اس وقت اگر تم مجھے نظر آجاؤ تو خواہ میں تم سے بات نہ کر دں، تمہاری طرف نہ دیکھوں مگر تمہاری نگاہیں میری نظروں کے وہ چراغ ضرور دیکھ لیں گی جو تمہارے لئے روشن ہیں۔ کیا تم اس وقت بے حد خوش نہ ہو گے؟"

وہ چند لمحے کے لئے خاموش ہوئی۔ پھر دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"نرمیندر ـــــ مجھے یہ نام بہت پسند ہے اس لئے تم کو اسی نام سے مخاطب کروں گی۔ میں تمہیں اس وقت سے چاہتی ہوں جب تم ہاسٹل میں تھے۔ مگر میں نے کبھی اس کے آگے نہ سوچا۔ اس کے آگے سوچنے کے لئے کچھ ہے بھی نہیں۔ شادی کی بات تو ایک عام آدمی بھی سوچ لیتا ہے۔ اس سے بلند ہو کر سوچو تو بات ہے۔"

سادھنا خاموشی سے اٹھی اور اسکے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا اور اسکے لبوں پر جھک گئی۔

"نرمیندر۔ یہ ہماری آخری حد ہے۔ اس سے آگے ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں۔ مگر یہاں تک بھی بہت وسعت ہے۔ ان حدود میں بھی تم کو تنگی کی شکایت کبھی نہ ہو گی۔"

دو تین سال اسی طرح گذر گئے۔ سادھنا اس گھر کی سب سے اہم فرد بن گئی۔ وہ اتنے پیار اور اتنی دلچسپی سے اس کے گھر کا کام کرتی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ سادھنا کے لئے جیسے سائرہ میں اور اس میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ دونوں سے اس طرح کا برتاؤ کرتی اور اس طرح ان کا خیال رکھتی۔ جیسے دونوں بچے ہوں۔ سائرہ کے احساسات کی بات ہی کیا خود اسے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ سائرہ بے ماں کی بچی ہے۔ سادھنا نے اسے ایک ماں کا تمام پیار دے دیا تھا۔

ایک بار اس نے سادھنا سے کہا

"سادھنا میرا خیال ہے اب تم کو شادی کر لینی چاہئے۔"

"شادی تو میں کر لوں گی مگر ایسی جلدی کیا ہے۔ پھر یہ کہ سائرہ کو ابھی میری ضرورت ہے۔ کم از کم دو سال تک ابھی شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔"

انہیں دنوں تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔ ہر طرف فرقہ وارانہ فساد۔ لوٹ مار۔ اغوا اور قتل کا بازار گرم ہو گیا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کو ہجرت ہونے لگی۔ عام ضرورت کے لئے گھر سے باہر نکلنا خطرناک ہو گیا۔ عام طور پر اسکول اور کالج اور دیگر کار[illegible] تھا اور سادھنا کئی دن سے اس کے گھر نہ آ سکی تھی۔

اچانک اسے سادھنا کا ایک پرچہ ملا۔

"عزیز ڈیئر — تم کو اور سائرہ کو میری اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مجھے تمہاری اور سائرہ کی۔ یہ بات تم کو بھی اچھی طرح معلوم ہے اور مجھے بھی۔ تم نہیں جانتے کہ گذشتہ چند روز میں تم دونوں کے لئے کتنی بے چین رہی ہوں۔ لیکن میں اپنے گھر میں مقید ہوں۔ حالات یکایک اس قدر خراب ہو گئے ہیں جس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ لوگ قتل ہو رہے ہیں۔ گھر لٹ رہے ہیں۔ اور لڑکیاں اغوا ہو رہی ہیں — یہ حالات بہت خراب ہیں مگر ہمارے لئے اتنے خراب نہیں اگر ہم ان حالات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ممکن ہے قدرت ہم کو ایک موقع فراہم کرنا چاہتی ہو — مجھے معلوم ہے تم اپنی طرف سے کبھی پہل نہیں کر سکتے۔ تم کبھی مذہب کے تصور سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اور بہر حال یہ ایک سماجی حقیقت ہے۔ جسے ہم آسانی سے نظر انداز کر بھی نہیں سکتے۔ ممکن ہے اغوا کی وارداتوں میں ہمارے لئے قدرت کا کوئی اشارہ بھی پنہاں ہو — تم مجھے اغوا کر لو —

چونکو نہیں ـــــ ان مخدوش حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم اپنے مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کرلیں۔ تم کو کچھ بھی نہیں سوچنا ہے کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ میں زندگی کے آخری لمحے تک تمہارا ساتھ دینے پر رضامند ہوں۔ تمہارے نئے گھر میں برابر کی شریک ہوں گی اور ہم دونوں مل کر نئی زندگی کی بنیاد ڈالیں گے۔ میں شام کو آٹھ بجے چوک کے پاس داہنے ہاتھ کی گلی میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اور پھر ہم ایک ساتھ اپنا سفر شروع کریں گے۔ اس کا خیال رکھنا کہ حالات بہت خراب ہیں تمہاری ذرا سی تاخیر بھی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔"

اس نے سادھنا کے خط کو کئی بار پڑھا۔ پھر شدید تنہائی کا احساس اس پر غالب آ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اتنی بڑی دنیا میں وہ اکیلا رہ گیا ہو۔ اور اسے سادھنا کے ساتھ گذارا ہوا ہر لمحہ یاد آتا گیا ـــــ وہ اسکے مبہم خوابوں کی مری پیکر تھی۔ مگر اسکی رفاقت بھی عارضی ہی ثابت ہوئی۔ اسنے کبھی اسے غم کا احساس نہ ہونے دیا۔ اسنے ہمیشہ اس کا دکھ بانٹ لیا۔ اسے وہ تمام خلوص اور تمام اپنائیت دی جسکی وہ زیادہ سے زیادہ تمنا کرسکتا تھا۔ اس کا معصوم تبسم اور اسکے نقرئی قہقہے اسکے گھر کی رونق تھے۔ اسنے سائرہ کو ماں کی ممتا اور اسے ایک محبوبہ کا پیار دیا اور اسکے عوض اس سے کچھ بھی نہ چاہا۔ اس کا تمام پیار بے لوث اور یکطرفہ تھا اس کا نظریہ تھا کہ پیار نیکی ہے جو جتنا بھی کیا جائے کم ہے اور اسے یہ دولت عطا کرنے میں قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔

وہ تمام دن اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا مگر ایک لمحے بھی اسنے اس خط کے عملی پہلو پر غور نہ کیا ـــــ اسکی نفسیات کی تعمیر میں پیار پانے کی تشنگی اس حد تک کارفرما تھی کہ وہ صرف پیار پانا چاہتا تھا اور خود بے عمل رہنا چاہتا تھا۔ اسنے اس وقت بھی سادھنا کی تجویز پر غور نہ کیا۔ وہ صرف سوچتا رہا یا خالی الذہن رہا۔ اور اسے وقت گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ گیارہ بجے رات کو اسے یکایک سادھنا کا خیال آیا مگر وہ جاکر خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور کافی دیر تک چھت کو گھورتا رہا ـــــ

نریندر پاشا ـــــ بہت دن پہلے لکھا ہوا نام درخت کے تنے پر اب بھی چمک رہا تھا اسے سادھنا کا جملہ یاد آیا "یہ لمحے بہت قیمتی ہیں جو آئندہ تمہاری زندگی کا سرمایہ بنیں گے جب

بوڑھے ہو جاؤ گے اور دنیا تم کو اگلے وقتوں کی چیز سمجھ کر ایک کونے میں ڈال دے گی اس وقت صرف یہ لمحے تمہارے رفیق ہوں گے —— میں کہیں بھی رہوں عمر کی کسی منزل پر پہنچ جاؤں مگر میں ان لمحوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھ کر محفوظ رکھوں گی۔ اور اس وقت اگر تم مجھے نظر آ جاؤ تو خدا کی قسم —، بات نہ کروں۔ تمہاری طرف نہ دیکھوں مگر تمہاری نگاہیں میری نظروں کے دو چراغ ضرور دیکھ لیں گی جو تمہارے لئے روشن ہیں۔ کیا تم اس وقت بے حد خوش نہ ہو گے؟"

اور ان لمحے اس پر مایوسی اور محرومی کا اتنا شدید غلبہ ہوا کہ وہ بول اٹھا۔

"سب جھوٹ ہے بکواس ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص تنہا ہے اور اسے تنہا رہنا ہے۔ کوئی رفاقت اور پیار یہ سب خود فریبی ہے۔"

اور پھر جھلاہٹ میں چاقو سے وہ اپنا نام مٹانے لگا۔ مگر جونہی وہ نام پوری طرح مٹ گیا اسکے دل میں مایوسی کا ایک صحرا پھیل گیا۔ اور اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی رہ گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھود ڈالی ہو —— یا اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ کھو دیا ہو —— اسی وقت مٹے ہوئے نام کے نشانات پر سادھنا کی شکل ابھر آئی۔ گو یہ پہلے کی سادھنا سے کسی قدر مختلف تھی۔ اس کا چہرہ اداس اور آنکھیں نم تھیں۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔

"یہ تم نے کیا کیا —— ؟ یہ نام میں نے لکھا تھا تمہیں اسکو مٹانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ تم اگر کسی کو خوشیاں نہیں دے سکتے ہو تو اسے دکھی بنانے کا حق بھی تم کو حاصل نہیں۔"

اس کا دل بھر آیا۔ اسنے اپنا سر شاخ پر رکھ دیا۔ اور دیر تک روتا رہا۔ پھر جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو اسنے آہستہ سے سر اٹھایا اور پھر نئے عزم کے ساتھ دوبارہ نام کھودنا شروع کر دیا۔

—— سادھنا۔ نرملا۔ ریاشا۔ —— ——

تبصرے

ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں

تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

میگھ ملہار

مصنف :۔ ممتاز شیریں

صفحات :۔ ۳۲۸

قیمت :۔ ۳ روپے

ناشر :۔ لارک پبلشرز۔ کراچی

اُردو کے نئے ادیبوں میں محمد حسن عسکری کو چھوڑ کر کسی اور نے بیک وقت تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کا ایسا ثبوت نہیں دیا جیسا ممتاز شیریں نے۔ یوں لکھنے کو تو منٹو نے بھی بعض ادبی مسائل پر جاندار انداز میں لکھا اور عصمت نے بھی۔ بلکہ قرۃ العین تو اکثر بقراطیت پر بھی اتر آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی باقاعدہ طور پر تنقید نگار نہیں ہے ان کی اصل اہمیت انکے تخلیقی کاموں کی وجہ سے ہے۔ تخلیقی کام کے ساتھ ساتھ باقاعدہ تنقید نگاری صرف عسکری صاحب نے کی یا ممتاز شیریں نے۔ ہاں، ان کے ساتھ ایک نام اور بڑھا لیجئے۔ عزیز احمد مگر عزیز احمد صاحب اب سات سمندر پار کی چیز بن گئے ہیں۔ وہاں سے کس کی خیر خبر آتی ہے۔ اور تو اور عسکری صاحب بھی ایک عرصہ سے صرف تنقید نگاری پر گذارا کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ممتاز شیریں میں بڑی ہمت ہے کہ انہوں نے ابھی تک دونوں روگ پال رکھے ہیں۔

لیکن ممتاز شیریں کے نئے افسانوی مجموعہ میگھ ملہار کو دیکھ کر مجھے ایک خوف کا احساس ہوا۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی تنقیدی صلاحیت ان کی تخلیقی صلاحیت پر حاوی ہوتی جارہی ہے۔ ویسے بھی ممتاز شیریں اپنی ابتدا سے تخلیقی طور پر کمزور تھیں۔ تاہم اپنی نگریا میں انہوں نے کسی نہ کسی حد تک اپنی تخلیقی شخصیت کو الگ رکھا تھا۔ یہ بہت ہلکی پھلکی اور کچھ دھان پان سی شخصیت تھی مگر اس میں ایک اپنی دلآویزی تھی۔ اور شاید انفرادیت بھی۔ وہ ایک طرف اپنے آپ کو ترقی پسندوں کے اثر سے بچا لیجانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اور دوسری طرف ان رومان نگاروں سے بھی جن کی کامیاب نمائندگی اس زمانہ میں حجاب امتیاز علی کر رہی تھیں۔ صرف یہی نہیں، جیسا کہ عسکری صاحب

نے اشارہ کیا ہے' ان کا دامن اس تیز طرار جنس پرستی سے بھی آلودہ نہیں ہوا تھا جو منٹو اور عصمت کی نقالی کی صورت میں جاری تھی۔ اتنی بہت سی چیزوں کی نفی کے بعد آدمی کس چیز کا اثبات کرے۔ لیکن ممتاز شیریں نے اپنے لئے ایک اثباتی پہلو ڈھونڈھ نکالا تھا۔ کامیاب شادی شدہ زندگی کی ترجمانی۔ اپنی نگریا کے وہ افسانے جو اس موضوع سے متعلق ہیں فنکارانہ اعتبار سے خواہ اتنے ملند نہ ہوں لیکن ان میں جسم کی تسکین اور روح کی پیاس دونوں کی ایک بہت لطیف آمیزش ملتی ہے۔ ان کا سب سے خوشگوار اور امید افزا پہلو یہ تھا کہ یہ افسانے ممتاز شیریں کی اپنی زندگی سے پیدا ہوئے تھے نہ کہ کسی مستعار نظریے یا خیال سے۔ یہ ممتاز شیریں کے ذاتی تجربہ کا نتیجہ تھے۔ اور ان میں وہ ساری خوبیاں اور کمزوریاں موجود تھیں جو ایک سترہ اٹھارہ سال کی شادی شدہ لڑکی کے ذاتی تجربہ میں ہوسکتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ممتاز شیریں کی تنقیدی صلاحیت اپنی اسی خصوصیت سے مطمئن نہیں تھی۔

بھاری بھرکم بننے کا شوق ہمارے ادیبوں کا ایک لا علاج مرض بن گیا ہے۔ اس شوق میں بذات خود کوئی برائی نہیں۔ سوال طریقہ کار کا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان اپنی عمر اور ذاتی تجربہ کو پھلانگ کر وہ بن جائے۔ جو وہ اپنے وقت سے پہلے بننا چاہتا ہے۔ مجھے تو ان بچوں کے مستقبل سے بڑی مایوسی ہوتی ہے جو دودھ کے دانت نکلتے ہی بڑی بوڑھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پختہ کاری اور جہاندیدگی میں بڑا فرق ہے۔ لیکن جس معاشرہ میں بچوں کی معصومیت کو نام نہاد ذہانت کے مظاہرہ پر قربان کیا جاتا ہے اور انہیں ابتدا ہی سے حسب فرمائش رٹی رٹائی باتیں دہرانے کا شوق دلایا جاتا ہے وہاں ادیب بھی جہاندیدگی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس جہاندیدگی کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول آگ کے دریا میں اپنی معراج پر پہونچا دیا ہے "میگھ ملہار" کے افسانوں میں ممتاز شیریں مصنوعی پختہ کاری کے اس رجحان سے شدید طور پر متاثر ہوئی ہیں۔

اس مختصر سے تبصرہ میں میرے لئے اس رجحان کی مکمل تجزیہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ممتاز شیریں میں اپنے دودھ کے دانت وقت سے پہلے توڑنے کی خواہش بہت ابتدا سے موجود تھی۔ ان کی تنقیدی صلاحیت انہیں ہمیشہ بہکاتی رہتی تھی۔ کہ ان کے افسانے بہت کچی قسم کے ہیں۔ اور بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ ان میں بڑے ادب والی

تو کوئی بات نہیں۔ بڑے ادب پر خدا کی مار۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر ادیب جب تک اگلے پچھلے بڑے ادیبوں کی ایسی تیسی نہ کر دے چین سے نہ بیٹھے لیکن ممتاز شیریں کی معصوم ہلکی پھلکی تخلیقی شخصیت ان کی پڑھی لکھی تنقیدی شخصیت سے بہت مرعوب تھی۔ ہاں کبھی اسے اتنے بہت سے بڑے ادیبوں کے نام جو یاد ہیں! ان کی تخلیقی شخصیت، بری طرح احساس کمتری محسوس کرتی تھی وہ تنقیدی شخصیت سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ باجی! تم بڑی پڑھی لکھی ہو۔ تمہیں بہت سے اوٹ پٹانگ نام بھی یاد ہیں۔ مگر میرے معاملے میں نہ بولو۔ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا ہوں۔ چھوٹی یا بڑی، اچھی یا بری، جیسی کچھ ہیں ہوں بس وہی رہنا چاہتی ہوں میرا کام اس امکان کو پورا کرنا ہے جو میرے اندر مضمر ہے۔ تم اپنے بڑے ادیبوں کو لے کر اپنے گھر بیٹھو" کاش ممتاز شیریں کی تخلیقی شخصیت یہ کہہ سکتی۔ کاش۔

لیکن اپنی نگریا کے اختتامیہ ہی میں ہم ممتاز شیریں کی تخلیقی شخصیت کو اپنی لکھی پڑھی باجی سے وہ کرتب سیکھتے ہوئے دیکھتے ہیں جن کی مدد سے کسی بھی تحریر میں عظمت اور ابدیت کے نشان ڈھونڈھے جا سکتے ہیں۔ اور "بڑے ادب" کا لیبل لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ان کی تخلیقی شخصیت کے احساس کمتری کا ازالہ تھا۔ کوئی بھی ادیب جو تخلیق اور تنقید دونوں بہنوں سے بیک وقت تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ اسی خطرناک منزل سے گذرتا ہے۔ محمد حسن عسکری کے ذریعہ ہم اس سفر کا بہت دلچسپ مطالعہ کر سکتے ہیں مگر کسی اور وقت۔ محمد حسن عسکری اپنی تخلیقی شخصیت کو پوری طرح پروان چڑھانے کا کام کر سکے ہوں یا نہ کر سکے ہوں۔ لیکن انہوں نے اسے کسی جھانپلیت کا کبھی شکار نہیں ہونے دیا۔ نقاد لوگ کہتے تھے عسکری صاحب فلاں بڑے بڑے افسانہ نگاروں سے متاثر ہیں۔ عسکری صاحب کہتے تھے ہاں ٹھیک ہے مگر کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی؟ اس کے برعکس ممتاز شیریں کی تنقیدی شخصیت انہیں یہ پٹی پڑھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ گنگو تیلی اور راجہ بھوج میں کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں ہے۔ میگھ ملہار کے دیباچہ تک پہونچتے پہونچتے وہ کمال خود اطمینانی سے اپنے آپ کو بڑے ادیبوں میں شامل کر لیتی ہیں اور اپنے افسانوں پر وہ سارے لیبل کاٹ کاٹ کر چپکا دیتی ہیں جو انہوں نے سچ مچ کی بڑی تخلیقات سے آتار آتار کر جمع کئے ہیں۔

"موت کا تاثر" آئینہ" میں کچھ اسی نوعیت کا ہے جیسے جیمس جوائس کے شاہکار افسانے

'THE DEAD' میں ہوتا ہے۔"

"آندھی میں چراغ" میں میں نے عورت کا ایک ایسا المیہ پیش کیا ہے۔ جو ہندو پاکستان کی عام عورت کا المیہ ہے" (خوب! رامائن کی سیتا کے بعد یہ افسانہ؟)

"دیپک راگ میں جہاں ٹھیٹ حقیقت نگاری ہے۔ اصل مادی زمینی حقیقت، وہاں میگھ ملہار میں کی حقیقت آفاقی اور ماورائی ہے جو اساطیر کے ذریعہ بیان ہوئی ہے۔"

جیمس جوائس، ٹی ایس ایلیٹ، ہومر، سفوکلس، مارو، ہندی اور یونانی دیو مالا، انجیل مقدس کی اساطیر۔ ماورائی اور آفاقی حقیقتیں، ازلی ابدی اقدار، خیر و شر کی کبھی نہ ختم ہونے والی کشمکش ——— بڑی باجی نے سچ مچ بڑے زور کی باتیں بنائی ہیں۔ ممتاز شیریں نے کان بڑے بڑے نام لئے جاتے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی باتوں کا تذکرہ کئے جاتی ہیں۔ ان کی بڑی بڑی صفات کے حوالے دیئے جاتی ہیں۔ اور وہ بھی ان سے اپنے مقابلے کے لئے؟ . . . .

اس کے ساتھ ہی یہ انکسار بھی ہے" ان بڑے بڑے ناموں کے ذکر سے مجھے اپنا مقابلہ مقصود نہیں مجھ میں فنکار کی انا سہی لیکن اتنا انکسار تو ضرور ہے کہ یہ محسوس کر سکوں کہ ان کے سامنے ہم کتنے چھوٹے ہیں اور فنکار کے ارتقاء اور تکمیل تک پہونچنے میں ہمیں ابھی کتنے اور مرحلے طے کرنے ہیں"——— گویا یہ تو یقینی ہے کہ آپ کی محنت جاری رہی تو وہ مرحلے طے ضرور ہو جائیں گے؟ اور افسوس اس بات کا کہ یہ انا" فنکار" ممتاز شیریں کی نہیں ہے۔

فنکار ممتاز شیریں تو بے چاری سچ مچ بہت معصوم، منکسر المزاج، اور چھوٹی موٹی سی شخصیت تھی ساتھ ہی اس میں اتنی خود شناسی بھی تھی کہ اپنے احساس کمتری کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف کہہ سکے" لیکن لکھوں کس پر۔ میرا مشاہدہ تو اتنا محدود ہے۔ ہر پھر کے ذرا آٹو بیا گرافک افسانے ہی تو لکھ سکتی ہوں" یہ بڑ بولا پن فنکار ممتاز شیریں کا نہیں ہے۔ بالکل نہیں۔ یہ تو وہ رٹا ہوا سبق ہے جو انہیں ان کی تنقیدی شخصیت نے پڑھایا ہے۔

'میگھ ملہار' کے سارے افسانے ان کے تخلیقی تجربے سے نہیں، ان ترشے ترشائے اصولوں سے پیدا ہوئے ہیں جو انہوں نے اپنی تنقیدی صلاحیت سے سیکھے ہیں۔ اساطیر۔ اساطیر، اساطیر ——— اس سبق میں یہ بالکل بھول گئی ہیں کہ اچھا افسانہ پہلے اچھا افسانہ ہوتا ہے اسکے

بعد اس میں جو خرافات جی چاہے ڈال دیجئے۔ ورنہ سارے اساطیر، اور ماورائی اور آفاقی حقیقتیں اور ساری ازلی اور ابدی قدریں اور سارے بڑے مصنفوں کے حوالے ایک بھی اچھا افسانہ پیدا نہیں کر سکتے۔ البتہ ان سے صرف ایک کام لیا جا سکتا ہے۔ قاری کو جی بھر کر بور کرنا۔ صمد شاہین نے بھی غالباً اپنی اسی بوریت کا اظہار کیا تھا۔ جب انہوں نے ممتاز شیریں سے کہا تھا۔ اور یاد رہے کہ یہ اقتباس خود ممتاز شیریں کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔ صمد شاہین نے کہا تھا .....

"وہ جو ابتدا میں ایک حسین فنکارانہ چیز تھی، آگے چل کر ایک بوجھل انٹلکچول تخلیق بن گئی" صمد شاہین، ممتاز شیریں کے قول کے مطابق ان کے سب سے مخلص لیکن سب سے کڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے ممتاز شیریں کی حقیقی کمزوری دریافت کر لی ہے۔ وہ جو ابتدا میں ایک حسین فنکارانہ چیز تھی آگے چل کر ایک بوجھل انٹلکچوئیل کیوں بن گئی؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ممتاز شیریں کا سب سے مخلص سب سے کڑا نقاد کہتا ہے "کیونکہ جب تمہیں مختلف تہذیبوں کی دیومالاؤں کو یکجا کرنے اور ان کی مشترکہ خصوصیات اور مناسبت ثابت کرنے کی سوجھی تو ـــــ" اور یہ الفاظ ممتاز شیریں کے لئے بہت غور سے پڑھنے کے ہیں "تو تمہارے اندر کے فنکار پر وہ دوسری ہستی جو انٹلکچوئل اور نقاد تھی، حاوی ہوتی چلی گئی اس لئے یہ احصہ علمی اور بوجھل بن گیا اور جو تھا حصہ بے جان" مجھے صمد شاہین کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے۔ صرف اس اختلاف کے ساتھ کہ یہ بات ان کے صرف ایک افسانہ ہی پر صحیح نہیں اترتی۔ بلکہ میگھ ملہار کے تمام افسانوں پر۔ اس سے صرف ایک افسانے کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی "آندھی میں چراغ کو"۔ ورنہ میگھ ملہار کے تمام افسانے بوجھل انٹلکچوئل افسانے ہیں۔ فن کار شیریں کی تخلیق نہیں بلکہ انٹلکچول اور نقاد شیریں کی تحریر۔ بوجھل اور بے جان!!

پرخلوص مشورہ۔ فنکار ممتاز شیریں کو چاہئے کہ اپنے سب سے مخلص اور کڑے نقاد صمد شاہین کی رائے کو مانیں۔ اور بڑی باجی کا پڑھایا ہوا سبق بالکل بھول کر اس کھوئی ہوئی "اپنی نگریا" کو تلاش کریں۔ جہاں ان کا ذاتی تجربہ اپنے اظہار کے لئے ان کی واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔

سلیم احمد

فرہنگ اصطلاحات فلسفہ (انگریزی اردو)

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ ـــ کراچی یونیورسٹی۔ کراچی۔

صفحات:۔ ۱۱۰

قیمت :۔ چار روپے۔

"فرہنگ اصطلاحات فلسفہ" میں دو ہزار سے زیادہ انگریزی اصطلاحیں منطق، اخلاقیات، جمالیات، اور مابعد الطبعیات کی ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان اصطلاحات کی مدد سے فلسفہ و علوم متعلقہ کی تمام درسی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ کراچی یونیورسٹی کا شعبہ تصنیف گزشتہ کئی سال سے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات مرتب کر رہا ہے۔ کچھ اصطلاحات جریدہ ۱ و جریدہ ۲ میں اس سے پہلے شائع کی جا چکی ہیں۔

فلسفہ کی بیشتر اصطلاحات زیر تبصرہ کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں ممکن ہے بعض لوگ ان میں سے بہت سی اصطلاحوں کو غیر مانوس قرار دیں لیکن اصطلاحات کا راز یہ ہے کہ کثرت استعمال سے مشکل سے مشکل لفظ یا اصطلاح عام فہم ہو کر رائج ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں کراچی یونیورسٹی نے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا ہے اب نصابی کتابوں اور علمی و فنی کتابوں کے ترجموں میں اگر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ سب مصنفین اور مترجمین انہی اصطلاحات کو مشترک طور پر استعمال کریں تو چند ہی سال میں یہ رائج ہو کر عام ہو سکتی ہیں۔ جیسے الفاظ ہمارے خیال کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح اصطلاحات کسی علم کے خیال کی علامتیں ہیں۔ اس لئے اصطلاحات کے سلسلے میں یہ کہنا کہ یہ مشکل ہیں ایک ایسی بات ہے جس کا تعلق ناسمجھی سے ہے۔ یہ تو کسی علم کو سیکھنے یا سمجھنے کا ایک ذریعہ ہیں جس طرح علم ان اصطلاحات کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا اسی طرح یہ اصطلاحات کسی علم کو سمجھے اور سیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ ہر چیز کا استعمال اسے رواج دینے کا باعث ہوتا ہے۔ ہم نے اب تک یہی کیا ہے کہ اصطلاحات بنائی ہیں اور پھر انہیں رد کیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں کیا ان اصطلاحات کو انگریزی اصطلاحات کے ہم معنی سمجھ کر اردو میں استعمال بھی کرتے تاکہ رفتہ رفتہ طلبہ و اہلِ علم ان سے مانوس ہوتے۔ مثال کے طور پر ایک انگریزی اصطلاح

ACCIDENTALISM لیجیے اسکے کیا معنی ہیں؟ فلسفہ میں یہ کس کس طور پر استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہمیں اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک ہم فلسفہ کا مطالعہ نہ کریں اور اس علم کو نہ سمجھیں۔ اب اگر اسکے اردو مترادف اصطلاح "عرضیت" کے معنی ہمیں نہیں معلوم ہیں تو ایسے میں اصطلاح کو رد کرنا یا مشکل کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اردو اصطلاح کے بارے میں اب تک اہل علم اور عام پڑھے لکھے لوگوں کا یہی رویہ ہے۔ اس مسئلہ پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور سارے اداروں کا ایک مشترک بورڈ بنا کر ہر تصنیف، تالیف ترجمہ میں مشترک اصطلاحات استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اور انجمن ترقی اردو نے بھی اصطلاحات پر کام کیا ہے ان سب میں ربط پیدا کرنا اور اشتراک عمل پیدا کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ ایک ادارہ دوسرے ادارہ کی اصطلاح پر یونہی ہنستا رہے گا اور بیچاری اردو یونہی اپنوں اور غیروں کی غفلت اور عدم اشتراک کا شکار رہے گی۔

نئی اصطلاحات کے سلسلے میں پیشہ وروں کی مروجہ اصطلاحات کو اپنانے کی بھی ضرورت ہے یہ وہ اصطلاحات ہیں جو پیشے کے عملی تجربہ سے خود بخود برسوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ پچھلے دنوں میرے گھر میں بجلی کی مرمت کے سلسلے میں ایک کاریگر آیا تاروں کے جوڑنے میں کچھ غلطی تھی، میں نے اس سے کہا کہ POSIT-اور NEGATIVE IVE تاروں میں کچھ گھپلا ہو گیا ہے بجلی والے نے اس گھپلے کو پکڑ لیا اور مجھ سے کہا کہ بات آپ کی ٹھیک تھی۔ ٹھنڈے اور گرم تاروں کو غلط جوڑ دیا گیا تھا۔ اب آپ دیکھیئے کہ ٹھنڈے اور گرم الفاظ کو اس نے کن اصطلاحی معنی میں کس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

زیر نظر فرہنگ اصطلاحات فلسفہ، ایک اہم علمی کام ہے اور اردو زبان میں کام کرنیوالوں کے لئے ایک راستہ کھولتا ہے کراچی یونیورسٹی نے خوبصورت ٹائپ میں، عمدہ کاغذ پر اسے شائع کیا ہے اور قیمت صرف چار روپے رکھی ہے۔

—— جمیل جالبی

دن اور داستان

مصنف :۔ انتظار حسین

ناشر :۔ ادارۂ ادبیات۔ لاہور

صفحات :۔ ۱۹۸

قیمت :۔ ۳/۵۰

دن اور داستان ایک مختصر ناول کے نام سے چھاپی گئی ہے۔ اس کا داستان والا حصہ الگ افسانے کی صورت میں اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ (جس میں ناول کا تو لہ کہیں نہیں دیا گیا تھا) ۔ اب اسکو "دن" نامی ایک مزید کہانی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ناصر کاظمی نے اس کے فولڈر والے نوٹ میں لکھا ہے "دن اور داستان ہے ایک ہی کہانی۔ لیکن جس طرح سن ستاون نے ہماری تاریخ کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اسی طرح یہ کہانی دو استعاروں میں الگ الگ طور پر لکھی گئی ہے۔" اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے بعد انہوں نے ان دو استعاروں پر الگ الگ لکھی ہوئی کہانی کو ایک ثابت کرنے کی بڑی انٹلکچول کوشش کی ہے لیکن افسوس کہ اس کوشش کے باوجود کتاب میں وہ ایک کہانی نہیں بن سکی ہے۔

دن اور داستان کو پڑھ کر جہاں اس کتاب کی دو الگ الگ کہانیوں کو ناول کی صورت میں پیش کرنے والے کی ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ وہاں داستان کے "جدید تصور" کا مضحکہ خیز خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے ۔۔۔ انتظار حسین نے پہلی کہانی "دن" بڑی خوبصورتی سے لکھی ہے اور اپنے مخصوص دھیمے اور "شعوری" "روایتی" انداز میں ایک نامکمل اور مبہم انسانی سفر کو بڑی چابکدستی سے قلمبند کر دیا ہے۔ یہ ایک بڑی اچھی کہانی کہی جاسکتی ہے جس میں کسی انٹلکچول نعرے کی گنجائش ذرا کم ہی نکلتی ہے اور پھر یہ اپنی جگہ ایک مکمل کہانی بھی ہے ۔ اور اگر اس کتاب کو ایک ناول قرار دیا ہی جائے تو یہ کہانی اس ناول کا ابتدائی حصہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ "داستان" چند روایات کا افسانوی قالب ہے جس میں اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ داستان ہے ۔ اور اسی لئے اس میں نہ تحریر کا وہ حسن ہے جو پہلی

کہانی میں ہے اور نہ ویسی چابکدستی ــــ یہ کہانی بھی اپنی جگہ ایک الگ مکمل ٹکڑا ہے جو کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتا تھا اگر اسکو اس ناول کا حصہ نہ بنایا جاتا۔ اس کتاب میں یہ کمزور اور الجھا ہوا نظر آتا ہے۔

اب رہا ناصر کاظمی کا اشتعال انگیز ردیہ۔ ان دونوں الگ الگ کہانیوں کو ناول ہی ثابت کر دیا جائے اور ایک مربوط کہانی قرار دے دیا جائے۔ تو یہ کسی صورت سے ممکن نہیں۔ بات کچھ بن جاتی اگر داستان "پہلا" اور "دن" آخری حصہ بنا دیا جاتا ــــ اس صورت میں داستان ہمارا روایتی پس منظر، لاشعوری حیاتی اور زمانِ حال اور شعور۔

کتاب طباعت کے لحاظ سے مناسب اور گیٹ اپ کے لحاظ سے معقول ہے۔

ــــــ شمیم احمد۔

آنگن

مصنف :- خدیجہ مستور

قیمت :- آٹھ روپے

صفحات :- ۴۸۸

ناشر :- کتاب نما لبرٹی روڈ۔ لاہور۔

ہینری جیمس نے ایک جگہ ناول کے مستقبل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بعض بڑے تیے کی باتیں کی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ناول فنی طور پر کتنا ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے اگر اسے زندہ رہنا ہے تو اسے ہمیشہ قابلِ مطالعہ اور خواندگی پذیر ہونا پڑے گا ورنہ وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لئے پہلی بار ناول عالمِ وجود میں آیا تھا ــــ اگر حسنِ تحریر کے ساتھ ساتھ فن کار اپنے آپ میں اشیاء کے حسن و قبح کے صحیح امتیاز کی صلاحیت پیدا کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی اچھے ناول نہ لکھے جائیں۔

خدیجہ مستور کا پہلا ناول آنگن پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار یہ باتیں یاد آئیں۔ اس کی بھی بڑی معقول وجوہ ہیں۔ سب سے اہم تو یہ ہے کہ یہ ناول اُس وقت شائع ہوا ہے جب ایسی تحریروں

نے بھی برسنے لگا تھا جو معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہم اور قابلِ مطالعہ بھی ہوں۔ "آنگن" نہ صرف معیاری ہے بلکہ خواندگی پذیر بھی ہے۔

پچھلے چند سال میں اردو ادب کی رفتار کچھ ایسی رہی کہ ادب میں جمود کے نعرے لگانے والے ہمارے بعض نک چڑھے نقاد بھی ناول کے مستقبل کی طرف سے کچھ زیادہ ہراساں نظر آئے۔ ہمارے لکھنے والوں نے بھی حتی الامکان کوشش کی کہ ایسی تحریریں پیش کی جائیں جن سے زیادہ سے زیادہ مستفید، لطف اندوز ہوں ـــــ ورنہ ایسا ادق ادب اور ایسی ثقیل تحریریں کس کام کی جن کو سمجھنے کے لئے قدم قدم پر شرح کی ضرورت محسوس ہو۔ اردو نظم کے مقابلے میں نثر میں زیادہ تجربے ایسے بھی کئے گئیں جن سے ہر ایک مستفید ہوا۔ اور تو اور مشکل تکنیک کے سہارے کہانیاں لکھنے والی قرۃ العین حیدر نے بھی آگ کے دریا میں اس کا بطور خاص خیال رکھا کہ دریا کے ماننے والے وقت کے فلسفے کے نکات بھی حتی الامکان عام فہم انداز میں پیش کئے جائیں۔

ان تفصیلات سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اب لکھنے والوں کو بھی اس کا احساس ہو کہ ادب زندگی اور گہرا فلسفہ بھی عام فہم انداز میں پیش ہو تو پڑھنے والوں پر اس کا IMPACT بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہاں پھر اسلوب کی بات آنکلتی ہے۔ بعض نقاد، خصوصاً مغرب کے نقاد اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن پاکستان جیسے نئے ملک میں جہاں ابھی لوگوں میں مطالعہ کا وہ ذوق و شوق نہیں ہے جو ایک ترقی یافتہ ملک میں ہونا چاہئے ـــــ وہاں اسلوب اور اندازِ بیان بڑی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔

"آگ کے دریا" کے بعد کئی اچھی تحریریں شائع ہوئیں جو فنی طور پر بہت عظیم نہ ہوں پھر بھی جو ایک شاندار مستقبل کا ضرور پتہ دیتی تھیں۔ ایک طرح سے "آنگن" کو ان تحریروں کا نقطۂ عروج سمجھئے۔ ۴۸۸ صفحوں پر پھیلے ہوئے اس ناول کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ دلچسپ ہے۔ نہ اس میں کہیں فنی بازی گری کی جھلکیاں ہیں، نہ کسی عظیم اور ادق فلسفے کی نقاشی کی گئی ہے اور نہ اس میں تکنیک کے کوئی مشکل تجربے کئے گئے ہیں۔ سیدھا سادا اندازِ بیان ہے اور سیدھے سادے کردار ہیں۔ واقعات بھی ایسے بیان کئے گئے ہیں جن سے کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی طرح اس نسل کے بیشتر لوگوں کو یقیناً واسطہ پڑا ہوگا۔

"آنگن" ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو یوپی کے کسی علاقے میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے چین کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس خوشحال کنبے کو غمِ جاناں تو بہت تھے لیکن اب تک یہ غمِ دوراں سے محفوظ تھا۔ لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کے بے رحم ہاتھوں یہ چین بھی لٹا۔ ذہنیتیں بدلیں، نئے رجحانات نے متاثر کیا اور پھر تحریک آزادی نے اس خاندان کے کئی افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور ہر وقت گھر کی فضا میں نہرو، جناح اور گاندھی جی کے نام سنے جانے لگے۔ بعض افراد ظالم غیر ملکی حکمرانوں کے قہر کا شکار ہو گئے۔ بعض کو وقت کے بے رحم ہاتھوں نے چپ چاپ ختم کر دیا۔ دو چار جو بچ رہے وہ کشمکش زندگی کا شکار ہوئے اور کچھ اتنی تیزی سے ان کا زوال شروع ہوا کہ جانے پہچانے چہرے بھی اجنبی لگنے لگے۔ ان میں سے کئی نے مثلاً عالیہ اور صفدر بھائی جیسے حساس کرداروں نے ایک نئے ملک میں پناہ لی جہاں باغی، ہر وقت آزادی کے گن گانے والے عالیہ کی بڑی بہن کو دیوانہ وار چاہنے والے صفدر کو وقت نے ایسا بدل دیا کہ اس واقعہ کو بھلا کر کہ کبھی چچی نے انہیں گھر سے دھتکار دیا تھا۔ وہ ناول کے آخری باب میں چچی سے عالیہ کا رشتہ مانگتے ہوئے کہتا ہے۔

"— میں نے اپنی زندگی کے ڈگر کو بدل دیا ہے چچی — دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ میں اب صرف دولت کماؤں گا عیش کروں گا۔ میں اب کار اور کوٹھی کے خواب پورے کروں گا، میں اب جیل نہیں جا سکتا۔ میں اب امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہت جلد مل جائے گا — چچی میں اب بڑا آدمی بن جاؤں گا — آپ مجھے قبول کر لیجئے نا"

یہ کسی ایک شخص کا زوال نہیں ہے بلکہ اس پوری نسل کا المیہ ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں پروان چڑھی اور ناموافق حالات کا شکار ہو گئی۔ صفدر کا کردار شروع شروع میں بے حد زندہ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں اس کردار میں "پروگریسیو ان باؤنڈ" کے ہیرو کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں — ایک ایسا نڈر نوجوان جو ابا سے تو کیا قدرت سے بھی ٹکرانے کو ہر وقت تیار رہتا ہے اس کردار کے تکمیل کی بڑی گنجائش تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے علی گڑھ کچھ اس طرح بھیجا جاتا ہے کہ وہ سرے سے غائب ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اسے بھیج کر خود ناول کی مصنفہ کے ذہن

سے یہ کردار غائب ہو گیا تھا اور جب یہ دوبارہ یاد آیا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا برتاؤ
کیا جائے جب آخری باب میں صفدر دوبارہ منظرِ عام پر آتا ہے تو اس میں پرانے باغی ترقی پسند
صفدر کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس کردار کے انحطاط سے ذہن کو جھٹکا سا لگتا ہے اور ذہن میں
ایک سوال پیدا ہوتا ہے ــــ کیا خدیجہ مستور صاحبہ کا اشارہ ہمارے معاشرے کی اس تلخ حقیقت
کی طرف تو نہیں ہے کہ ہمارے یہاں کشمکش زندگی کسی کو نہیں بخشتی؟ یہ ساری دنیا ایک سلگتی
بھٹی ہی تو ہے جو اس میں سے صحیح وسلامت گذر گیا وہ زندۂ جاوید ہو گیا اور جو مخالف عناصر
کے ہاتھوں مات کھا گیا وہ صفدر بھائی بن گیا ــــ وہ صفدر جس کی رگوں ایک غدر کسان کا خون
بہہ رہا تھا۔ جو دن رات وطن کی آزادی کے خواب دیکھا کرتا تھا، جسے تہمینہ آپا سے والہانہ محبت
تھی لیکن جسے صرف اس وجہ سے امی نے دھتکار دیا تھا کہ اس کے کسان باپ نے انکے خاندانی
وقار اور جاگیردارانہ ذہنیت کو کھلے بندوں طمانچہ رسید کیا تھا ــــ اور وہی صفدر زمانے
کی مات کھا کر گڑگڑا کر تہمینہ کی چھوٹی بہن عالیہ کا رشتہ مانگتے ہوئے فخریہ طور پر کہتا ہے کہ میں اب
کار اور کوٹھی کے خواب ضرور پورے کروں گا ــــ میں اب جیل نہیں جا سکتا۔

اس ناول میں مجھے سب سے زیادہ زندہ کردار چھمی کا نظر آیا جسے حالات نے ہر طرح مجبور کرنے
کی کوشش کی لیکن جو ہر حال میں مگن رہی اور اپنی من مانی کرتی رہی۔ وہ بڑے چچا کے گھر میں صرف
اس لئے پل رہی ہے کہ اس کے عیاش باپ کو نت نئی شادیوں سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ کٹر
مسلم لیگی ہے۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ بڑے چچا کی بھی نہیں جو ایسے پکے کانگریسی
ہیں کہ گاندھی اور نہرو کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتے ــــ لیکن
جنہیں دن رات موقع بے موقع چھمی نہ صرف کانگریس اور کانگریسی لیڈروں کے خلاف صلواتیں
سناتی ہے بلکہ جو مسلم لیگ کے حق میں خود چچا کے سامنے کھری کھری سنانے سے دریغ نہیں
کرتی۔ وہ بہن سے صاف صاف کہتی ہے ــــ "واہ روپلے پیسے کی کیا بات ہے باجی ــــ میں
تو اپنی جان تک نچھاور کر دوں مسلم لیگ پر ــــ پھر ہمارے کافر چچا کو پتہ چلے!"

چھمی اتنی نڈر ہے کہ چچا کے گھر میں سارے محلے کے بچے جمع کر کے مسلم لیگ کا جلسہ کرتی ہے
اور جب اسے پتہ چلتا ہے کہ ڈیوڑھی میں بڑے چچا اور ان کے کانگریسی ساتھی بیٹھے ہیں تو بچوں

کے ساتھ مل کر چیخ چیخ کر گاتی ہے ؎

کاشی میں تلسی تو بوئی بجریاں سب چر گئیں
گاندھی جی ماتم کرو سہندر کی نانی مر گئیں

آخر میں اب زمرہ کردار بھی حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چھمی پہلے جمیل بھائی اور پھر تعلقہ دار کے لڑکے کی طرف سے مایوس ہو کر کچھ اس قدر دل برداشتہ ہوتی ہے کہ وہ چپ چاپ ایک انجان فضول سے شخص سے شادی کر کے زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔

ناول میں اماں بی، بڑی چچی، ابا، کریمن بوا اور ایسے ہی کئی بہت سے دلچسپ کردار ہیں جو شروع سے آخر تک زندگی کی تلخیوں کا شکار نظر آتے ہیں۔ اس میں اسرار میاں بھی ہیں جن کے ساتھ گھر میں کتوں کا سا برتاؤ ہوتا ہے جنہیں بیٹھک سے آگے آنے کی اجازت نہیں ہوتی، جو دہیں سے بھوک سے بلبلا کر چائے اور کھانے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور کریمن بوا کی صلواتیں سنتے رہتے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دادا میاں کی ناجائز اولاد ہیں۔

اسی ناول میں عالیہ کا کردار بھی ہے ــــ عالیہ جو سب کچھ دیکھتی ہے، سب کچھ سمجھتی ہے لیکن جو چھمی کی طرح نہ مانے نہیں کر سکتی۔ آخری باب میں نہ جانے اس میں اتنی جرأت کہاں سے آجاتی ہے کہ وہ ماں کے مقابلے پر کھڑی ہو جاتی ہے اور صفدر کی حمایت میں صاف صاف کہتی ہے کہ "یہ نہیں جائیں گے اماں ــــ بہاتے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہ ہمیشہ میرے پاس رہیں گے ــــ آپ ہم دونوں کو ایک کر دیجئے!" ــــ لیکن جب اسے احساس ہو جاتا ہے کہ صفدر تو اب وہ صفدر نہیں رہا جس کی خاطر تہمینہ آپا نے خودکشی کی تھی ــــ اب تو یہ امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس کے چکر میں پڑ گیا ہے تو وہ اجنبیوں کی طرح اسے دیکھتی ہے اور پھر فوراً خود ہی شادی سے انکار کر دیتی ہے اور جب اپنے کمرے میں بے سدھ جا لیٹتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چھمی اس کے سینے پر دھم دھم کرتی گذر گئی ــــ "میں نے آپ کو ہرا دیا بجیا ــــ میں نے آپ کو ہرا دیا!"

اس ناول میں بعض خامیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ اکثر جگہ، خصوصاً آخر کے ڈیڑھ دو سو صفحوں میں بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ناول بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ ایک واقعہ وہ

بیان کر رہی ہیں۔ قاری بڑی دلچسپی سے اس کا ساتھ دے رہا ہے کہ یکایک اس سے پہلے کہ وہ لفظ عروج پر پہونچے باب ختم ہو جاتا ہے مصنف واقعات کو ادھورا چھوڑ کر بازبردستی انہیں ختم کر کے فوراً دوسرا باب شروع کر دیتی ہیں۔ ایک آدھ جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک باب اور دوسرے باب کے درمیان اتنا فاصلہ اور اتنی دوری آگئی ہے کہ اسکی وجہ سے کہانی کا تسلسل متاثر ہو جاتا ہے۔

جب مصنفہ سیاسیات پر بحث کرتی ہیں، کسی کے سیاسی نظریہ کا ذکر کرتی ہیں یا ملک کے سیاسی حالات پر کسی کردار کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں تو نہ جانے کیوں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گہرائیوں میں جانے کی بجائے مصنفہ نے چلتے چلتے یہ باتیں کہی ہیں۔

یہ چند خامیاں ایسی نہیں ہیں کہ ان سے ناول کی افادیت متاثر ہو یا یہ کہ انکی وجہ سے فاضل مصنفہ کے فن پر کسی قسم کا عیب آتا ہو۔ خدیجہ مستور صاحبہ کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے وہ بڑی اچھی گھریلو زبان لکھتی ہیں جس ماحول کی انہوں نے عکاسی کی ہے اس سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہیں اس لئے پورے ناول میں انکا قوت مشاہدہ عروج پر نظر آتا ہے۔ کردار نگاری مجموعی طور پر اچھی ہے۔ تقریباً سب ہی کردار جیتے جاگتے ہیں اور ہماری ہی دنیا کے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں "آنگن" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ اسے اردو کے چند اچھے ناولوں میں شامل نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ اسکے لئے اس کی مصنفہ خدیجہ مستور اور اسکے ناشر احمد ندیم قاسمی (جنہوں نے اسے ایک حسین روپ دیا ہے) ـــــ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ـــــ انور عنایت اللہ

بہارِ طفلی

مصنف:۔ تلوک چند محروم

قیمت:۔ ۳/۵۰

ناشر:۔ مکتبۂ جامعہ ۔نئی دہلی۔

اس زمانے میں جب کہ بچوں کے ادب کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے "بہارِ طفلی"

ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے آزادی کے بعد ہماری نسلوں کو جس تربیت اور شعور کی ضرورت ہے اس کو ہمارے مصنف ہی پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ مصنفین جس طرح اس فریضے سے آنکھیں چرا رہے ہیں وہ بڑے عبرت انگیز مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور یقیناً وہ زمانہ آئے گا جب ان مصنفین کو پڑھنے والے پیدا نہیں ہوں گے۔ تلوک چند محروم صاحب نے اس عمر میں اس فریضے کی اہمیت محسوس کی اور بچوں کے لئے نظمیں لکھ کر اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ طبع زاد نظموں کے علاوہ بعض نظموں کے تراجم بھی شامل کتاب ہیں اور آپ تمام نظموں میں انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق ایسی نظمیں لکھی جائیں جو ملک اور قوم کی سربلندی کے کام آسکیں اور موجودہ نسل کو اپنی اہمیت اور ملک اور قوم کی خدمت کا احساس کرا سکیں۔

محروم صاحب نے جس شگفتہ اور رواں دواں زبان میں شعر لکھے ہیں اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ بچوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے جس سے فائدہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہوگا۔

مکتبہ جامعہ نے اس کتاب کو خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ محروم صاحب نے آخر میں آسانی کے لئے ایک فرہنگ بھی دیدی ہے جس نے اس کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

شمیم احمد

پھول

مرتب :۔ غلام عباس۔

قیمت :۔ چھ روپے

ملنے کا پتہ :۔ ۷۔ ایچ بلاک نمبر ۲ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی

۲۸۰ صفحات کی اس کتاب کو جو بچوں کے مشہور و معروف اخبار "پھول" کی ۸ سالہ جلد ش

کا انتخاب ہے، ہم بچوں کے لئے، آنندی والے غلام عباس صاحب نے ترتیب دیا ہے لیکن اسے پڑھتے ہوئے جگہ جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس انتخاب کو ترتیب دیتے ہوئے غلام عباس صاحب اپنی "پھول" کے ایڈیٹر والی حیثیت فراموش کر گئے ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں اس قسم کی گڑبڑ کی یہی ایک واحد مثال نہیں ہے بلکہ ان تمام رسالوں اور کتابوں میں جو ہم بچوں کے لئے چھپتی ہیں۔ یہی کچھ گڑبڑ عام طور سے نظر آتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بیشتر لکھنے والے بچوں کی عمروں کے لحاظ سے ان کے ذہنی مدارج کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے چنانچہ آپ کو ہمارے یہاں بچوں کا ایک کوئی رسالہ یا کتاب نہیں ملے گی جس کا سرورق دیکھ کر آپ یہ اندازہ لگا سکیں کہ یہ کس عمر کے بچے کے لئے خریدی جا سکتی ہے۔

ہمارے لکھنے والے یوں تو غیر ملکوں کا ادب ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور غیر ملکی ادیبوں [illegible] نام احساس برتری یا احساس کمتری کے سلسلے میں لکھواتے ہیں [illegible] لیکن کوئی اللہ کا بندہ [illegible] [illegible] لکھے ہوئے ادب کو بچوں کی ذہنی عمر کے حساب سے اردو میں ترجمہ کرنے کا امکانات [illegible] نہیں لیتا، ورنہ شاید اردو میں بھی بچوں کی ذہنی عمر کے حساب سے ادب تخلیق کیا جاتا اور [illegible] رہتے کہ سولہ سال کی عمر کے بچوں میں جو ذہنی فاصلہ ہوتا ہے اسے بھی سمجھنے کی کوشش [illegible] [illegible]۔

[illegible] بچوں کے لئے ہمارے یہاں بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ نظم میں "بلّو کا بستہ" تو [illegible] اس معیار کی نثر ابھی تک ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ رہے اس سے بڑی عمر کے بچے [illegible] رسالوں سے بھاگے ہوئے ڈاکو کی کہانی سے لے کر سائنس پر لکھے ہوئے مضامین تک [illegible] سے بے پرواہ ہو کر سبھی کچھ سونپ دیئے جاتے ہیں۔ شاید ذمہ دار ہم ان کے ذمہ دار [illegible] عمل ایسا ہی ہوتا ہو!

[illegible] کے انتخاب میں بھی یہی کچھ گڑبڑ ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں شوکت تھانوی کی کہانی [illegible] "موجود ہے وہاں عبدالمجید سالک کا مضمون ہماری بولی بھی۔ نظموں میں ایک طرف تو [illegible] پیاری سی نظم "دلی" شامل ہے، جو ایک پانچ چھ سال کے بچے کے حیران ذہن کی نشاندہی ہے، تو دوسری طرف اختر شیرانی کی "تاروں بھری رات" بھی موجود ہے جو ایک تو بالغ

لڑکے کے لئے تو شاید دلچسپ ہو مگر ننھے بچوں کے لئے قطعاً بے معنی ہے۔

غلام عباس صاحب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی بھی پھول کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں جن کی ایک نظم "بادلوں کا گیت" اس انتخاب میں شامل ہے جو کہ خاصی مشکل نظم ہے۔ پھول کی پرانی فائلیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے بچوں کے لئے صرف نظمیں ہی نہیں لکھیں بلکہ ان کی اچھی اچھی کہانیاں اور ڈرامے بھی وقتاً فوقتاً پھول کے شماروں میں شائع ہوتے رہے ہیں جو کہ ان کی نظموں کی نسبت زیادہ آسان اور دلچسپ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی ہی کا کیا ذکر، انتخاب کے اکثر مضامین نظموں ڈراموں اور کہانیوں میں بے حد بھاری بھرکم الفاظ نظر آتے ہیں جس سے چھوٹے تو چھوٹے بڑے بچے تک دلچسپی گھٹتی ہوئی محسوس کرتے ہیں۔

آخری بات یہ کہ اگر "پھول" کی اڑتالیس سالہ جلدوں کا یہ انتخاب بچوں کے لئے ہے تو کاش اس کے انتخاب میں غلام عباس صاحب اپنے ہی بچوں سے مدد لے لیتے۔ اور مختلف عمر کے بچوں کے لئے الگ الگ انتخاب کر کے ان تمام حصوں کو ایک ہی جلد میں محفوظ کر دیتے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلام عباس صاحب کو یہ کام بہت عجلت میں کرنا پڑا۔ جبھی تو اپنے اس انتخاب میں انہوں نے جہاں نازک نازک خوش رنگ پھول چنے ہیں۔ وہیں گوبھی کے پھول بھی ڈھیر کر دیئے ہیں۔

کتاب کی کتابت اور چھپائی معیاری اور سرورق بے حد جاذب نظر ہے۔

——— صبوحی درّانی

امانت

مصنف :۔ اصغر بٹ

ناشر :۔ ریپلیکا پبلیکیشن صدر۔ کراچی

قیمت :۔ ۵ روپے

اصغر بٹ کا چار ایکٹ پر مشتمل طویل ڈرامہ "امانت" ان کوششوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو پاکستان میں تھیٹر کے باقاعدہ احیا کے سلسلے میں کی جا رہی ہیں۔ "امانت" کے پیش لفظ میں بہت

سی عام شکایتوں کے علاوہ دو ایک باتیں ایسی کہی گئی ہیں جنہیں اس ڈرامے کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہوئے قاری کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اصغر بٹ کے نزدیک ڈرامے کی کامیابی اس کی فنی خوبیوں کے علاوہ تماشائیوں میں اس کی "مقبولیت" پر منحصر ہے اور "ڈرامے کی پہچان بلکہ ڈرامے کا امتحان اسٹیج پر ہے"۔ یہ بات اپنی جگہ پر بہت معقول ہے۔ ڈرامہ بنیادی طور پر پڑھنے کی نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز ہے اور اس کی کامیابی کا انحصار مصنف، ہدایت کار اور اداکاروں سے لے کر پردے کی رسی کھینچنے والے لڑکے تک، سب لوگوں پر ہے۔ اگر یہ سب لوگ تین گھنٹے تک تماشائیوں کو اپنی طرف متوجہ رکھ سکتے ہیں تو ڈرامہ کامیاب ہے ورنہ ناکام۔

"امانت" خالص اسٹیج کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے۔ اسٹیج پر یہ کس حد تک کامیاب ہے گا اس کا اندازہ تو اسے تھیئٹر میں دیکھنے سے ہی ہو سکے گا لیکن ڈرامہ نویس پر جو بھی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں انہیں اصغر بٹ نے خاصی کامیابی سے نبھایا ہے۔ ڈرامہ لکھتے وقت انہوں نے اسٹیج کی مشکلات کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے ڈرامہ کے تمام واقعات صرف دو جگہوں پر عمل پذیر ہوتے ہیں۔ پہلے اور آخری ایکٹ میں منظر شیریں گل (لڑکیوں کے سے نام والا، ۳۰ سالہ امیرزادہ جس نے اپنے گرد ایک خول چڑھا رکھا ہے) کے ڈرائنگ روم کا ہے اور دوسرے اور تیسرے ایکٹ میں منظر محکمہ جنگلات کا ایک ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ ..نوں مناظر کی تفصیلات پر مصنف نے اس حد تک زور دیا ہے کہ ، پروڈیوسر کی آسانی کے لئے خاکے تک بنا چھوڑے ہیں۔ منظر نامہ "حقیقت نگاری" (REALISM) کے اصول کے تابع ہے۔ ڈرائنگ روم اور ریسٹ ہاؤس دونوں تین دیواروں والے حقیقی کمرے ہیں (چوتھی دیوار تماشائی خود ہیں) جدید یورپین ڈرامے میں علاماتی اسٹیج کے جو تجربات ہوئے ہیں ان سے واقفیت رکھنے والے قاری یا تماشائی کو یہ تکنیک شاید دقیانوسی لگے لیکن ہمارے ہاں عام لوگوں کے مزاج اور پسند کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ابھی اردو ڈرامہ نویسوں کو "تین دیواروں والے اصلی کمرے" پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔

اگر کوئی قاری اس ڈرامے میں بہت گہرے فلسفیانہ مطالب ڈھونڈنے کی کوشش کرنا

چاہے تو شاید اسے کچھ زیادہ کامیابی نہ ہو۔ نہ ہی اس ڈرامے میں کسی اہم سماجی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے یہ ایک عام ڈگر کی سیدھی سادی کہانی ہے۔ کردار متوسط طبقے کے جیتے جاگتے سوچنے سمجھنے والے اور طبیعتوں میں تضاد رکھنے والے افراد ہیں جو زیادہ تر گفتگو کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں تنوع پیدا کرنے کے لئے ڈرامہ نویس نے انہیں دست و گریبان بھی دکھا دیا ہے لیکن یہ ہاتھاپائی بھی ڈرامے ہی کا ایک حصہ ہے اور اس سے کرداروں کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔

ڈرامے کی ابتدا کافی "ڈرامائی" ہے شرمیلی طبیعت والا ۳۰ سالہ امیرزادہ شیریں گل جو دل پر محبت کی چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ اپنے کاروباری ذہنیت رکھنے والے، مصلحت اندیش دوست ہاشم اور اس کی نئی نویلی دلہن امیرزادی میمونہ (جو اپنے گھر سے اپنی ماں کے زیور چرا کر ہاشم کے ساتھ بھاگ آئی ہے) کا منتظر ہے۔ خلافِ توقع میمونہ اکیلی آتی ہے کیونکہ ہاشم زیرِ حراست ہے۔ ابھی شیریں اور میمونہ اس مسئلے ہی کو نہیں سلجھا پاتے کہ ایک شریف عورت ایک نامحرم کے ساتھ اکیلے گھر میں کیسے رہے کہ اچانک پولیس کے آجانے پر دونوں فرار ہو کر محکمۂ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں شیریں کا خول ٹوٹنے دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں اترتا ہے۔ وہ دن کو سوتا اور رات کو جاگتا ہے کیونکہ میمونہ اسکے دوست ہاشم کی "امانت" ہے جس میں وہ خیانت نہیں کرنا چاہتا۔ قاری کی دلچسپی اس وقت دوگنی ہو جاتی ہے جب میمونہ شیریں کو بتاتی ہے کہ اس کی شادی ہاشم سے نہیں ہوئی۔ شیریں کی مرحوم محبوبہ کا شوہر مرزا جسے محکمۂ جنگلات کا افسر ہونے کی وجہ سے "جنگلی" کہا جاتا ہے یہاں پہلی مرتبہ وارد ہوتا ہے جنگلی کا کردار اپنی جگہ اہم ہونے کے علاوہ میمونہ اور شیریں کے مستقبل کے تعلقات کی نوعیت متعین کرنے میں بہت مدد دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں کردار ایک دوسرے کے بارے میں جو انکشافات کرتے ہیں ان سے جہاں گفتگو کرنے والے کردار پر روشنی پڑتی ہے وہاں قاری کو اس کردار کے بارے میں بھی معلومات فراہم ہوتی ہیں جسکے بارے میں گفتگو کی جا رہی ہے

آخری ایکٹ میں ہاشم میمونہ کے پاس یہ تجویز لے کر آتا ہے کہ وہ اپنے زیورات سمیت ماں

باپ کے پاس چلی جائے کیونکہ شادی کی صورت میں اگر بدنامی ہوئی تو اسکے کاروبار پر اثر پڑے گا۔ یہاں پر ہاشم اور شیریں ایک دوسرے کا تضاد بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ شیریں آن پر مرمٹنے والا امیر زادہ اور ہاشم اپنی محبوبہ کو کاروبار پر ترجیح دینے والا کاروباری آدمی۔

شیریں روایتی دوستی کا قائل ہے میمونہ کو ابھی تک امانت سمجھتا ہے لیکن میمونہ جب اسے جلانے کے لئے "جنگلی" کی تعریف کرتی ہے تو اسے اپنا خول توڑ کر باہر آنا پڑتا ہے۔ ڈرامے کا آخری مکالمہ شیریں اور میمونہ کے تعلقات کی آخری وضاحت بھی کر دیتا ہے۔

"میمونہ۔ ہاں میں شیریں کو چاہتی ہوں اور چاہتی رہوں گی۔

شیریں۔ میمونہ۔ میمونہ۔"

عام ڈراموں کی طرح "امانت" کا موضوع بھی مرد اور عورت کی محبت ہے لیکن اس میں ڈرامہ نویس جذباتی ہوئے بغیر محبت کے بارے میں مختلف کرداروں کے رویوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری مصنف کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر خود فیصلہ کرے۔ میمونہ کی ہاشم کے لئے وقتی محبت، جنگلی کی ہوس، اور جذبۂ رقابت میں شیریں کو دوبارہ شکست دینے کی کوشش۔ ہاشم کی کاروباری محبت اور شیریں کی روایتی، کسی حد تک جذباتی لیکن مخلصانہ بے لاگ چاہ۔ یہ سب باتیں ہمیں ہر روز اپنے ارد گرد رہنے والے معمولی انسانوں میں ملتی ہیں۔ "امانت" میں ان مختلف نظریات یا رویوں کی کش مکش کو بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے۔

ڈرامہ دیکھتے یا پڑھتے وقت شیکسپیئر، ابسن اور سارتر جیسے نام پڑھے لکھے قاری یا تماشائی کے ذہن میں رہتے ہیں لیکن چونکہ ڈرامہ نویس اصغر بٹ کے نزدیک کسی ڈرامے کی کامیابی اور افادیت اس بات پر ہے کہ "اسنے چند کرداروں کو کچھ عرصے کے لئے آپ کے سامنے زندہ کر دیا ان کی زندگیوں نے آپ کے لئے دلچسپی پیدا کر دی اور آپ کو محظوظ کیا۔" اسلئے یہاں شیکسپیئر، شا، ابسن پریسٹلے، اور سارتر کا ذکر غیر موزوں ہوگا۔

——— صدیق ارشد

میں کیوں سوچوں

مصنف :۔ جوگندر پال۔

صفحات :۔ ۱۶۰

قیمت :۔ تین روپے

ناشر :۔ ادبستان اردو۔ ہال بازار۔ امرت سر

یہ مجموعہ ۱۲، افسانوں اور کچھ چند سطری افسانچوں پر مشتمل ہے جس میں سے چھ افسانے فینٹسی کے عنوان کے تحت شائع ہوئے ہیں۔ جوگندر پال نے اپنے افسانوں کے لئے ایک انوکھی راہ اختیار کی ہے۔ اُن کے سارے افسانے انسانی زندگی کے تضادات کو پیش کرتے ہیں۔ اور یہ تضادات ترقی پسند تحریک کے پیدا کئے ہوئے معاشی اور مادّی تضادات کے بالکل برخلاف انسانی نفس کے تضادات کو پیش کرتے ہیں۔ جو کہیں کہیں اخلاقی اور سماجی طنز کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ حقیقت کا وہ تصور جو ترقی پسند تحریک کا پیدا کردہ ہے۔ زیادہ تر نظریاتی رہا ہے۔ اور اسی لئے اسکے بیشتر افسانوں میں کردار "ٹائپ" ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن جوگندر پال کے افسانوں میں حقیقت زیادہ حقیقی نظر آتی ہے۔ اسی لئے فینٹسی کے تحت لکھے ہوئے ان کے تمام افسانے فینٹسی ہرگز نہیں معلوم ہوتے۔ اس میں زندگی کے تضادات جس تلخ اور ننگی حقیقت کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں خیال انگیزی کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

جوگندر پال کو حقیقت کو افسانہ بنا دینے کا ڈھنگ آتا ہے لیکن ابھی ان کا فن ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ انسانی نفس کا جو شعور بڑے افسانہ نگار میں عموماً ہوتا ہے وہ ابھی جوگندر پال میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ البتہ اُن کے مشاہدے کی قوت بہت تیز ہے۔ تجربات، مشاہدہ اور وسیع انسانی تعلقات اُن کا موضوع ہیں۔ اگر وہ مشاہدہ کی صلاحیت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر بھی پیش کرنے پر حاوی ہو جائیں تو ایک روز بڑے اہم افسانہ نگار بن سکتے ہیں۔ اُن کی تحریر شگفتہ اور زندہ محسوس ہوتی ہے اور احساسات تازہ۔ اس لئے ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ تضادات میں حقیقت تلاش کرنے کے ساتھ وہ خالص حقیقت کو بھی پانے کی کوشش کریں تو مناسب ہوگا۔ ان کے افسانچے دراصل ایسے ہی تضادات کا مجموعہ ہیں جن

یہ وہ افسانے لکھ سکتے تھے۔ اور شاید لکھ بھی دیں۔ لیکن ان کو منزل بنا لینا ان کیلئے نقصان دہ ہوگا۔ یہ حیثیت مجموعی میں کیوں سوچوں' ایک دلچسپ اور خوبصورت دنیا تخلیق کرتی ہے۔ جس کا تعلق انسانیت اور انسان کے وسیع تعلقات اور محسوسات سے ہے۔ لیکن اس مجموعے کا نام البتہ کھٹکتا ہے جس کا کوئی تعلق ان افسانوں سے نہیں ہے۔

کتاب سلیقے سے چھاپی گئی ہے اور تین روپے میں بری نہیں ہے۔

—— شمیم احمد

سہ ماہی "فنون" لاہور

ادارہ :۔ احمد ندیم قاسمی — حبیب اشعر دہلوی۔

قیمت :۔ ۳ روپے

ناشر :۔ کتاب نما۔ ۱۷۰۔ انار کلی۔ لاہور

آج کل کے زمانے میں جب کہ لکھنے والوں نے لکھنا چھوڑ رکھا ہے اور پڑھنے والوں نے جاسوسی اور فلمی لٹریچر میں پناہ ڈھونڈ لی ہے' ایک ایسا متوازن معیاری رسالہ شائع کرنا جو کہ حسن ترتیب کا بھی آئینہ دار ہو بڑے ہی دل گردے کا کام ہے۔ پھر ہوا یوں کہ لاہور سے اڑتے اڑتے یہ اطلاع بھی کراچی تک پہونچی کہ احمد ندیم قاسمی صاحب اور حبیب اشعر صاحب دہلوی ایک سہ ماہی رسالہ "فنون" کے نام سے شائع کر رہے ہیں —— فنون کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا نام خاص طور سے اس بات کی ضمانت تھا کہ فنون نہ صرف شائع ہوگا بلکہ بڑے ہی ٹھسے سے شائع ہوگا۔ کیونکہ یہ احمد ندیم قاسمی ہی تھے جنہوں نے اس سے قبل بھی اردو کے ایک چھوڑ تین معیاری رسالے (ادب لطیف۔ سویرا۔ نقوش) بڑے ہی آب و تاب کے ساتھ نکال کر دکھائے تھے۔

اور اب جو فنون ہمارے ہاتھوں میں پہونچا تو یقین جانئے کہ توقعات سے بڑھ چڑھ کر نکلا۔

یہاں میں اردو کے عام رسالوں کے بارے میں ایک GENUINE شکایت کرتا چلوں ——

وہ یہ کہ بیشتر اردو رسائل نے ادب کو مقالے' افسانے' نظموں' غزلوں اور ڈراموں تک محدود

رکھ دیا ہے، جو کہ بڑا خطرناک رجحان ہے۔ اس کے برخلاف فنون کو خدا کا شکر ہے کہ اس خطرناک رجحان سے بچا کر نکالا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں فلم، مصوری، موسیقی، علم الخط اور مذہب وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں۔

ایک صحت مند رسالے کی طرح "فنون" بھی کسی ایک خاص گروہ کا ORGAN نہیں ہے بلکہ اسکے برخلاف فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس میں ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں کی تخلیقات کو بغیر کسی تعصب کے نمائندگی دی گئی ہے ۔ مقالات کے حصے میں کُل چھ مضامین ہیں جن میں ابوالخیر مودودی صاحب کا مضمون "خدا" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ابوالخیر مودودی صاحب کا یہ مضمون ترجمہ ہے لیکن ادارہ نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہ کس کا مضمون ہے اور کس زبان سے اسکو ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابوالخیر مودودی کے علاوہ مظفر علی سید اور شیخ محمد ملک کے اختلافی مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ سید صاحب کی تنقیدوں اور تبصروں کا میں بے حد معتقد ہوں لیکن ادھر کچھ دنوں سے ان میں خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بیک وقت کئی کتابیں پڑھتے ہیں اور ایک کے نفسِ مضمون کو دوسرے میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ حشر ان کے اس مضمون کا بھی ہوا۔ جو کہ دراصل سلیم احمد کے مضامین کے مجموعے "نئی نظم اور پورا آدمی" پر ایک تبصرہ ہے۔ سید صاحب تنوع مطالعہ کے شوق میں کچھ ایسی جھپ کھا گئے کہ مسٹر ٹرلینگ کے خیالات سلیم احمد سے منسوب کر دیئے۔ اور اپنی دھن میں یہاں تک لکھ گئے کہ سلیم احمد بار بار فرائیڈ کا ذکر کرتا ہے جب کہ سلیم احمد کا نقطۂ نظر جہاں تک میری حقیر فہم کا تعلق ہے لارنس کا ہے نہ کہ فرائیڈ کا۔ اور سید صاحب سے یہ بات شاید پوشیدہ نہ ہو کہ ان دونوں میں خاصا فرق ہے۔ ممکن ہے کہ سید صاحب کا اصول تنقید یہ ہو کہ جس کسی کی زبان سے جنس کا نام سُنا اُسے جھٹ فرائیڈ پرستوں میں ہانک دیا۔ مگر اپنی ایک غلطی کی تصحیح تو بہت آسانی سے کر سکتے ہیں کیونکہ اسکے لئے سمجھنے سمجھانے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی آنکھیں کھلی رکھنے کی۔ سلیم احمد کی کتاب میں اس پیراگراف کو چھوڑ کر جو سید صاحب نے "عشق اور قحط دمشق" سے نقل کیا ہے۔ فرائیڈ کا نام صرف ایک فقرہ میں آیا ہے اور وہ بھی حیات اللہ انصاری کے جواب میں۔ رہ گیا وہ پیراگراف جو سید صاحب نے نقل کیا ہے۔ اس میں صرف

کہا گیا ہے کہ ترقی پسند فرائیڈ کا ذکر کس طرح کرتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ دوسروں کے کسی قول کا حوالہ بھی سید صاحب کے نزدیک مصنف کا اپنا خیال بن جاتا ہے۔

فتح محمد ملک کے مضمون کا آغاز بہت اچھا ہے۔ لیکن مضمون جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے بات کا سرا ان کے ہاتھ سے گم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ قاسمی صاحب کو اقبال کا جانشین ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ فتح محمد ملک، سنا ہے کہ پروفیسر آدمی ہیں۔ اسی لئے جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ ویسے بھی میرا شعری ذوق خود اپنی نظروں میں مشتبہ ہے اس لئے ان کی رائے پر اسی طرح یقین کر لیتا ہوں جس طرح میں قاسمی صاحب کے بارے میں ممتاز حسین کی اس رائے پر ایمان لے آیا تھا کہ قاسمی کی فکر اقبال سے بڑھ گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب خود ممتاز حسین اپنی اس رائے پر شرماتے ہیں۔

ویسے فتح محمد ملک صاحب نے عسکری صاحب کے منہ آنے کی کوشش بھی کی ہے۔ پتہ نہیں عسکری صاحب کی تحریر میں ایسا کیا لیس بھرا ہے کہ ان کا ہر نقال سب سے پہلے انہیں کو کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ مظفر علی سید، جمیل جالبی، شمیم احمد ــــ یہ سب عسکری صاحب کے آفت شوت ہیں اور جیسا کچھ برا بھلا ان پڑتا ہے انہیں کے اسلوب کی نقالی کرتے ہیں۔ بلکہ ممکن ہے آئندہ کا کوئی تبصرہ نگار ان کی ادبی آرا کی تلخیص کرے یہ ثابت کر دے کہ یہ سب بیشتر عسکری صاحب کے چبائے ہوئے نوالے ہی چباتے رہتے ہیں۔ لیکن کھانا اور غرانا ان لوگوں پر ایسا صادق ہے کہ عسکری صاحب کو گالی دیئے بغیر لقمہ نہیں توڑتے۔ فتح محمد ملک صاحب بھی انہیں لوگوں کے ہم جولی ہیں اور ابھی سے خاصے اچھے جا رہے ہیں ــــ ان سب حضرات کے لئے میرا پُر خلوص مشورہ یہ ہے کہ وہ عسکری صاحب پر کچھ لکھنے سے پہلے ذرا "عسکری نگر" کی مکمل سیر کر لیں۔ انشاء اللہ قوت باصرہ روشن ہو جائے گی۔

افسانوں میں کرشن چندر اور ہاجرہ مسرور نے چھچھلے بازی سے کام لیا ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں تو اب کچھ کہنا ہی بیکار ہے البتہ ہاجرہ مسرور کو کرشن چندر کی پیروی کرتے دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ کیونکہ ہاجرہ مسرور کے شدید فنی لگاؤ کو دیکھتے ہوئے اردو کے قاری کو ان سے بڑی

توقعات وابستہ ہیں لیکن اسکے لئے ضروری ہے کہ وہ چٹکلے بازی چھوڑ کر زبان و بیان کے نئے سانچوں کو کھوج لگانے کی کوشش کریں۔ بیدی کا افسانہ زبان اور اظہار کی خامیوں کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر اس بار مختصر افسانہ پیش کیا ہے جو کہ قطعی ناکام ہے۔ کرشن چندر، عصمت، بیدی، ہاجرہ مسرور اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے علاوہ "فنون" کے اسی شمارے میں انور جیلانی، آل بانو، ام عمارہ اور غلام محمدؐ کے افسانے بھی شریک ہیں۔

نظموں اور غزلوں میں تقریباً سارے ہی اچھے نام جیسے جوش، فراق، فیض، ناصر کاظمی، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، مختار صدیقی، عزیز حامد مدنی، قتیل شفائی، عابد علی عابد، شاد عارفی اور انجم رومانی وغیرہ شامل ہیں۔

بحیثیت مجموعی فنون کا یہ پہلا شمارہ بہت ہی جاندار، متوازن اور حسن ترتیب کا آئینہ دار ہے۔ سرورق جاذب نظر، کتابت اور طباعت معیاری اور قیمت مناسب۔

——— ثناء اللہ

کاروانِ وطن

مصنف :۔ تلوک چند محروم

صفحات :۔ ۴۱۴

قیمت :۔ ۵۰/۷

ناشر :۔ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی۔

"کاروانِ وطن" میں ہماری تحریک آزادی کی منظوم تاریخ پیش کر دی گئی ہے تلوک چند محروم صاحب ہمارے ان بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے آزادی کے نعروں کے ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ اور پچھلی نصف صدی میں ان کا شعور ہندوستان کے سیاسی شعور کا لمحہ لمحہ گرفت میں لاتا رہا ہے۔ اسی لئے یہ کتاب نصف صدی کے ہر سیاسی واقعہ اور ہر شخصیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ مختلف سیاسی تحریکوں کے بنتے بگڑتے نقوش اور اہم سیاسی موڑ اس دستاویز کو اور اہم بناتے ہیں۔

کاروانِ وطن دو حصوں میں منقسم ہے۔ فریاد جرس اور منزل۔ فریاد جرس میں سنہ ۱۹۰۶ء

سے ۱۹۴۷ء تک کا کلام اور منزل میں ۱۹۴۷ء سے حال تک کا کلام شامل ہے گویا یہ مجموعہ گذشتہ ۵۰ سال کی تاریخی اور سیاسی تاریخ ہے جسکو شعر کے نرم و نازک قالب میں ڈھال دیا ہے۔ تلوک چند محروم صاحب ہمارے اُن مجاہدوں میں شامل ہیں جنہوں نے پنجاب اور سرحد میں اردو کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کو شعر پر قدرت حاصل ہے اور ایک ولولہ اور لگن ان کی شاعری کی بنیادی حقیقت ہے۔ محروم صاحب ہماری شاعری میں اس روایت کے شاعر ہیں جن کا سلسلہ چکبست سے ملتا ہے۔ اس مجموعے کے دوسرے حصے میں جو دردمندی اور طنز ملتا ہے وہ پہلے دور میں مفقود ہے۔ اور پہلے دور میں جو جوش و خروش نمایاں نظر آتا ہے اس سے دوسرا حصہ محروم ہے۔ اور غالباً ہماری سیاسی تاریخ کا رُخ بھی بالکل اسی طرح وقوع پذیر ہوا ہے۔

"کاروانِ وطن" کا دیباچہ نیاز فتحپوری صاحب نے لکھا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔ پیش لفظ محروم صاحب کے صاحبزادے جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ لیکن فاضل باپ کے "فاضل" بیٹے کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ شعر

افسوس بے شمار سخنہائے گفتنی   خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

جوش ملیح آبادی کا نہیں ہے۔

کاروانِ وطن ایک ایسی کتاب ہے جس کا ایک نسخہ ہر گھر میں موجود ہونا چاہیئے۔ مکتبۂ جامعہ نے یہ کتاب سلیقے سے شائع کی ہے۔

———— شمیم احمد

دشت وفا

مصنف :- احمد ندیم قاسمی

قیمت :- چھ روپے

ناشر :- کتاب نما - ۱۷۰ - انار کلی روڈ - لاہور

"دشتِ وفا" کے موضوعات وہی ہیں جو عام ترقی پسند شاعروں کے ہیں لیکن ایک چیز خاص

ہے جیسے مولانا غلام رسول مہر نے ندیم کا کمال قرار دیا ہے " وہ ایسے الفاظ بھی بے تکلف استعمال کرتا ہے جنہیں الگ کر کے دیکھا جائے تو غالباً خوش ذوق شاعر کو گوارا نہ معلوم ہوں لیکن ندیم کے طریق استعمال میں وہ گوارا ہی نہیں بلکہ پُر لطف بن جاتے ہیں " ایسے الفاظ دو چار یا دس بیس نہیں ہیں بلکہ " ندیم کے اشعار میں ایسے بے شمار الفاظ آئے ہیں جن کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں شاید ہی مل سکے نہ یہ بے شمار الفاظ بظاہر " خاصے کرخت الفاظ ہیں " لیکن ندیم نے انہیں الفاظ کے ذریعے " دقائق فکر و نظر بس کمالِ وضاحت سے پیش کر دیئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ " مولنا مہر کا اقتباس ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے چل کر مولنا فرماتے ہیں " نظم کے الفاظ و تراکیب عموماً نثر کے مقابلے میں محدود سمجھے جاتے ہیں مگر ندیم اس حد بندی کا قائل نہیں۔ اس نے عملاً ثابت کر دیا ہے کہ اگر الفاظ صحیح محل پر خوبی سے استعمال کئے جائیں تو ان کی ظاہری کرختگی بھی حسن و دلآویزی بن جاتی ہے "۔ ندیم کے اس کمال کا اعتراف صرف مولنا مہر ہی کو نہیں ہے۔ مولنا عبدالمجید سالک بھی اس کمالِ خاص کے معترف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مہر صاحب کے نزدیک ندیم کا یہ کمال صرف خوش ذوق شاعر کو ناگوار ہو سکتا تھا۔ مولنا سالک اس میں پرانے نقادوں کو اور شامل کرتے ہیں اور صرف الفاظ کی بات نہیں کرتے اپنی تعریف کو اور آگے لے جاتے ہیں " بلاشبہ پرانے نقادوں اور شاعروں کو ندیم کے کلام کے مطالعے میں اکثر ٹھوکریں لگیں گی انہیں (ندیم کے کلام میں) نو بہ نو و جدید اسالیب اظہار نظر آئیں گے جن کو وہ قدیم فنِ بلاغت کے مطابق نہ پائیں گے۔ ندیم کی تشبیہات، ندیم کے استعارے، ندیم کے کنائے " حدائق البلاغت " کے دائرے سے اکثر تجاوز کرتے نظر آئیں گے " میں نے حدائق البلاغت نہیں پڑھی اور خوش ذوقی کوئی ایسی چیز نہیں جس کا ادعا کیا جائے۔ اس لئے میرے نزدیک ان دونوں بزرگوں کے اقوال سند کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اب میں ندیم کے اسی کمال کی داد دوں گا۔ اور ان کے موضوعات کو چھوڑ کر کہ ان میں وہ اسی پامال راہ پہ چلے ہیں جیسے ہر ترقی پسند شاعر نے روا رکھا ہے ان کی اس خصوصیتِ خاص کو دیکھوں گا جو ندیم کو ندیم بناتی ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ یہ وہی ندیم ہے جس کے مجموعہ جلال و جمال کو دیکھ کر مولنا سالک نے پیش گوئی کی تھی کہ " ایشیا کے افق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہوا ہے "۔

"دشتِ وفا" کی پہلی نظم "دشتِ وفا" ہے۔ لیکن اسے چھوڑ دیجئے کہ اس میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں ہوا جو کسی خوش ذوق شاعر کو گوارا نہ ہو۔ اور تشبیہیں، استعارے، اور کنائے بھی غالباً حدائق البلاغت کے معیار پر پورے اترنے والے ہیں۔ البتہ دوسری نظم "یوان سحر میں" پر ایک نظر ضرور ڈالیے کہ اس میں ندیم کی ندیمیت ذرا نکھری ہوئی ہے۔

تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور
کہ جیسے شیرہ بن کو چبا کے لب جائے

ندیم کی ساری خوبیاں موجود ہیں کرخت الفاظ۔ نظم اور نثر کے درمیان حد بندی کا نہ ہونا۔ اور تشبیہ تو کمال کی ہے۔ تھکے تھکے سے وقت کے تیور صرف تشبیہ کے کمال سے آسودگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ تھکن کو آسودگی کے معنی دے کر یہاں ندیم صرف حدائق بلاغت ہی نہیں لغات کے دائرے سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔

یہاں تو گل بھی مرے ہم نصیب ہی نکلے
کہ تیرگی میں گھلے جا رہے ہیں بیچارے

گلوں کا مرجھانا، کملانا، بکھرنا تو سنا آپ نے سنا ہوگا۔ ندیم نے انہیں گھلا دیا ہے۔ گل ہوئے تماشے ہو گئے۔ تشبیہ کا ایک اور کمال ملاحظہ فرمایئے۔

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکوت بے پایاں
یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ
کچھ ایسے ٹوٹ رہی ہیں رگیں تخیل کی
کہ جیسے تندیٔ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ

پہلے شعر میں "سکوت بے پایاں" اور "مرقد پر چراغ" کے ذکر سے اضمحلال کی جو کیفیت پیدا کی ہے دوسرے شعر کی تشبیہ نے اسے شدت اور جوش سے لبریز کر دیا ہے۔ شدت اور جوش بھی وہ جو تندیٔ مے کا لازمی نتیجہ ہے۔ غالب نے کہا تھا آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے ندیم نے ... سے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ ظاہر ہے کہ ایشیا کے افق پر عظیم شاعر اور کس طرح نمودار ہو سکتا ہے۔

یہ سلاخوں میں چمکتا ہوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا۔

دوسرے مصرعے میں دلچسپ کا لفظ کتنا برمحل استعمال ہوا ہے۔ پورے قطعہ کا حسن کتنی خوبی سے غارت کیا ہے۔ غزل کا ایک شعر اور ....

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھول یوں کھلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

کمال کی تشبیہ ہے۔ پتہ نہیں محبوب کی موجودگی سے گلستاں جلنے کیوں لگا۔ حدائق البلاغت والے لکھتے تو کہتے کہ گلستاں پر بہار آگئی۔ یا نکھار دونا ہو گیا۔ یا رنگ و نکہت میں اضافہ ہو گیا محبوب کے اثر سے گلستان کو جلتے دیکھنا ایشیا کے کسی عظیم شاعر ہی کا کام ہو سکتا تھا۔

زمیں کچھ اور ابھری، آسماں کچھ اور سونلایا
ذرا انگڑائی لینے کو جب اٹھیں حسن کی باہیں

زمیں کا کچھ اور ابھرنا تو پرانے نقادوں اور شاعروں کی سمجھ میں بھی آگیا ہوگا۔ مگر آسمان کا بے وجہ کچھ اور سونلا جانا صرف انہیں لوگوں کی سمجھ میں آیا ہو گا جو ندیم کے بے مثال کمال کو سمجھ سکتے ہیں۔ ایک مصرع میں صوتیات کا کمال دیکھئے۔

"مندمندی ہے گھور کے مجھ کو بھنور کی آنکھ"

مجھے افسوس ہے کہ ندیم کے کمال بے مثال کے یہ نمونے میں نے صرف جہاں تہاں سے نقل کر دیئے ہیں۔ دشتِ وفا کا بالاستیعاب مطالعہ اہلِ ذوق کے لئے اس سے بہتر نمونے بھی فراہم کر سکتا ہے۔ ندیم کو چند الفاظ کا بہت شوق ہے۔ چٹخنا، چاٹنا، چھنکنا۔ ابلنا۔ ہوکنا، ہانپنا دھول، ببول۔ روٹھیاں، لوٹیاں، انگڑائی، تھکن۔ مہکار۔ وجدان، سناٹا وغیرہ الفاظ بذاتِ خود برے یا اچھے نہیں ہوتے۔ ان کا استعمال انہیں اچھا یا برا بناتا ہے۔ ندیم کے کلام میں ان الفاظ کا استعمال بیشتر برا ہے۔ اور ایک طرح کی ذہنی کرختگی کا پتہ دیتا ہے جو ذوقِ سلیم پر گراں گذرتی ہے۔ یا پھر یہ الفاظ نئے، جاندار اور پرقوت ہونے کے باوجود جاگتے نہیں۔ مولانا سالک نے لکھا ہے کہ ندیم کی غزلوں کا نقشہ رنگ نقشہ کھرا کھرا ہے۔ پرانے غزل گویوں

ایک نظم "پابندی" میں ایک نئے لفظ کا استعمال دیکھئے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے

چڑیا کا ہے کو ہے سونے کی چڑیا ہے آپ کو کہیں اور مشکل سے نظر آئے گی۔ "شام کب آئے گی" میں ایک نادر تشبیہ ملاحظہ کیجئے۔

ایک لوٹی ہوئی سلطنت کی طرح!
ایک شے دوسری شے میں کھوئی ہوئی

شعر واقعی حدائق البلاغت کے دائرہ سے کوسوں آگے نکل گیا ہے غریب پرانے نقاد اور شعراء سوچ بھی نہیں سکتے کہ "ٹوٹی ہوئی سلطنت" اور "ایک شے کے دوسری شے میں کھو جانے" کے درمیان وجہ شبہ کیا ہے۔ غزل کا ایک مطلع ملاحظہ کیجئے۔

نیا فلک ہو رہا ہے پیدا، نئے ستارے نکل رہے ہیں!
حیات کے تنگ دائرہ میں گھرے ہوئے جسم جل رہے ہیں

ممکن ہے کہ یہ شعر "حدائق البلاغت" کی رو سے آپ کو دولخت نظر آئے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے یہ تو صرف ایشیا کے افق پر نمودار ہونے والے شاعر کی ایک جدت ہے۔ جسموں کے جلنے کے لئے ستاروں سے حدت پیدا کی ہے۔ ورنہ سورج یا دھوپ وغیرہ کا ذکر ہوتا تو شعر روایتی ہو کر رہ جاتا۔ غزل کا ایک غیر روایتی شعر اور ملاحظہ کیجئے۔

کچھ نہ کچھ پاتا بھی ہے انسان محرومی کے ساتھ
جن کے دل بجھتے گئے، برقِ تپاں بنتے گئے

انسان بے شک محرومی سے برقِ تپاں بن جاتا ہے مگر اسکے لئے شرط ہے کہ دل بجھے نہیں بلکہ جلتا رہے۔ لیکن ندیم کی جدت اپنی جگہ ہے۔ آدمی دل بجھنے کے بعد برق تپاں بنے تو ایک بات بھی ہے۔ ایک دلچسپ قطعہ قارئین کی دلچسپی کے لئے حاضرِ خدمت ہے۔

کنج زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ رن پڑا ہو گا

کی طرح چپٹا چپٹا نہیں۔ یہاں ہمیں اس سوال سے غرض نہیں کہ وہ چپٹے نقشے والے پرانے غزل گو کون ہیں۔ مولانا نے کہا ہے تو ایسا ہی ہوگا مگر اس کا کیا علاج کہ ندیم کے کھڑے کھڑے نقشہ والی غزلوں اور نظموں کے الفاظ کچھ پڑے پڑے رہتے ہیں۔ کسی کا مصرعہ ہے

زمیں سے تا بہ فلک اک اتھاہ سناٹا

اس کے مقابلہ پر ندیم کا سناٹا دیکھئے۔

نشیب شام سے نجم سحر کی چوٹی تک
تمام رینگتے کیڑے، تمام سناٹے

اول تو نجم سحر کی چوٹی بھی خوب ہے۔ لیکن اصل چیز "سناٹے" ہے اتنا سونا سونا استعمال ہے۔ کہ بے بے جان سے تو پھر کچھ رینگے۔ لیکن "سناٹے" بالکل سناٹے میں پڑے ہیں۔
بسیط اور انگڑائی۔ ان دونوں لفظوں کا استعمال ایک مصرعہ میں دیکھئے۔

"تنی ہوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی"

چند ایسے ہی مصرعے اور

"بکھری مانگوں کی مانند ریگڈنڈیاں"
"اک ایسے دور میں پیدا ہوئی ہے پود اپنی"
"ایک کہتا ہے غزل، ایک بناتا ہے بم"
"اک خلا طے ہوئی اک اور خلا کی حد پر"

خلا ویسے تو مذکر ہے۔ مگر کوئی واقعی مصرعہ ہو تو مونث بھی گوارا۔ یہ تو نثر ہے۔ اور نثر بھی کوئی اتنی بے جان کاہے کو لکھے گا۔ اعتراض یہ نہیں ہے کہ ان مصرعوں میں پگڈنڈیاں، پود، بم، یا خلا وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ اعتراض ممکن ہے کہ مولانا مہر کے "خوش ذوق شاعر" یا مولانا سالک کے کسی حائق البلاغت پرست پرانے نقاد یا شاعر کو ہو۔ ہمیں نہیں ہے ہمارا اعتراض یہ ہے کہ گھسے پٹے پرانے الفاظ مردہ اور بے جان انداز میں استعمال ہوئے ہوں تو خیر۔ لیکن نئے الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا انہیں ضائع کرنا ہے۔
ایشیا کے افق پر نمودار ہونے والے عظیم شاعر کی حیثیت سے ندیم کا کلام آپ کو جیسا بھی

لگے۔ لیکن وہ ایک اوسط درجہ کے اچھے شاعر ضرور ہیں۔ ترقی پسند شاعروں میں ان کا مقام اوسط سے کچھ بلند ہو جاتا ہے۔ یہاں وہ صفِ دوئم کے شاعر ہیں۔ صفِ اول میں فیض کے سوا کوئی اور نہیں۔ مجموعہ پر مجموعہ نکالتے چلا جانا اور بات ہے۔ اور فیض کی طرح ایک درجہ اول کا ترقی پسند شعر کہنا اور بات۔ بہرحال ایک اوسط درجہ کے اچھے شاعر کی حیثیت سے ان کے جو اشعار مجھے پسند آئے ہیں ان کا نمونہ بھی دیکھ لیجئے۔

ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں

کون کہتا ہے محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

ایک پوری غزل اچھی ہے۔ ردیف اچھی نہیں تھی لیکن استعمال نے اچھی بنا دی۔

اے لذت زندگی کے منکر — اک بار کسی سے پیار کر لے
غماز ہے حسن آپ اپنا — جو رنگ بھی اختیار کر لے
زنداں پہ گمانِ فرشِ گل ہے — جو چاہے مزاج یار کر لے
اب تو تیری آبرو ہے تجھ سے — اب تو مرا اعتبار کر لے

ردیف نے کیا زور پیدا کر دیا ہے۔

جب تک میں ترا جمال دیکھوں — تو زخم مرے شمار کر لے
برسوں سے تری طرف رواں ہوں — ہمت ہے تو انتظار کر لے

تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا + کتنا چرچا تھا تری انجمن آرائی کا
جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے + مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

فراق صاحب کا شعر ہے:۔

وہ تیری نرم دوشیزہ نگاہی دل نہیں بھولا
پڑی جب جب نظر تیری نگاہِ اولیں نکلی!

مگر ندیم کا شعر بہتر ہے۔ بہت پختگی اور بے ساختگی سے لکھا ہے۔

تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے
میں پوچھ رہا ہوں تو کہاں ہے
ٹوٹی ہوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم بہار کا نشاں ہے

بعض نظموں اور غزلوں میں بڑے پُر تاثیر مصرعے ملتے ہیں۔

ایک انداز تو ہے بے سر و سامانی کا
ہم تری دھن میں ترے غم سے بغل گیر ہوئے

دوسرا مصرعہ نہیں لگا مگر پہلا مصرعہ خوب ہے۔

ایک امید ملاقات نے مرنے نہ دیا
تیرے پیماں مری سانسوں کے عناں گیر ہوئے

دوسرا مصرعہ پھر لٹک گیا۔ مگر پہلا مصرعہ تنا ہوا ہے۔

یہ گل ہیں یا ترے رد کیے ہوئے تبسم ہیں
یہ کون دشت میں لایا ہے میرے گھر کے چراغ

دوسرا مصرعہ بہت اچھا ہے۔ بلکہ دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔

جھکا لیا ہے بھری ڈالیوں کو کلیوں نے
بجھا رہا ہے کوئی میرے بام و در کے چراغ

پہلا مصرعہ ایشیا کے ہونے والے عظیم شاعر کا ہے لیکن دوسرا مصرعہ اچھا ہے نظموں میں بھی

جا بجا خوبصورت بنتے ہوئے ٹکڑے چمک اٹھتے ہیں۔

جب خاک سے رفعت سما تک + ابھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک + صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

پہلا شعر چھوڑ دیجئے اور دوسرے کو دیکھئے۔ کھنڈر کا پہلا مصرع بہت اچھا ہے۔

غنچۂ دل جو کھلا بھی تو سحر شام کھلا + کون ظلمت میں نکلتا ہے نظارہ گل
تو کہاں تھا کہ تیرے دامن رنگیں کے لئے + ہاتھ پھیلائے رہی نکہت آوارہ گل

کتنی حساس خامشی ہے + سوچو بھی تو بات رک گئی ہے

پہلا مصرع تو خیر مگر دوسرا مصرع اچھا ہے۔ ایک قطعہ کا ایک مصرع۔

زندہ رہنے کو مگر اور بھی جی چاہتا ہے

بے ساختہ انیس کا مصرع یاد آیا "کھیل ابھی سے مرتے کو جی چاہتا نہیں"۔ اچھی شاعری اسی طرح اچھی شاعری کو آواز دیتی ہے۔ چند مصرعے اور۔

"میرے ویرانۂ احساس میں اک پھول کھلا"
"اب درد حیات میں کمی ہے"
"ایک کو دل بھی بہت، ایک کو آفاق بھی کم"
"عمر بھر ایک تیرا دھیان رہا"
"مری سرشت میں ہے انتظار موسم گل"
"خود اپنا سایہ پھیل گیا کائنات پر"
"یوں حقیقت کو سمیٹے کہ حقیقت بن جائے"
"ہر پھول سوال بن گیا ہو"
"حسن بیگانۂ احساس جمال اچھا ہے"

آخر میں ایک شعر اور ؎ تو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمی شب نے

میں نے ندیم کو اوسط درجہ کا اچھا شاعر کہا ہے۔ ڈھائی سو سال کی شعری روایت میں
یہ مقام بھی کسے ملتا ہے۔

گذارش :۔ شاعری اپنے آپ کو قبول کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ندیم ایشیا کے افق پر
نمودار ہونے والے عظیم شاعر کا خواب چھوڑ دیں تو ان میں تین بڑی چیزیں کم ہو سکتی ہیں (۱)
ترقی پسندی (۲) خطابت (۳) مجموعوں کی ضخامت۔ اور ایک اچھی چیز بڑھ سکتی ہے —
اچھی شاعری !

سلیم احمد

ایک وائلن سمندر کے کنارے

مصنف :۔ کرشن چندر

قیمت :۔ چھ روپے

ناشر :۔ مکتبۂ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی۔

تقسیم ہند کے بعد سے کرشن چندر نے اپنے ہر معقول پڑھنے والے کو جس طرح مایوس
کیا ہے وہ کرشن چندر ہی کی نہیں اردو ادب کی بھی بدقسمتی ہے۔ خدا ان نقادوں کا بھلا کرے
جنہوں نے اس ذہین افسانہ نگار کو اسکے عنفوانِ شباب ہی میں زہر سے نہیں شہد سے ہلاک کیا۔
اور اسے یقین دلا دیا کہ وہ افسانوی ادب کے منتہائے کمال کو چھو چکا ہے۔ ہم کرشن چندر کی جوان مرگ
کا کتنا بھی ماتم کریں مگر مردے کے نامۂ اعمال میں تحریف کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ کرشن چندر
کی موجودہ تحریریں کرشن چندر کی نہیں کرشن چندر کے بھوت کی ہیں۔ یہ بھوت اب ان لوگوں کے
لئے لکھتا ہے جو سستے گھٹیا جاسوسی اور رومانی ناولوں کے ساتھ ساتھ اس کا اگلا ہوا ملغوبہ بھی حلق
سے اتار لیتا ہے۔

کرشن چندر کا نیا ناول "ایک وائلن سمندر کے کنارے" مکتبۂ افکار نے چھاپا ہے یہ ناول
ممکن ہے ایک عام پڑھنے والے کے لئے اچھا اور دلچسپ ہو لیکن ایک معقول پڑھنے والے کو
اس ناول میں کچھ نہیں ملتا۔

کاش کرشن چندر یہ سب کچھ نہ لکھتے۔ اور اگر لکھتے تو انہیں کوئی ایسا ایمان دار اور ہمت والا پبلشر ملتا جو خود انہیں کی صلاحیت کے نام پر ان کا مسودہ انہیں واپس کر دیتا۔ اس طرح شاید کرشن چندر کو اس تکلیف کا اندازہ ہو سکتا جو ان کی ہر نئی تحریر سے ان کے کسی معقول پڑھنے والے کو پہونچتی ہے۔

ــــــــــ ثناء اللہ

تذکرہ علمائے ہند

تالیف :- مولوی رحمان علی مرحوم

مرتبہ و مترجمہ :- محمد ایوب قادری، بی اے

قیمت :- پندرہ روپے

ناشر :- پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۵

ہمارے یہاں تاریخ لکھنے کا صرف ایک ہی انداز رہا ہے۔ یعنی صرف بادشاہوں کی فتوحات یا ان کی محفلوں کے نقشے سپرد قرطاس کئے جاتے رہے ہیں۔ اگر ہم کسی دور کی معاشی یا تمدنی کیفیت معلوم کرنا چاہیں تو اس دور کی تاریخوں سے ہمیں بہت کم مواد اس سلسلے میں ملے گا۔ حد یہ ہے کہ کہیں کہیں اس قسم کی تحریریں ہیں بھی تو وہ اتنی مختصر کہ کوئی باقاعدہ بیان اس سے مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ نجی تحریریں بھی جن میں ایسا مواد مل سکے شاذ ہی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ابتدا سے تا دم تحریر جتنے علماء گزرے ہیں ان کا حال لکھا جائے مگر بالاستیعاب مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی مصنف کی ذاتی پسند و ترجیح کو دخل ہے۔ کیونکہ متعدد علما جو اپنے وقت کے جید عالم تھے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

ہندوستان میں اسلام علماء و مشائخ کی وجہ سے پھیلا۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ تاریخوں میں ان لوگوں کو کوئی جگہ نہیں ملی۔ مشائخ اور صوفیائے کرام کے حالات تو کہیں کہیں دستیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر شاگردوں نے اپنے استاد و مرشد کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن علما کو بہت کم ایسے لائق شاگرد ملے جو اپنے استاد کے حالات مرتب کر کے ان کو شائع کرتے۔

اسی لئے اس دور کی ثقافتی اور علمی تاریخ کا مرتب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اگر کچھ کتابیں اس قسم کی لکھی بھی گئیں تو وہ دستیاب نہیں ہیں۔ کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ اور مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ کتابوں کا کافی ذخیرہ ہمارے سابق آقاؤں کی عنایت سے لندن کے کتب خانہ کی زینت بنا ہوا ہے۔ ہمارے مورخین پر جو فرض عاید ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے نسخوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں اور ان کو شائع کریں جن سے کہ اسلامی دور کی تمدنی۔ علمی۔ اخلاقی اور معاشرتی تاریخ مرتب کی جا سکے۔

ہسٹاریکل سوسائٹی پاکستان کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں کو شائع کر رہی ہے۔ مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف نے بڑی محنت سے کتاب مرتب کی ہے۔

پیش لفظ محمد ایوب قادری کا لکھا ہوا ہے۔ جنہوں نے بعض پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کا مقدمہ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے اور اسکے پڑھنے سے ڈاکٹر صاحب موصوف کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یورپ کے مردم خیز تصبات کے علم دوست حضرات کا ذکر کیا ہے۔ "ادیب اردو" میں پورب کے مردم خیز قصبات کے عنوان سے ایک مضمون منشی عبدالرفیع صاحب اثر مرحوم کا ۳۰ء یا ۳۱ء میں شائع ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف کتاب کے بعض ہم عصر علما بڑے جید عالم تھے۔ لیکن ان کا ذکر اس تذکرہ میں نہیں آیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انتخاب علما میں مولف کی ذاتی پسندیدگی کو کافی دخل رہا ہے۔ ویسے پیش لفظ میں قادری صاحب نے ان لوگوں کے نام گنائے ہیں جو اپنے تذکرہ سے محروم رہ گئے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ "تذکرہ" اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ جتنے لوگوں کا حال درج کیا گیا ہے وہی بہت غنیمت ہے۔

کتابت اور طباعت خاصی ہے۔ لیکن اغلاط کی درستگی میں زیادہ کاوش نہیں کی گئی ہے۔ قیمت زیادہ ہے اور عام آدمی کی دسترس سے یقیناً بالاتر ہے۔

———— انوار احمد علوی

MUMTAZ
TEZ PATTI
پاکستان زندہ باد
ممتاز تیز پتی
ہیڈ آفس فون نمبر:-
37949
سیل ڈپو فون نمبر:-
36086
ہرن مارکہ
تمباکو
ٹریڈ مارک
رجسٹرڈ
نیک صلاح
اغیار کے دھوکوں سے بچو۔
اپنے پیسے کی حفاظت کرو۔ ایک مرتبہ آزمانا شرط ہے
پھر آپ ہمیشہ اسے پسند کریں گے۔
تیار کردہ:- حاجی ممتاز الدین اینڈ سنز جوڑیا بازار کراچی